سجاد ظہیر — شخصیت اور فکر
مرتب
ڈاکٹر سید جعفر احمد
maablib.org

سجاد ظہیر ـــ شخصیت اور فکر

سجاد ظہیر ـ شخصیت اور فکر

مرتب
ڈاکٹر سید جعفر احمد

مکتبۂ دانیال

سجاد ظہیر — شخصیت اور فکر

ناشر: حوری نورانی
مکتبۂ دانیال،
وکٹوریہ چیمبرز ۲، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی ۔ ۷۴۴۰۰
طابع: ذکی سنز پرنٹرز، کراچی
پہلی بار: ۲۰۰۵ء
قیمت: ۲۵۰ روپے

فہرست

عرضِ مرتب

انجمن ترقی پسند مصنفین کے روحِ رواں اور اس کے پہلے جنرل سیکریٹری سید سجاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس سال ان کی ولادت کے ۱۰۰ سال پورے ہونے پر پاکستان، ہندوستان اور دنیا کے بعض دوسرے ممالک میں جہاں اردو بولی جاتی ہے اور ادب سے رغبت رکھنے والے لوگ موجود ہیں، ان کی صد سالہ تقریبات منعقد کی جارہی ہیں۔ اس موقعے پر جو سیمینار اور جلسے منعقد ہو رہے ہیں ان سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ ان میں صرف سجاد ظہیر کی شخصیت اور ان کی خدمات ہی کا ذکر نہیں ہوگا بلکہ خود ترقی پسند تحریک کی اثر آفرینی، اس کے تاریخی کردار اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں، سب کا بہت معروضی انداز میں جائزہ لیا جائے گا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ۱۹۳۶ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس کو بھی اب کوئی ۷۰ سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس انجمن کا بہترین دور تو شاید اس کا پہلا عشرہ ہی تھا جس میں اس تنظیم کو پھیلاؤ حاصل ہوا، اس کا پیغام برصغیر کے دور دراز علاقوں تک پہنچا اور اس خطے کی دوسری زبانوں کے لکھنے والوں نے بھی اس کے اثرات کو قبول کیا۔ اس ابتدائی عشرے کے بعد بھی انجمن ایک عرصے تک فعال رہی لیکن آزادی کے بعد جب ہندوستان اور پاکستان کی دو علیحدہ مملکتیں وجود میں آگئیں تو ہر دو جگہ انجمن کو مختلف قسم کی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن یہ بات خوش آئند ہے کہ انجمن نے تمام تر نامساعد حالات کے باوجود خود کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھا ہے اور اگر پاکستان میں انجمن بعض مختصر دورانیوں

کے لیے منظر عام پر موجود نہیں بھی رہی تب بھی ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترقی پسند سوچ کا عمل بلا شبہ ہر دور میں جاری رہا ہے اور یہ ادب نہ صرف اپنی پیش رو ترقی پسند ادبی روایت کا ایک تسلسل ہے بلکہ یہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں مختلف علاقوں کے ادب کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں ہیں جو آج بھی ترقی پسند ادب کو ایک زیادہ نمائندہ ادب بناتی ہیں۔ یاسیت پسندوں اور نراجی ذہن رکھنے والوں کی تو بات الگ ہے جنہیں حال، ہر حال میں برا لگتا ہے اور اگر کچھ اچھائی اور خوبی نظر آتی بھی ہے تو وہ صرف ماضی میں ہی نظر آتی ہے لیکن اس یاس انگیز ذہنی فضا سے نکل کر اگر چشم حقیقت شناس سے چیزوں کو دیکھا جائے تو کیا یہ حقائق نظروں سے اوجھل رہ سکتے ہیں کہ آج اردو زبان اور اس کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادب کی روایت دنیا کے دور دراز خطوں تک پہنچ چکی ہے۔ زبان اور ادب بجائے خود ایک سماجی عمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سو اگر اردو بولنے والے دنیا جہاں کی معاشی منڈیوں میں اپنی محنت کی متاع لیے جوق در جوق پہنچ رہے ہوں اور روز افزوں گلوبلائز (globalize) ہوتی ہوئی دنیا کا کل پرزہ بن رہے ہوں تو ان کی زبان اور تخلیقی کاوشیں اس نئے منظر نامے کا حصہ بننے سے کیسے رُک سکتی ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ترقی پسند ادب نے ماضی میں جن مثالیوں کو تشکیل دیا تھا اور زندگی اور دنیا کی تعمیر کے حوالے سے جن راستوں کی نشاندہی کی تھی ان کی اصابت کو اب سب ہی تسلیم کرتے ہیں بلکہ اب تو صورت حال یہ ہے کہ ماضی میں جو اصول، جو الفاظ اور اصطلاحیں ترقی پسندوں سے مخصوص تھیں اب ان ہی کی گردان وہ بھی کرتے نظر آتے ہیں جو آج کے تناظر میں ترقی دشمن، استعمار پسند اور رجعت پسند واقع ہوئے ہیں۔

سجاد ظہیر کا صد سالہ جشن یقیناً آج کے تناظر میں ترقی پسند ادب کے منصب کو سمجھنے میں بھی مدد دے گا۔ اس موقعے پر یہ بھی دیکھا جانا چاہیے کہ ترقی پسند تحریک کو کس قسم کے چیلنجوں اور مسائل سے سابقہ رہا ہے۔ ترقی پسندوں کی کامرانیاں کیا رہی ہیں اور ان کی کمزوریاں اور خامیاں کس کس انداز میں سامنے آئی ہیں اور ان کا تدارک کس طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ ترقی پسندوں کے بارے میں ماضی میں بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جاتی رہی ہیں۔ بہت سی غلط فہمیاں خود ترقی پسندوں کی فروگزاشتوں کا بھی نتیجہ ہیں۔ بعض صورتوں میں ترقی پسندوں نے، انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے

ہوئے اپنے مقاصد کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔ امید ہے کہ ان سب پہلوؤں پر اس موقعے پر گفتگو ہوگی اور ایک جمہوری فضا میں خود احتسابی اور خود تنقیدی کے ذریعے ماضی اور حال کا ایک بہتر فہم حاصل کیا جائے گا۔

زیر نظر کتاب جو سجاد ظہیر کے صد سالہ جشن کے موقعے پر شائع کی جا رہی ہے ایک خاص مقصد کے پیش نظر مرتب کی گئی ہے۔ اس کتاب میں سجاد ظہیر کا کوئی تفصیلی اور مبسوط تحقیقی مطالعہ پیش نہیں کیا جا رہا بلکہ اس کتاب کی حیثیت سجاد ظہیر کی شخصیت، ان کی ادبی خدمات، ان کی تخلیقات کی اہمیت اور ان کی سیاست کے بارے میں لکھے گئے مضامین کے ایک انتخاب کی ہے۔ یہ کتاب مرتب کرتے وقت میرے پیش نظر یہ بات تھی کہ سجاد ظہیر کے بارے میں کم از کم پاکستان میں اکا دکا کتابوں کے علاوہ اور کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ان کی اپنی تصانیف اکثر و بیشتر دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے بارے میں متفرق مضامین رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں مگر یہ بالعموم بکھرے ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کتابوں اور رسائل و جرائد کے تبادلے کا کوئی مربوط نظام بھی موجود نہیں رہا ورنہ پاکستان کے قارئین ادب ہندوستان میں سجاد ظہیر کے بارے میں چھپنے والی چیزوں سے زیادہ بہتر طور پر مستفید ہو سکتے تھے۔ موجودہ کتاب میں پاکستان اور ہندوستان میں چھپنے والے مختلف مضامین کے علاوہ بعض غیر مطبوعہ مضامین بھی شامل ہیں۔ اس حوالے سے میں خاص طور پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی کا ممنون ہوں جن کے مضامین پہلی بار اس کتاب کے ذریعے منظر عام پر آ رہے ہیں۔ ان کے علاوہ جن اہل قلم کی تحریریں اس مجموعے میں شامل ہیں، میں ان کا بھی ممنون ہوں۔ ہر مضمون کے ساتھ ہم نے وہ ذریعہ بھی درج کر دیا ہے جہاں سے یہ مضمون لیا گیا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ اس کے پہلے حصے میں سجاد ظہیر کی فکری اور ادبی خدمات کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینے والے مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں جو معنوی اعتبار سے کتاب کے پہلے حصے سے مربوط بھی ہے، سجاد ظہیر کی مختلف تصانیف کے بارے میں تجزیاتی مضامین یکجا کر لیے گئے ہیں۔ اس طرح اس حصے میں 'لندن کی ایک رات'، 'روشنائی'، 'ذکرِ حافظ' اور 'پگھلا نیلم' کے بارے میں ایک ایک مضمون یکجا کر دیا گیا ہے۔

تیسرے حصے میں سجاد ظہیر کی شخصیت، ان کے کردار اور سماجی پس منظر سے متعلق تحریریں ہیں۔ ان ہی میں سے بعض تحریریں ان کی سیاست اور سیاسی کردار سے بھی بحث کرتی ہیں۔ کتاب کے چوتھے حصے میں سجاد ظہیر کی چند نمائندہ تحریریں یکجا کردی گئی ہیں۔ یہ تحریریں جہاں ایک طرف ان کے شخصی اور خاندانی پس منظر اور ان کے طالب علمی کے زمانے کے تجربات کا احاطہ کرتی ہیں، وہیں ان میں ان کے ادبی اور سیاسی نظریات کی تشریح بھی موجود ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں سجاد ظہیر کے بارے میں شعرا کے تاثرات اور ان کے خراج تحسین وعقیدت کو محفوظ کرلیا گیا ہے۔

یہ کتاب، جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا، سجاد ظہیر کے بارے میں کوئی نمائندہ کتاب نہیں ہے اور اس کو کسی قدر عجلت میں بھی مرتب کیا گیا ہے لیکن اگر یہ قارئین ادب اور خاص طور سے طالب علموں کے لیے سجاد ظہیر کے حوالے سے کچھ اہم چیزوں کو بہم کرسکے اور ان کو ان تحریروں سے استفادے کا موقع فراہم کرسکے تو میں یہ سمجھوں گا کہ یہ حقیری خدمت رائیگاں نہیں گئی۔ اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں مجھے جن احباب کے مشورے حاصل رہے ہیں، میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ میں مہر النساء عزیز اور صدف مسعود کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کے مختلف مراحل میں مجھ سے تعاون کیا اور اس کو بروقت شائع کرنے میں مدد دی۔

ڈاکٹر سید جعفر احمد

کراچی، ۱۳ دسمبر ۲۰۰۵ء

پہلا حصّہ

تعینِ قدر

پروفیسر ممتاز حسین

سجاد ظہیر کی ادبی خدمات

پاکستان کے مختلف ادبی حلقوں میں سجاد ظہیر کی موت پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور ان کی ادبی خدمات کو سراہا گیا ہے، لیکن بعض احباب ایسے بھی ہیں جو پاکستان کی تحریک کو سرسید احمد خان کی تحریک کا بلکہ احیائی میلانات کا تکملہ سمجھتے ہیں اور سجاد ظہیر کی ترقی پسندی کے اتنے ہی مخالف ہیں جتنے کہ سرسید احمد خان کے عہد کے مولوی حضرات سرسید کی ترقی پسندی کے مخالف تھے۔ لیکن آج جبکہ سرسید احمد خان کی وفات کو ایک مدت گزر چکی ہے انہیں نہ صرف مسلمانوں کا ایک محسنِ اعظم تصور کیا جارہا ہے بلکہ اس بات پر بھی زور دیا جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں ہی نے اردو ادب اور انشاء کی اصلاح کی طرف سب سے پہلے لوگوں کو متوجہ کیا۔

سرسید احمد خاں کی تحریک 'علی گڑھ تحریک' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس تحریک نے جہاں حالیؔ اور اقبالؔ جیسی بڑی شخصیتیں پیدا کیں وہاں اس تحریک نے اردو ادب کے بعض اصناف میں یا تو خاطر خواہ اضافہ کیا یا انہیں از سرِ نو رواج دیا۔ میرا اشارہ ناول نگاری، ادبی سوانح عمری، نیچرل شاعری، نظم گوئی، مقالہ نویسی اور جدید انشائیہ کی طرف ہے۔ یہاں یہ بات واضح کردینا ضروری ہے کہ حالیؔ نے سب سے پہلے فلسفۂ ترقی کی اصطلاح ہمارے ادب میں رائج کی اور یہ بات کھل کر انہوں نے کہی کہ مغربی افکار و ادب سے مستفید ہوئے بغیر اب نہ تو ہمارا ادب ترقی کرسکتا ہے اور نہ ہماری زندگی۔ ترقی کی وہ نئی راہیں کیا تھیں؟ اس کی بھی نشاندہی خود انہوں نے کی۔ انہوں نے

مفلسی کو اُم الجرائم قرار دیا اور یہ بتایا کہ مفلسی منجانب اللہ نہیں بلکہ ایک مخصوص سماجی زندگی کے نتیجے میں پیدا ہوا کرتی ہے اور اگر اس سماجی زندگی کو منقلب کر دیا جائے تو نہ صرف مفلسی کا مداوا ہو سکتا ہے بلکہ ہمارا اخلاق بھی بہتر ہو سکتا ہے۔

حالی کی یہ ساری تعلیمات ان کی نظموں اور ان کے مضامین میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس طرح سرسید احمد خاں نے اپنے عہد کے مسلمانوں کو جس بات کی طرف متوجہ کیا وہ یہ ہے کہ ہمیں نہ صرف سائنسی ایجادات کی ضرورت ہے بلکہ ایک ایسے ذہن کی بھی ضرورت ہے جو تاریخی، تنقیدی شعور رکھتا ہے جو ہمارے ماضی کے افکار و خیالات، رسوم و عادات کا تجزیہ عقل کی روشنی میں کر سکے اور پھر ہمیں یہ سمجھا سکے کہ ہم اس دورِ حاضر میں کہاں کھڑے ہیں۔ چنانچہ آج پاکستان میں وہی ذہن اُبھر رہا ہے جو تاریخی، تنقیدی شعور رکھتا ہے اور اس ذہن کی ایک زبردست جنگ ان لوگوں سے ہے جو احیائی میلانات کا سہارا لے کر سماجی ترقی کے اس راستے سے ہمیں ڈرانا دھمکانا چاہتے ہیں جس کی طرف نہ صرف مغرب اور مشرق کے بعض ممالک بلکہ دنیائے عرب بھی گامزن ہے۔ لیکن اس رکاوٹ کے باوجود پاکستان کی جواں فکر اپنے سماجی نصب العین کو متعین کرنے کے لیے مغرب کے افکار سے استفادہ کر رہی ہے۔ آج کے نوجوانوں کا طرزِ فکر قیامِ پاکستان سے پہلے کے نوجوانوں کے طرزِ فکر سے مختلف ہے اور اس طرح کل کے نوجوانوں کا طرزِ فکر آج کے نوجوانوں کے طرزِ فکر سے مختلف ہوگا لیکن جو تسلسل اس تغیر میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اب ہم تاریخی، تنقیدی شعور کے راستے سے ہٹ کر تقلیدی ذہن، توہم پرستی، روایت پرستی، مردہ پرستی اور ماضی پرستی کی طرف نہیں جا سکتے۔ یہ کوئی چیلنج نہیں ہے بلکہ اظہارِ حقیقت ہے اور اس سے گریز کرنا اب ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے جو احیائی میلانات کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ہوا دیتے رہتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک جو 'ترقی پسند ادب' کی تحریک کے نام سے بھی مشہور ہے، اس تاریخی تنقیدی شعور کی ایک نئی تاویل تھی جس کی ابتدا سرسید کے زمانے سے ہوئی تھی اس فرق کے ساتھ کہ اس کی سیاست بدلے ہوئے حالات اور اس کی انسان دوستی اور روشن خیالی 'علی گڑھ تحریک' سے وسیع تر تھی۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی ترقی پسندی آج کی ترقی پسندی سے قدرے مختلف تھی کیونکہ اس وقت کے حالات مختلف تھے لیکن یہ بات جیسی اس وقت صحیح تھی ویسی ہی آج بھی صحیح ہے کہ ہمیں

اپنے ماحول کو منقلب کرنا ہے ہمیں نوامیس فطرت کو اپنے تصرف میں لانا ہے اور معاشرے سے ہر قسم کے استحصال کو ختم کر کے انسانیت، اخوت اور محبت کے رشتوں کو استوار کرنا ہے۔ اس ہی کے ساتھ ساتھ ایک عالمی برادری کی طرف آگے بھی بڑھنا ہے کیونکہ اب یہ دنیا روز بروز چھوٹی سے چھوٹی ہوتی جا رہی ہے اور ایک ملک کی ترقی دوسرے ممالک کی امداد اور لین دین پر منحصر ہو گئی ہے۔ یہ مسلک کسی بھی مذہب کے خلاف نہیں ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ خلاصہ مسالک ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ 'نوواردانِ بساط ہوائے دل' کیسے لوگ ہیں جو محبت کے بجائے نفرت پر، جو ترقی کے بجائے رجعت پر اپنے کلچر کو استوار کرنا چاہتے ہیں۔

فراق گورکھپوری، پنڈت جواہر لال نہرو کے پرسنل سکریٹری رہ چکے ہیں لیکن آج ان کی غزلوں سے محظوظ ہونے کے لیے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ نا بھائی! ان کی غزلوں سے محظوظ نہ ہو کیونکہ وہ جواہر لال نہرو کے پرسنل سکریٹری رہ چکے ہیں اور نہ یہ بات کوئی باہوش شخص علامہ اقبال کے لیے کہتا ہے کہ ان کے کلام سے ہمیں اس لیے محظوظ اور مستفید نہ ہونا چاہیے کہ وہ بھی پنڈت نہرو کے دوست تھے اور جبکہ یہ امتیاز ان شخصیتوں کے ساتھ روا نہیں رکھا جاتا ہے تو پھر سجاد ظہیر کی ادبی خدمات کو سراہتے وقت یہ بات کیوں اٹھائی جاتی ہے کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے دوست تھے یا یہ کہ کسی وقت کانگریسی اشتراکی جماعت میں تھے۔ ادب کا تعلق انسانی رشتوں سے ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ انسانی رشتوں کو مستحکم کرنے اور آزادی کی سرحدوں کو وسیع کرنے میں کسی ادیب کی کیا خدمات ہیں نہ کہ یہ بات کہ وہ کسی ایک شخص کا دوست تھا یا دشمن۔

اردو کے ادیب مختلف سیاسی نظریات سے وابستہ نظر آتے ہیں اور یہ لازم نہیں ہے کہ ہر شخص کسی ادیب کے سیاسی نظریات سے متفق ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس نے اپنی تخلیقات اور اپنی سرگرمیوں سے کون سے ذہنی انقلاب کے لیے زمین ہموار کی ہے۔ گزشتہ تیس برس میں ترقی پسند ادب نے جو خدمات سماجی شعور کو بیدار کرنے کی انجام دی ہیں، اس کی قیادت بے شک سجاد ظہیر نے کی، ہر چند کہ ان کی تخلیقات تعداد کے لحاظ سے کم ہیں، لیکن اپنے اثرات میں بہت ہی اہم ہیں۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، اور نقاد تھے۔ ان کا ناولٹ 'لندن کی ایک رات' جدید ناول نگاری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر چند کہ یہ ناولٹ بہت ہی مختصر ہے، لیکن

ہمارے شعور کو غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک پہنچانے میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس ہی طرح ترقی پسند تنقید میں ان کی اہمیت ایک رہنما کی ہے۔ انہوں نے ماضی کے ادب کو پرکھنے کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر دیا اور ان نوجوانوں کے خلاف آواز بلند کی جو جاگیردارانہ عہد کے تمام ادب کو رجعت پسند تصور کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ماضی کی ساری چیزوں کو منظم کر لینا چاہیے اور فاسد چیزوں کو رد کر دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل تنقید احتیاط کا ہے اور اس میں فروگزاشتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن انہوں نے جو بھی سرمایہ اپنی عملی تنقید کا پیش کیا ہے اس سے ان کی بالغ نظری کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ انہیں مسلمانوں کے تہذیبی ورثے سے عظیم محبت تھی اور وہ اس تہذیبی ورثے سے ساری دنیا کو روشناس کرانا چاہتے تھے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو راستہ انہوں نے اپنی آبلہ پائی سے طے کیا ہے وہ ہرچند کہ بڑا دشوار گزار تھا، لیکن اب خاصا ہموار اور روشن ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنی مساعی اور جدوجہد سے ہندو پاک کے مختلف گوشوں اور کونوں میں زندگی اور ادب کا ایک نیا پیغام پہنچایا ہے اور آج سجاد ظہیر کو لوگ اسی لیے یاد کر رہے ہیں کہ انہوں نے زندگی کو برتنے اور ادب کو پرکھنے کا ایک نیا نقطۂ نظر دیا ہے اور اپنی تخلیقات سے اس کے عملی نمونے بہم پہنچائے۔ سجاد ظہیر ایک انسان دوست ادیب تھے۔ ان کی شخصیت مہر و وفا کی مجسمہ تھی اور اگر انہوں نے ہمیشہ اس پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امن اور صلح کی فضا ہونی چاہیے تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو پاکستان کے لوگ نہ چاہتے ہوں۔ پاکستان کے لوگ بھی اپنے سارے ہمسایہ ممالک کے ساتھ امن کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

ماہنامہ 'طلوعِ افکار' کراچی، سجاد ظہیر نمبر، نومبر ۱۹۷۳ء

قدوس صہبائی

ترقی پسند ادب اور سجاد ظہیر

بنّے بھائی (سجاد ظہیر) بھی رخصت ہو گئے اور ان کے ساتھ ہی برصغیر میں ترقی پسند ادب کا ایک سب سے اہم ستون گر گیا۔ لیکن گرا ہوا یہ ستون یا سجاد ظہیر کی موت اس عمارت میں ہلکا سا ارتعاش بھی نہ پیدا کر سکی جو مرحوم نے اپنے خون، پسینے، اپنے عزم و عمل، اپنے خلوص اور بلند کردار سے پچھلے چالیس سال میں تعمیر کی تھی، وہ اسے اتنا مستحکم بنا گئے ہیں کہ یہ عمارت کبھی منہدم نہ ہو سکے گی۔ ان کی لگن نے ترقی پسند ادب کو ایک طاقت بنا دیا تھا اور ترقی پسند ادب نے ہی ترقی پسند سماج اور ترقی پسند سیاسی اور معاشی نظام کی تکمیل کی جانب پورے برصغیر میں بڑے بڑے اور کامیاب قدم اٹھائے ہیں۔

پینتیس، چالیس سال پہلے، جب سجاد ظہیر نے، ادب کے میدان میں ترقی پسند رجحانات کو متعارف کرایا تو ہر جانب رجعت پسندوں، سرمایہ داروں اور فرسودہ نظام اور استحصالی قدروں کے حامی ادب کے متوالوں کی بھنویں تن گئیں۔ ترقی پسندی ادب کے شعبے میں کفر کی علامت بنا دی گئی اور ایک خصوصی نعرہ دیا گیا کہ 'یہ کافرانہ ادب ہے' جو خدا سے بغاوت کی تلقین کرتا ہے۔ مذہبی سماج اور اسلامی معاشرہ اسے برداشت نہیں کر سکتا اور اسی نعرے کی آڑ میں سجاد ظہیر اور ان کے گنے چنے باعزم رفقا کو گردن زدنی قرار دیا جانے لگا۔ لیکن سجاد ظہیر کی تحریک مذہبی مخالفت کی تحریک نہ تھی بلکہ ابھرنے والے سماج کا ایک نشان تھی۔ یہ محض ایک فرد کی لگن بھی نہیں تھی، نہ یورپ اور مغرب کی

تقلید بلکہ آزادیٔ خیال، حریت اور فکری ارتقا کی ضمانت تھی۔ چنانچہ شدید مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود، وقت کے ساتھ ساتھ یہ پودا پروان چڑھتا گیا۔ سماج کے سمندر میں طوفانی مدوجزر آتے ہی رہتے ہیں، لیکن اس پودے کو کوئی بہا کر نہ لے جاسکا اور آج ہزاروں، لاکھوں، ذی شعور انسان، سینکڑوں دانشور، ادیب، انشاپرداز اور فن کار فن وادب اور فنونِ لطیفہ کی ہر صنف میں اس کی آبیاری کررہے ہیں، اور اسے ایک تناور درخت بنا چکے ہیں۔

برِ صغیر میں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک کا دس سالہ دور، نہ صرف غیر ملکی سامراج سے آزادی کی تحریکوں کا ایک ہنگامہ خیز اور انقلاب پرور دور گزرا ہے بلکہ یہی زمانہ ترقی پسند اور انقلاب آفریں ادبی، علمی اور معاشرتی تحریکوں کا بھی عظیم ترین دور رہا ہے۔ دانشور طبقے میں اسی تحریک نے مخالف سامراج، معاشرتی اور معاشی انقلاب کا تصور پیدا کیا۔ ترقی پسند ادبی تحریکات نے اسی دور میں اتنی وسعت، ہمہ گیری اور قبولِ عام حاصل کیا جو تاریخِ ادب میں ایک لازوال یادگار بن چکا ہے۔ اور اس ترقی پسند ادبی تحریک کی کامیابیوں کا سہرا، بڑی حد تک تحریک کے بانی سجاد ظہیر کے سر باندھا جاسکتا ہے۔ میں اس پوری مدت میں اس کا عینی شاہد رہا ہوں۔ ایک ذی شعور ادبی مفکر کی حیثیت سے 'بنّے بھائی' نے اس ادبی تحریک کے لیے جو مسلسل محنت کی، جس عزم واستقلال کے ساتھ برِ صغیر کے گوشے گوشے میں انہوں نے تحریک کو پھیلایا، جس خلوص اور جرأت وصداقت کے ساتھ وہ ترقی پسندی کے راستے پر گامزن رہے اس کے اثرات کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ نوجوان اور جواں فکر دانشوروں اور ادیبوں کی بہت بڑی اکثریت کے علاوہ سب ہی قابلِ ذکر اور ممتاز بزرگ شاعر اور ادیب جن کا اثر اور اسلام دوستی برِ صغیر میں مسلّم تھی، ترقی پسند ادبی تحریک کے پُرزور حامی بن گئے تھے۔

سجاد ظہیر کے قول وعمل میں پُرخلوص یکسانیت اور گفتار و کردار میں اتنا ٹھہراؤ اور شعور تھا کہ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم، شاعرِ فطرت مولانا حسرت موہانی مرحوم، شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی، پروفیسر فراق گورکھپوری، ڈاکٹر محمود الظفر، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر زین العابدین، مجنوں گورکھ پوری اور اس کے وقت کے نوجوان دانشوروں اور ادیبوں میں سے سبط حسن، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، ڈاکٹر ملک راج آنند، احتشام حسین، خواجہ احمد عباس،

مرزا ادیب، ممتاز حسین، مجروح سلطان پوری، عبادت بریلوی، کیفی اعظمی، ہاجرہ مسرور، احمد علی خاں ('ڈان' کراچی کے موجودہ ایڈیٹر)، ماہنامہ 'افکار' کے مدیر صہبا لکھنوی، جاں نثار اختر، نیاز حیدر اور بہت سے قابلِ ذکر شاعر اور ادیب، صحافی اور انشا پرداز، تحریک سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ اس کا گہرا تجربہ کرنے کے بعد اس کی صفوں میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ وہ دانشور اور ادیب تھے جن کے ادبی تذکرے کے بغیر آج بھی ادب کی تاریخ مکمل نہیں کہی جا سکتی۔

بے شمار نوجوان، پرستارانِ ادب میں سے ایک میں بھی تھا، سوائے ادب و صحافت کے میری زندگی کا کوئی مشغلہ نہیں رہا اور یہی میرے کسبِ معاش کا ذریعہ بھی تھا۔

۱۹۳۶ء میں جب بنے بھائی (سجاد ظہیر) اور ان کے رفقاء نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی اور ترقی پسند ادب کا منشور شائع کیا تو شدید مخالفت کے طوفان اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت میں ہفت روزہ 'نظام' کلکتہ اور بعض دوسرے ترقی پسند رسائل و صحائف میں انجمن و منشور کی حمایت میں مسلسل اور مربوط مضامین لکھتا رہا۔ ۱۹۴۳۔۱۹۴۴ء میں، میں روزنامہ 'انصاری' دہلی کا مدیر تھا۔ اس وقت مجھے بنے بھائی کا ایک پیغام، ان کے ایک رفیق مرزا اشفاق بیگ کے توسط سے ملا کہ میں بمبئی آجاؤں اور ہفت روزہ 'نظام' کی ادارت سنبھال لوں جو جاپانی حملے کے نتیجے میں کلکتے سے بمبئی آچکا تھا۔ ایک لائق مدیر کی ادارت میں 'نظام' بمبئی سے شائع ہو رہا تھا۔ لیکن یہ مدیر اپنے ادبی رجحانات کے زیرِ اثر ترقی پسند ادب کے شدید مخالف تھے۔ ان کی حمایت شہرۂ آفاق ادیبہ ممتاز شیریں مرحومہ اور ان کے شوہر جناب صمد شاہین بھی بنگلور سے نکلنے والے اپنے رسالے 'نیا دور' میں کرتے رہتے تھے لیکن ترقی پسند ادب اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی مخالفت اب بے اثر ہو چکی تھی۔ مخالفوں کی جہدِ مسلسل کے باوجود سارے برِصغیر کے ترقی پسند ادیب و دانشور نظام کی مخالفانہ روش کو ناپسند کرتے تھے اور اس میں لکھنے کو تیار نہ تھے۔ اس لیے 'نظام' کی انتظامیہ نے اخبار کی پالیسی تبدیل کر دی اور مجھے ادارے میں شرکت کی دعوت دی۔ اگر بمبئی سے بنے بھائی کی دعوت مجھے نہ ملتی تو میں 'نظام' کی ادارت کبھی قبول نہ کرتا۔ بہر حال میں نے 'انصاری' چھوڑ دیا اور بمبئی آگیا۔

میرے 'نظام' بمبئی کی ادارت سنبھالتے ہی ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کے تمام ممتاز اور

ناموراراکان جن میں مسلمہ بزرگ اور نامور شعرا بھی شامل تھے 'نظام' کے صفحات پر جلوہ گر ہونے لگے۔ سجاد ظہیر کی تحریک پر انجمن نے ایک خصوصی تقریب میں 'نظام' کو اور نئے ادارے کی پالیسی کو ترقی پسند ادیبوں سے روشناس کرایا اور بنے بھائی نے یہ یقین دلایا کہ 'نظام' اب ترقی پسند ادبی تحریک کی حقیقی ترجمانی کرے گا۔ یہ بات غلط بھی نہ تھی۔ چار پانچ سال 'نظام' مسلسل برصغیر میں، قیام پاکستان تک ترقی پسند مصنفین کی پُرجوش ترجمانی کرتا رہا۔ یہ ہفت روزہ اس دور کی ترقی پسند ادبی تحریک کی ایک مکمل تاریخ بن چکا تھا۔

بمبئی میں ترقی پسند مصنفین کی مرکزی انجمن ہر ہفتے اپنا اجلاس منعقد کرتی تھی۔ جلسہ سجاد ظہیر کے مکان، واقع مالابار ہل روڈ پر منعقد ہوتا تھا۔ بمبئی میں جو بھی ممتاز ادیب و شاعر اور دانشور موجود ہوتے وہ اس اجلاس میں شرکت کرتے تھے، جہاں وہ اپنی تخلیقات پیش کرتے یا شعر و ادب پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ قاضی عبدالغفار جب بھی حیدرآباد دکن سے بمبئی آتے تو انجمن کے جلسے میں ضرور شرکت کرتے۔ ڈاکٹر عبدالحق بھی بمبئی کی موجودگی کے دوران انجمن کے جلسے میں شامل ہوتے۔ پروفیسر فراق گورکھپوری اور پروفیسر احتشام حسین الٰہ آباد اور لکھنؤ سے بمبئی آکر اکثر ان جلسوں میں شریک رہے ہیں۔ مجاز لکھنوی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، سبطِ حسن، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، احمد علی خاں، مجروح سلطان پوری اور نیاز حیدر پابندی سے شریک ہوتے رہتے تھے۔ آخری دو سال میں جوش ملیح آبادی پونا سے بمبئی آچکے تھے اور انجمن کے جلسے میں حاضری ضرور سمجھتے تھے۔

ہفت روزہ 'نظام' بمبئی اور انجمن ترقی پسند مصنفین یک جان دو قالب بن چکے تھے۔ بہت سے نام کوتیس سال گزر جانے کی وجہ سے بھول چکا ہوں، لیکن جو نام میں نے لکھے ہیں ان میں سے ہر ایک بڑے فخر کے ساتھ 'نظام' میں لکھتا تھا اور سارے برصغیر میں 'نظام' کی اشاعت ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ صرف پشاور میں جہاں سے فارغ بخاری، نذیر مرزا برلاس، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی التزام کے ساتھ 'نظام' میں لکھتے تھے، چار پانچ سو کاپیاں 'نظام' کی جاتی تھیں۔

کئی بار اکثر ممتاز لکھنے والوں نے 'نظام' کی خدمات کا اعتراف کیا۔ لیکن سجاد ظہیر کی تحریک سے لگن کا بانکپن ایک منفرد مقام رکھتا تھا۔ وہ اجتماعی ادبی اور سیاسی تحریکوں میں یقین رکھتے تھے۔ مجھے

آج محسوس ہوتا ہے کہ اگر بنے بھائی (سجاد ظہیر) سیاست میں حصہ نہ لیتے تو وہ برِ صغیر کے میکسم گورکی ہوتے۔ ایک طویل مکتوب میں انہوں نے 'نظام' کے کسی خاص نمبر پر اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے مجھے لکھا تھا۔

'...... بھائی قدوس!...... 'نظام' ایک وسیلہ تھا جس کے ذریعے تم نے اس عظیم الشان نصب العین کو حاصل کرنے کی مبارک و مستحسن جدوجہد کو جاری رکھا ہے، جس کے لیے آج سے نہیں، پندرہ سال سے تم نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے۔

'......ضرورت ہے کہ اس نصب العین کو اور زیادہ مضبوطی، استقلال اور ہمت کے ساتھ قائم رکھا جائے، سچ بات کو بے خوف وخطر کہہ دینا، مظلوم اور محنت کش عوام کو ان کی آزادی اور جمہوریت کی لڑائی میں حتی الامکان مدد دینا، حکمراں طبقوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور ان کے زر خرید اہلِ قلم کی مکاریوں، دروغ بافیوں، ریاکاریوں اور فتنہ پردازیوں سے سونے چاندی کے تاروں سے بُنے ہوئے نقاب کو چاک کر کے اہلِ اقتدار کے حامیوں کے مکروہ چہروں کو اصل شکل میں لوگوں کے سامنے لانا، انصاف، جمہوریت اور مساوات کے لیے جدوجہد کرنا غرض یہ کہ ہر لکھنے والے کو اپنی تحریر کی ایک ایک سطر دنیا کے لیے سب سے مقدس جہاد سمجھنا چاہیے'۔

سجاد ظہیر کے یہ خیالات ان کی ترقی پسند تحریک کا جوہر اور نچوڑ تھے۔ انہوں نے ہمیشہ لکھنے والوں پر ایک دوسرے کے ادبی کاموں کے احتساب کی اشد ضرورت پر زور دیا اور اپنی زندگی میں وہ ترقی پسند ادبی تحریک کو آگے ہی بڑھانے کا مشکل کام انجام دیتے رہے۔

بنے بھائی، اپنے سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ، ترقی پسند ادبی تحریک کی ترویج اور وسعت میں زبردست انہماک رکھتے تھے۔ دراصل انہوں نے ادبی تحریک کو روشن خیالی، ترقی اور آزادی کا ضامن بنانے کا عزم کر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دانشور اور ذی شعور طبقے، معاشرتی، علمی اور

ادبی تحریک کو ترقی پسندی کے راستے پر کامیابی سے گامزن کر سکے تو لازماً برصغیر کے عوام آزادی، ترقی اور خوشحالی کے راستے پر چل پڑیں گے اور ان کا یہ تجزیہ غلط نہیں تھا۔ جیسے جیسے ترقی پسند ادبی تحریک پھیل رہی تھی آزادی کی تحریکوں کو اس سے تقویت مل رہی تھی اور عوام پر اس کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔

گوشے گوشے سے ترقی پسند تحریک کے شیدائی اور حامی وقتاً فوقتاً انجمن ترقی پسند مصنفین کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے بمبئی آتے رہتے تھے اور انجمن کے اجلاسوں میں شرکت اور بنے بھائی سے تبادلہ خیال کے بعد وہ اپنے علاقوں میں ترقی پسند تحریک کی بااثر تنظیمیں قائم کر رہے تھے۔ میں بمبئی میں مقیم تھا اس سے پہلے بھی اکثر و بیشتر اپنی صحافیانہ مصروفیات کے باعث میں دہلی، بجنور اور دوسرے صحافتی مرکزوں میں ہی رہتا تھا، لیکن میرا آبائی تعلق بھوپال سے تھا جہاں کبھی کبھی جانا ہوتا تھا۔

جب ترقی پسند تحریک پورے عروج پر تھی اس وقت بھوپال کے ادیب بھی اس سے متاثر ہو رہے تھے اور میں نے محسوس کیا کہ بھوپال اپنی روایات اور فرسودہ جاگیرداری نظام کے باوجود ترقی پسند ادبی تحریک کی ایک زبردست آماجگاہ بنتا جارہا ہے۔

بھوپال میں اس وقت مرزا اشفاق بیگ، محمد مہدی، جاں نثار اختر، صہبا لکھنوی، اے۔ آر۔ رشدی، اشتیاق عارف، محمد علی تاج، وجدی الحسینی، احسن علی خاں، احمد علی خاں، محمد احمد سبزواری، صفیہ اختر، اختر جمال اور حبیب فخری، ترقی پسند ادب کے پُر جوش حامی اور علمبردار تھے، ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی بھوپال شاخ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ بنے بھائی نے مرکزی انجمن سے اس کا الحاق کر کے اپنے ایک پیغام کے ساتھ مجھے بھوپال بھیجا۔

بنے بھائی کے پیغام اور ترقی پسند تحریک کی جو پذیرائی بھوپال میں ہوئی اور اس کے بعد جس طرح ترقی پسند مصنفین کی تنظیم نے اس علاقے میں کام کیا، وہ تحریک کی تاریخ کا ایک مستقل اور روشن باب ہے۔ سرکاری اخبارات اور جرائد کے سوا، سارے ہی اخبارات اور جرائد تحریک کی حمایت کر رہے تھے۔ خصوصاً ماہنامہ 'افکار' جو صہبا لکھنوی اور اے۔ آر۔ رشدی کی ادارت میں شائع ہو رہا تھا ترقی پسند تحریک کا علمبردار اور ترجمان بن گیا تھا۔

صہبا اور رشدی نے ماہنامہ 'افکار' کو چند در چند مشکلات کے باوجود جاری رکھ کر جس عزم اور حوصلے کے ساتھ ترقی پسند تحریک کو وسطِ ہند میں خصوصاً اور برِصغیر میں عموماً جو زندگی اور مقبولیت بخشی، ہر ترقی پسند اس کا معترف ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد 'افکار' ہجرت کر کے کراچی آ گیا۔ تحریک کی وہ پسپائیاں جو ہمارے وطن کی سیاسی اور فکری رجعت پسندی کے باعث ہر شعبۂ زندگی کو نصیب ہوئیں 'افکار' ان سے نہ بچ سکا۔ لیکن اپنے مسلک اور بنیادی فکر و نظر کو نہ چھوڑتے ہوئے 'افکار' اب تک زندہ ہے اور ادبی نشو و نما کے لیے اس کے کارنامے ابدی بن چکے ہیں۔

قیامِ پاکستان تک ترقی پسند مصنفین کی انجمن اور ترقی پسند ادبی تحریک کُل ہند بنیادوں پر جاری رہی۔ لاہور، ڈھاکہ، بمبئی اور دہلی میں اس تحریک کے پروگرام یک رنگ اور مربوط ہوتے تھے، پاکستان کے قیام کے بعد ہر ادبی اور سماجی تحریک بھی تقسیم ہوگئی۔ پاکستان، ایک آئیڈیالوجیکل اسلامی مملکت بن چکی تھی۔ قیامِ پاکستان کے اس جوش اور ولولے کا جو اسلامی نظام اور اسلامی فکر و نظر کے لیے ہر دل میں موجزن تھا آج کے پاکستان سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

تقسیمِ ہند کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک کا جب پاکستان میں از سرِ نو آغاز ہوا تو ابتداً مملکتِ پاکستان کے سب ہی ترقی پسند اور دانشور شعوری طور پر اس کے حامی تھے۔ پاکستانی علاقوں کے لیے ترقی پسند ادب کی تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین نئی نہ تھی۔ نئی مملکت میں اسے فروغ دینے اور تنظیم کو مستحکم کرنے کا سوال تھا اور اس کے لیے سب ہی سرگرمِ کار ہوگئے۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف، سبطِ حسن، احمد علی خاں، ممتاز حسین، ریاض روفی، صہبا لکھنوی، شوکت صدیقی، ابراہیم جلیس، مجتبیٰ حسین وغیرہ پاکستان کے حصے میں آئے، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، حمید اختر، ظہور نظر، ظہیر کاشمیری، رضا ہمدانی، فارغ بخاری اور دوسرے بہت سے ادیبوں کا مسکن پہلے سے ہی پاکستان کے علاقے تھے۔ یہ سب ادب کو ترقی پسند خطوط پر استوار کرنے کی دھن میں تھے لیکن نئی اسلامی مملکت کی فکری اساس اور اسلامی آئیڈیالوجی کی آڑ میں وہ پرانا گروہ جو ہر ترقی کا مخالف تھا پوری طاقت کے ساتھ، ترقی پسند تحریک کو مخالفِ اسلام تحریک کا نام دے کر بڑی شد و مد سے انجمن ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسند ادبی تحریک کی بھی مخالفت کر رہا تھا۔ اسلام اور اسلامی نظام کی حمایت میں عوام کے اندر جوش اور جذبے کا طوفان اُمڈا ہوا تھا، ہر نعرہ جو اسلام کے نام پر بلند کیا

جارہا تھا ایک جاندار نعرہ بن گیا۔ ترقی پسند ادب کے حامیوں نے جن میں سے اکثر بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے بھرپور کوششیں کیں کہ عوام کے ذہن کو اس بات کے لیے آمادہ کرسکیں کہ ترقی پسند ادبی تحریک اسلام اور اسلامی مملکت کی مخالف نہیں لیکن ان کی کوششیں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکیں، اس لیے ہر ترقی پسند معاشرتی تحریک کی طرح ترقی پسند ادبی تحریک کو بھی پسپا ہونا پڑا۔ ابتدائی چند سالوں کے اندر پسپائی کی یہ رفتار بڑھتی ہی رہی۔ جس نے بعض بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے۔ ترقی پسند ادیبوں پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ کمیونسٹوں کے حاشیہ بردار ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد تحریک کے خلاف سیاست پیشگی کا الزام درست تسلیم کرلیا گیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو کمیونسٹ اور سیاسی جماعت قرار دے کر خلاف قانون قرار دیدیا گیا۔ اکثر ترقی پسند نذر زنداں ہوگئے۔ ڈاکٹر اشرف مرحوم ہندوستان واپس چلے گئے۔ سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض 'راولپنڈی سازش' میں ملوث قرار دیئے گئے اور دو تین سال کے بعد سجاد ظہیر کو بھی ہندوستان واپس جانا پڑا۔ لیکن رفتہ رفتہ سارے ہی ترقی پسند ادیب اور دانشور آزاد اور رہا ہوگئے۔ البتہ ان کی تنظیم اور انجمن بیس سال سے زائد خلاف قانون رہی۔ اس عرصے میں مخالف ادبی تحریکات بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی کوشش کرتی رہیں۔ لیکن اب تک کسی کو وہ عروج اور قبولِ عام نصیب نہ ہوسکا جو اپنے قیام کے ابتدائی دس سالہ دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو سجاد ظہیر کی ادبی قیادت میں حاصل ہوا تھا اور جس کی جڑیں برصغیر کی مٹی میں آج بھی بڑھتی اور پھیلتی جارہی ہیں......!

ماہنامہ 'افکار' کراچی، سجاد ظہیر ایڈیشن، دسمبر ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

سجاد ظہیر: ایک نام، ایک عہد اور ایک تحریک

سوچتا ہوں کہ سجاد ظہیر صرف ایک شخص کا نام نہیں ہے۔ ایک عہد اور ایک تحریک ان کے نام سے مشخص ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ جس شخص پر یہ تینوں باتیں صادق آ سکتی ہوں وہ سجاد ظہیر ہے۔

مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن ان کے دوستوں، رفقاء اور خوردوں کے ذریعے جو کچھ بھی مجھ تک پہنچا ہے اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی انسان تھے۔ وہ شمالی ہندوستان کے ایک پابند رسوم و اقدار کلچر میں ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ اگر وہ ان قدرتی پابندیوں کے ساتھ باہر نکلنے کے لیے جرأت رندانہ کا مظاہرہ نہ کرتے تو یقین مانیے کہ سر وزیر حسن کے بیٹے سجاد ظہیر کو ترقی پسند تحریک کا سرخیل رہنما بننے میں کم از کم ایک صدی ضرور لگتی، لیکن ہم نے دیکھا کہ سجاد ظہیر ــــ سب کے بنے بھائی ــــ نے اپنے پس منظر سے رہائی کے لیے درکار ممکنہ مدت کا فاصلہ ہفتوں اور دنوں میں طے کرلیا۔ شاید یہ سریع الحرکتی ان کی شخصیت کے عرض کا وہ جوہر ہے جو ان کے metamorphosis میں حد درجہ مددگار ثابت ہوا۔

میں سجاد ظہیر کی زندگی کے سنگِ میلوں کی بساط پر اپنے مضمون کی بنیاد رکھنا نہیں چاہتا۔ وہ ایک علمی اور ثقافتی طور پر برصغیر کے چند ممتاز خاندانوں میں شامل خاندان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم جوبلی اسکول لکھنؤ اور کرسچین کالج لکھنؤ میں حاصل کی اور اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں آکسفورڈ آ گئے۔ 'یادیں'

اور 'روشنائی' میں انہوں نے اپنی داستانِ زندگی کی اہم روئیداد رقم کی ہے، ان روئیدادوں کی تحریر میں ۲۵ سال کا بُعدِ مکانی و زمانی ہے (۱۹۲۸ء تا ۱۹۵۴ء) یعنی ترقی پسند سوچ تحریک اور تنظیم کس طرح بنی۔

انفرادی فکر و نظر کو تنظیم بنتے بنتے بہت مدت درکار ہوتی ہے لیکن سجاد ظہیر کی تنظیمی صلاحیتوں نے یہ مدت اس قدر جلد پوری کی کہ چند ہی برسوں میں 'جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا' کے بجائے 'جنگل کا جنگل احمریں (لال) ہو گیا' پر بات جا کر رُکی۔

سجاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کے قیام کا فیصلہ برطانیہ میں مقیم ایک طالب علم کی حیثیت سے کیا۔ وہ یورپ میں گزشتہ صدی کے تیسرے عشرے میں رہے۔ ۱۹۳۰ء کا عشرہ یورپ میں جرمنی میں Hitler کے شباب کا عشرہ ہے، یہ جرمن قوم پر Ranke, Fichte اور جرمن تاریخ نگاروں کے طلسماتی اثرات سے رہائی کا عشرہ ہے، یہ اسپین کی خانہ جنگی کا عشرہ ہے، یہ ہندوستان کے لیے گول میز کانفرنس، کمیونل ایوارڈ، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا عشرہ ہے، یہ ہندوستان میں کانگریسی اور مسلم لیگی وزارتوں کے قیام کا عشرہ ہے، یہ اسپین کی خانہ جنگی کے آغاز کا عشرہ ہے، یہ جنگِ عظیم دوئم کے آغاز کا عشرہ ہے۔ الغرض یہ قیامت کا عشرہ ہے، لیکن اس عشرے تک آتے آتے ہمیں سجاد ظہیر کی ادبی اور سیاسی زندگی پر ہونے والی تبدیلیوں پر غور کرنا پڑے گا۔

سجاد ظہیر لکھنؤ میں کالج کی زندگی کے دوران اردو ادب، انگریزی ادب، تاریخ اور معاشیات سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ۱۹۲۳ء۔۱۹۲۴ء میں وہ اناطول فرانس اور برٹرنڈ رسل کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھ رہے تھے۔ اناطول فرانس نے فکشن اور دوسری تحریروں میں مذہبی ریاکاری اور منافقت کا پردہ چاک کرنے میں کمال حاصل کیا تھا اور رسل حقیقت پسندی اور بائیں بازو کی طرف جھکنے والی تعقل پسندی کے وکیل تھے۔ وہ مارچ ۱۹۳۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے براستہ مارسیلز اور پیرس لندن روانہ ہوئے۔ انہوں نے جس یونیورسٹی کا انتخاب کیا تھا وہ اپنی قدامت پرستانہ سوچ کے لیے مشہور تھی لیکن سجاد ظہیر ہندوستان ہی میں بائیں بازو کی سیاست کے رسیا ہو چکے تھے۔ ۱۹۲۵ء برِ صغیر میں کمیونسٹ پارٹی کے قیام کا سال ہے۔ اس پارٹی کا تاسیسی اجلاس کانپور میں منعقد ہوا جس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین مولانا حسرت موہانی تھے۔

وہی حسرت موہانی جو ایک طرف پیغمبر اسلام کے ذکر پر اشک بار ہو جایا کرتے تھے خود کو کرشن بھگت بھی کہتے تھے اور اشتراکیت کے اس درجہ حامی تھے کہ:

لازم ہے ہند میں آئینِ سوویت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

جیسے شعر کے خالق بھی تھے۔

اس ضمن میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھنے کا خیال تحریکِ ہجرت کے بعض ایسے رہنماؤں کو آیا جو افغانستان اور روس ہو آئے تھے۔ دیکھیے بنیادی طور پر ایک مذہبی نوعیت کی تحریک نے ہندوستان میں ایک انقلابی پارٹی کی midwife کا کردار کس طرح ادا کیا۔

۱۹۲۸ء میں سجاد ظہیر، سوئٹزرلینڈ کے سینی ٹوریم میں قیام کے بعد اشتراکی خیالات کے حامی ہو چکے تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے پہلے کیمونسٹ رکن سکلتا والا (Sakaltawala)، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر محمود الظفر اور ڈاکٹر زین العابدین احمد (جو بعد میں زیڈ احمد کہلائے اور جن کی یادداشتیں ادارۂ یادگار غالب نے حال ہی میں شائع کی ہیں) کی صحبت نے منتخب راستے پر گامزن ہونے میں مزید مہمیز لگائی۔

اس سے پیشتر سجاد ظہیر ۱۹۲۴ء۔۱۹۲۵ء میں ماہنامہ 'زمانہ' کانپور میں کچھ افسانے تحریر کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں وہ لندن میں 'نیا ہندوستان' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہندوستان کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل پر لکھتے چلے آرہے تھے۔ یعنی سجاد ظہیر کا ذہن پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا۔ انہوں نے انگلستان کے دورانِ قیام، فرینکفرٹ میں فسطائی طاقتوں کے خلاف منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔

۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والے افسانوں کے مجموعے 'انگارے' میں احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر اور سجاد ظہیر کے افسانے شامل ہیں۔ سجاد ظہیر کے چار افسانے 'گرمیوں کی ایک رات'، 'جنت کی بشارت'، 'نیند نہیں آتی' اور 'دُلاری' شامل ہیں۔ اس مجموعے میں احمد علی کے افسانے 'بادل نہیں آتے' اور 'مہاوٹوں کی ایک رات' رشید جہاں کا افسانہ 'دِلّی کی سیر' اور محمود الظفر کا افسانہ

'خواں مردی' بھی اس تاریخی اہمیت کی کتاب میں شامل تھے۔

جب ہم ان افسانوں کی themes پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر کے افسانوں میں مذہبی ریاکاری اور منافقت اور ہندوستانی سماج میں عورتوں کی سقیم حالت کے خلاف وہ احتجاج کی آواز بلند ہوئی تھی جو آج تک relevant معلوم ہوتی ہے۔ آج بھی ہم مذہبی ریاکاری اور عورتوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں آج بھی لڑکیوں کی کافی بڑی تعداد featus ہی کے مرحلے میں ختم کردی جاتی ہے۔ پاکستان میں ۱۹۹۸ء کی مردم شماری میں مردوں اور عورتوں کی شرح آبادی بالترتیب ۴۷ اور ۵۳ فیصد ہے یعنی معروف خیال کے برخلاف مرد زیادہ ہیں اور عورتیں کم۔ اس حقیقت سے ہمارے دیہی سماج میں عورت ذات کے بارے میں مروجہ تعصبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ultra sound technique نے برصغیر میں لڑکیوں کو رحم مادر ہی میں abort کرنے کے رواج کو مزید تقویت دی ہے۔

سجاد ظہیر نے مذہبی منافقت اور عورتوں کی حیثیت کے بارے میں ہمارے سماج کی رجعت پسندانہ سوچ کا پردہ چاک کرکے جس مسئلے کی جانب توجہ مبذول کی تھی وہ منشی پریم چند کے افسانوں کی عورتوں کے مقابلے میں اس لیے مختلف تھی کہ پریم چند نے زیادہ تر صنف نازک کی قربانیوں کی صورت گری کے ذریعے اسے glamourise کرنے پر زور دیا تھا۔ بعد میں منشی جی عورت ذات کے حق میں بتدریج احتجاجی لہجہ اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن 'انگارے' کے افسانہ نگاروں نے اور بطور خاص سجاد ظہیر نے عورت کی ترقی کے بغیر معاشرے کی ترقی کو ناممکن جانا۔ لندن کے قیام کے دوران سجاد ظہیر انگریزی زبان کے بائیں بازو کے ادیبوں سے تبادلہ خیال کے ذریعے ایک ایسے فکری ڈائیلاگ یا مکالے کا حصہ بنے جس کا مقصد ہندوستان کی جنگِ آزادی کی جدوجہد کے شرکاء پر یہ واضح کرنا تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستانی سماج کو کس طور تبدیل کیا جائے تاکہ آزادی واقعتاً آزادی ثابت ہو سکے اور ۔

داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

ثابت نہ ہو۔ ہمارے سماج میں آزادی کو التباس آزادی Myth of Independence بنانے والے گماشتے موجود تھے اور ہماری آزادی التباسِ آزادی بن کر رہ گئی جیسا کہ ذوالفقار علی

بھٹو کی کتاب کے title سے بھی ثابت ہوا۔

سجاد ظہیر نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی سماج کے جن دو خطرناک رجحانات کے خلاف قلم اٹھایا ان کا لہجہ 'انگارے' میں شامل دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں دھیما تھا۔ لیکن وہ کٹھ ملاؤں کی کٹھ ملائیت کے خلاف تھے اور انہیں معاشرے کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔

'گرمیوں کی ایک رات' ایک سرکاری دفتر کے تین کرداروں جمن چپراسی، ہیڈ کلرک لالہ جی اور منشی برکت علی کی کہانی ہے۔ دفتر کے صاحب بہادر کا چپراسی جمن دفتری بیگار۔ بازار سے آم خرید کے جانا۔ بیگم صاحبہ نے آم پسند نہ کیے۔ وہ واپس بازار آتا ہے۔ ایک عجیب ہیجان میں مبتلا ہے۔ منشی برکت علی سے امداد کا طالب ہوتا ہے لیکن منشی جی کا ایک کلاس فیلو انہیں گاڑی میں ٹمی مجرا سنوانے لے جاتا ہے اور بے چارہ جمن حیران و پریشان کھڑا رہ جاتا ہے۔

'جنت کی بشارت' میں ایک مولوی صاحب کی پُرخوری اور پچیس برس کم عمر کی لڑکی سے شادی کے بعد شب بیداری کے نوافل کے دوران 'جنت' کی سیر کا قصہ ہے۔ جس میں وہ اپنے لیے ایک حور پسند کر لیتے ہیں۔ افسانے کا خاتمہ ان کی بیگم کے قہقہوں پر ختم ہوتا ہے۔ جس کے بعد وہ خواب سے بیداری پر اپنے مصلّے کو دیکھتے ہیں اور اپنی بیوی کو ان کے سامنے جنت اور حور کے بجائے روزمرّہ کی دنیا اور ان کی بیوی قہقہے مارتی ہوئی ایک nightmare کی صورت پیش کرتی ہے۔

علاوہ ازیں 'ذکر حافظ' جسے مندرجہ بالا مضامین اور روسی زبان کے بعض مضامین کے اصل مسودات کے ساتھ یکجا کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ ۴۰ کی دہائی میں 'قومی جنگ' اور ۶۰ کی دہائی میں 'عوامی دور' اور بعد ازاں ماہنامہ 'حیات' دہلی، میں سجاد ظہیر کی سیاسی و معاشی مسائل پر تحریریں بھی قارئین کے سامنے آنی چاہئیں تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ بین الاقوامی Left بائیں بازو کے ادباء کو ہندوستانی ادیبوں سے متعارف کرانے اور ترقی پسندی کا ایک عظیم الشان عالمی محاذ بنانے میں سجاد ظہیر کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ 'انگارے' کے خلاف اٹھنے والی آوازوں سے اردو ادب کے بعض کشادہ ذہن کے مورخین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ترقی پسند تحریک پر تین اہم کتابیں شائع ہوئیں جن میں عزیز احمد کی 'ترقی پسند ادب' سب سے پہلی کتاب تھی۔ وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں:

'اس کتاب میں ہزار نقص سہی لیکن اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس کی اشاعت سے نئے ادب نے خودمختاری کا علم بلند کیا۔ یہ سماج پر وحشیانہ حملہ تھا اگرچہ اس حملے میں غیر ضروری خونریزی بہت تھی جس کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کئی سال پنپ نہ سکی، لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس کتاب کا مقصد نئی قدروں کی تعمیر سے زیادہ پرانے اصولوں کی تخریب تھا'۔

اس کے بعد پنڈت کشن پرشاد کول کی تصنیف 'نیا ادب' اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی 'ترقی پسند تحریک' کا رویہ بھی معاندانہ تھا۔ علی عباس حسینی جیسے سجاد ظہیر کے بظاہر طرفدار مصنف بھی اپنی کتاب 'ناول کی تاریخ اور تنقید' میں اس کتاب سے سرسری گزر گئے۔ وہ اسے جیمز جوائس کے ulyses سے متاثر سمجھتے ہیں۔ جوائس کے یہاں ڈبلن کا ایک دن تھا یہاں 'لندن کی ایک رات' اور پھر معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔

'روشنائی' جنوری ۱۹۵۴ء میں مچھ جیل میں لکھی گئی اور ظ۔ انصاری کے غزل، جاگیرداری طبقہ اور تصوف کے بارے میں منفی اعتراضات کے جواب میں مضمون کے جواب میں 'ذکرِ حافظ' جولائی ۱۹۵۴ء میں تحریر ہوئی۔ اس کتاب میں سجاد ظہیر کا اصرار تھا کہ ہمیں جاگیرداری عہد کے منفی پہلوؤں کے بجائے مثبت رویوں کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ 'پگھلا نیلم' پاکستان سے ہندوستان مراجعت کے بعد کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ یہ نثری نظموں کا مجموعہ ہے، نظم کی ایک ایسی فارم میں جسے فیض احمد فیض اپنے انتقال کے وقت تک قبول نہ کر سکے۔ ہر چند کہ سجاد ظہیر نے 'پگھلا نیلم' میں ہندوستانی سماج کی کھولت اور ترقی دشمن سماجی رویوں کے خلاف خوبصورت احساسات کی تہہ دار شاعری کے ذریعے ثابت کیا کہ نہ تو 'تخلیق' کی ہیئتیں جامد ہیں اور نہ سماجی اقدار اور پیداواری رشتے۔ ان ہی تبدیلیوں کا نام استحصال سے آزادی کی تاریخ ہے۔ سجاد ظہیر کی مساعی کا لب لباب یہ تھا کہ انسانی رشتے 'اپنے ہاتھوں اپنی تقدیر' کے سنہری آدرشوں سے نمو پاتے ہیں۔

سجاد ظہیر ہندوستانی ادب کے ایک معمار کی حیثیت میں ۱۹۲۴ء۔ ۱۹۲۵ء سے کام شروع کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے تاسیسی اجلاس بمقام رفاہ عام کلب سے منشی پریم چند کا لبِ مرگ صحت مند اعلان 'ہمیں حسن کا معیار بدلنا پڑے گا' صرف ایک منزل ہے اور یہ اجلاس

ہندوستانی سماج کی انقلاب کی خواہش پر لبیک کا حکم رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس تمام مسائل کے پس پشت یہ جذبہ کارفرما تھا کہ ہندوستانی ادب کے ذریعے ہندوستان کی سماجی، معاشی اور سیاسی مقدرات کو بدلنے کے لیے ایک ایسی جدوجہد کا آغاز کیا جاتا جس کے بغیر انگریزی اقتدار سے آزادی کا حصول بھی لایعنی ہوگا۔

آپ اس سوچ کی دوررسی کا اندازہ لگایئے، ہندوستان ان دنوں اپنی تاریخ کے جس نازک دور سے گزر رہا تھا اس میں صرف خوابوں کا فسوں تھا، سنگلاخ حقیقتوں کا ادراک نہیں تھا۔ سجاد ظہیر نے سوچا کہ اگر انگریزی اقتدار انگریز حکومت کے گماشتوں کو منتقل ہوتا ہے تو پھر ہندوستان کے محنت کش عوام کی تقدیر کس طرح بدلے گی۔ انہوں نے سوچا کہ اس بڑے کام میں ادیبوں کو سماجی تبدیلی میں Catalytic Agent بننا پڑے گا۔ مذہبی تقاضوں کی بحث ہندو احیا پرست ہندوؤں سے اور مسلمان احیا پرست مسلمانوں سے اپنے اپنے منابع کی طرف رجعت کا مطالبہ تو کر رہی تھی لیکن آزادی کے بعد درکار ضروری سماجی اور معاشی تبدیلیوں کے لیے صرف وہی لوگ سوچ سکتے تھے جو محنت کشوں کے حق میں بدلتے ہوئے پیداواری رشتوں کے ذریعے ملک سے استحصال پیشہ قوتوں کا خاتمہ چاہتے ہوں۔ برصغیر میں کیمونسٹ پارٹی کا ۱۹۲۵ء میں قیام اس سلسلے کی کڑی تھی، جس طرح کراچی اور بمبئی کی سڑکوں کا pollution ماؤنٹ آف کلا منجورو Mount of Kilamanjoro پر برف پگھلا سکتا ہے اسی طرح ایک علاقے میں ہونے والی ناانصافی دنیا کے دیگر حصوں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ صرف معاشی و سیاسی معنوں میں نہیں بلکہ سیاسی سطح پر دنیا میں انصاف کی قوتیں بھی متوازن eco-system کی طرح انسانوں کی عمومی بھلائی کے لیے عالمی انصاف کا چلن چاہتی ہیں۔ سجاد ظہیر جیسے منتظم اور مفکر کی یہ خواہش تھی کہ دنیا کے تمام حقیقت پسند اور انصاف پسند ادیب دنیا بھر کے مسائل کی بہتر تفہیم کے لیے ایک پلیٹ فارم پر نظر آسکیں اور ان کی یہ خواہش ایک ایسے برصغیر میں تھی جہاں اس ملک کے دو بڑے مذہبی گروہ اتحاد فکر و نظر جیسے ضروری فریضے کی بجا آوری میں کافی سست رو تھے بلکہ اپنے گروہ کے علاوہ دوسرے گروہ کی تنقید تو کیا سنتے خود اپنے مذہبی گروہ میں بھی Plurality of views کے قائل نہ تھے۔

سجاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے اور ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء کو ہم سے بچھڑ گئے یعنی انہوں نے کل ۶۸ برس کی زندگی پائی لیکن یہ زندگی کیا تھی ایک طوفان تھا۔ اگست کے مہینے میں ٹورنٹو کے دوستوں

کی طرف سے سجاد ظہیر کی یاد منانا درحقیقت ایک ایسے شخص کی یاد منانا ہے جس نے برصغیر کے منجمد سماج کو متحرک کرنے میں بنیادی کام کیا۔ آج معاشرت ہو، معیشت ہو، سیاست ہو یا ادب ہو ہم کسی نہ کسی طرح سجاد ظہیر کی بینائی اور فہم سے استفادہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ہم اس حقیقت کا اعتراف کریں یا نہ کریں۔ وہ کسی نہ کسی حد تک ہمارے ذہن کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی

حیاتِ سجاد ظہیر کے چند روشن باب

سجاد ظہیر نے اپنا تخلیقی سفر فکشن سے کیوں شروع کیا؟

بظاہر یہ کوئی اہم سوال نہیں ہے۔ یہ سوال تو کسی بھی صنف یا موضوع سے متعلق کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ذرا غور کیجیے تو اس سوال کی پرتیں اور جہتیں ہیں۔

سجاد ظہیر نے جو اعلیٰ خاندان، ماحول اور اُردو کا جو تہذیبی پس منظر پایا تھا اس کے پیشِ نظر تو ان کو اولاً شاعر ہی ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اور آگے بڑھ کر انہوں نے بہت کچھ مختلف کیا جو ان کی خاندانی روایت اور شان و شوکت کے خلاف جاتا ہے۔ اس معمولی سے سوال کا جواب تلاش کیا جائے تو غیر معمولی جواب ملے گا اور یہ جواز بھی کہ انہوں نے 'انگارے' کے افسانے اور 'لندن کی ایک رات' جیسا ناول پہلی منزل پر کیوں لکھا اور باقی چیزیں بعد میں لکھیں بلکہ ان کی حیات کے بھی بعض ایسے روشن پہلو سامنے آئیں گے جو 'بنے' کو سجاد ظہیر اور بیرسٹر کو رائٹر بنانے اور روایتی شاعر کے بجائے دردمند اور سرکش فکشن نگار بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔ ان باریک اور اہم عوامل و محرکات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ جس نے ان کو مخصوص اودھی ثقافت سے ملکی اور عالمی سیاست اور مذہب سے اشتراکیت کی طرف موڑ دیا۔ اکثر اس تلاش میں ہماری رسائی مغربی حالات اور مغرب میں ان کی تعلیم و تربیت تک تو ہوتی ہے اس کے پہلے کے واقعات یعنی ان کے گھریلو معاملات پر ہماری نگاہیں کم ہی پہنچ پاتی ہیں۔ اس مختصر سے مقالے میں بنے بھائی کے

گھریلو ماحول، ابتدائی تعلیم و تربیت اس کے بعد مغرب کے سفر کے حوالے سے اصل سجاد ظہیر کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی زندگی خود ایک تاریخ ہے اور جس کا عمل ایک تحریک۔

یہ سچ ہے کہ سجاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک اچھے اور کامیاب وکیل تھے لیکن شروع میں سب کچھ ویسا نہیں تھا جیسا کہ اکثر سجاد ظہیر کے گھرانے کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ یعنی کچھ باتیں ایسی تھیں جو قدرے غیر شاعرانہ تھیں اور پریشان کن بھی' کم از کم سجاد ظہیر جیسے حساس اور سنجیدہ انسان کے لیے مثلاً اپنے والدین اور خاندان کے بارے میں خود سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

'گو کہ میری پیدائش اور پرورش اس صدی کی پہلی دہائی میں لکھنؤ میں ہوئی گولہ گنج منشی اطہر علی کی کوٹھی میں جہاں میرے والد سید وزیر حسن رہتے تھے اور جہاں ان کی وکالت کی دکان بھی تھی لیکن میرے گھر کا ماحول دیہاتی تھا۔ میرے ماں اور باپ دونوں ضلع جونپور کے چھوٹے زمیندار خاندان کے دیہاتی سادات تھے۔ میرے دادا تحصیلدار تھے اور انہوں نے میرے والد کو بڑی مشکلوں سے علی گڑھ سے بی۔ اے اور الہ آباد سے ایل۔ ایل۔ بی پاس کرا کے وکیل بنایا۔ پہلے انہوں نے جونپور اور پھر پرتاپ گڈھ میں وکالت شروع کی پھر لکھنؤ آئے۔ میرے پیدا ہونے تک (میں سات بھائی بہنوں میں چھٹا تھا) وہ کافی خوشحال ہو چکے تھے لیکن رات کو جب ہم بھائی بہن اپنے والدین کے ساتھ کھانے پر بیٹھتے تو بابا اپنے ابتدائی وکالت کے دنوں کی مصیبتوں کا ہم سے تذکرہ کرتے۔ ہماری ماں ہم سے بتاتیں کہ جب وہ اپنی ساس کے یہاں رہتی تھیں تو کیسی کیسی سختیاں برداشت کرنا پڑتیں اور ساس کی زبان کے تیر کھا کر بھی چپ رہنا پڑتا۔ ہمارے گھر میں دیہات کے نوکر اور نوکرانیاں ہوتے تھے اور پھر کئی بے روزگار چچا چچیاں اور اس طرح کے اور رشتے دار اور یہ سب جونپور کے دیہاتی سید اور سیدانیاں لکھنؤ والوں کی ہمیشہ برائیاں کرتے

رہتے...... ان کے نزدیک لکھنؤ والوں کا حسب نسب کچھ ٹھیک نہیں تھا ان
کی بات کا کچھ اعتبار نہیں تھا۔ ہم لوگ گھر میں آپس میں دیہاتی زبان
بولتے تھے باہر والوں سے البتہ اسٹینڈرڈ اردو بولنے کی کوشش کرتے لیکن
زبان کا فرق نمایاں ہو جاتا۔ لکھنؤ والے ہنس پڑتے تو ہم کو بڑی کوفت
ہوتی اور ہم ان سے اور بھی بگڑ جاتے کہ یہ لوگ کتنا بنتے ہیں۔
(شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا)

ان جملوں سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر کا خاندان اصلاً جونپور کے ایک گاؤں کا تھا
جس کا لکھنؤ شہر یا لکھنؤ تہذیب سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس کے برعکس وہ لکھنوی تہذیب کو بُرا اور تصنع
سے بھرا سمجھتے تھے اس لیے کہ دیہات کے لوگ عموماً سادہ اور کھرے ہوتے ہیں۔ ان کے گھر کے
اندر دیہاتی زبان بولی جاتی تھی اور بعد میں خوشحال ہو جانے کے بعد ان کے گھر میں نوکر نوکرانیوں
اور بے روزگار و پریشاں حال عزیزوں و رشتہ داروں کی بھیڑ رہتی۔ ساس بہو کے رشتے یا خاندان
کے دوسرے رشتے کچھ بہت اچھے اور خوشگوار نہ تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ
ماحول کس قدر غیر ادبی اور غیر شاعرانہ تھا۔ ان کے والد ایک معمولی سے وکیل کے بجائے بڑا وکیل
بننے کی ذہن میں ہمہ وقت مصروف رہتے اور گھر بار آل اولاد، کم پڑھی لکھی والدہ یا نوکر چاکر پر ٹکا
رہتا۔ یہ بات اس لیے اہم ہے کہ ایسے ماحول میں کم عمر سجاد ظہیر عرف بنّے والدین سے کم ان معمولی
اور گھریلو کرداروں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جن کے ساتھ ان کا بچپنا گزرتا ہے اور ان کے ذہن
میں نچلے طبقے کے کرداروں کی ایک دنیا آباد ہونے لگتی ہے۔ مثلاً ان کے گھر میں ایک نوکرانی تھی،
گوری۔ ایک لاوارث نوجوان لڑکی جو قحط میں ان کے گاؤں آئی اور خرید لی گئی اور بقول سجاد ظہیر یہ
والدہ کے بہت منہ چڑھی تھی اور بہت سارے کاموں کے ساتھ ایک اہم کام یہ بھی تھا کہ وہ ان
سب بھائیوں پر نظر رکھتی کہ کون کیا کر رہا ہے کہاں کھیل رہا ہے اور پھر جا کر والدہ کو رپورٹ کرتی۔
ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان بھائیوں کی بھی اس پر نظر رہتی اور اس طرح سجاد ظہیر اس لڑکی یعنی
کہ ملازمہ کو قریب سے سمجھنے لگے۔ ہر چند کہ آپ بیتی نما مضمون میں وہ سرسری طور پر ہی اس نوکرانی
کا ذکر کرتے ہیں لیکن گوری کئی زاویوں سے ان کے اعصاب پر اس طرح سوار رہی کہ آگے چل کر

اس نے دلاری کا روپ لے لیا اور 'انگارے' میں شامل ان کے ایک افسانے میں سما گئی۔ کہانی 'دلاری' کے یہ ابتدائی جملے دیکھیے:

> 'گوکہ بچپن سے وہ اس گھر میں رہی اور پلی مگر سولھویں سترھویں برس میں تھی کہ آخرکار لونڈی بھاگ گئی۔ اس کے ماں باپ کا پتہ نہیں تھا۔ اس کی ساری دنیا یہی گھر تھا اور اس کے گھر والے شیخ ناظم علی خوشحال آدمی تھے گھرانے میں ماشاءاللہ کئی بیٹے اور بیٹیاں بھی تھیں۔ بیگم صاحب بھی بقید حیات تھیں اور زنانے میں ان کا پورا راج تھا۔ دلاری خاص ان کی لونڈی تھی اس سے گھر والے کافی مہربانی سے پیش آتے'۔

صاف اندازہ ہوتا ہے کہ گوری ہی دلاری ہے اور کہانی کا پورا تانا بانا اپنے ہی گھر کے ماحول سے بنا ہے۔ گھر میں جب کچے پکے کمزور و مضبوط کردار ہوئے تو کہانیاں تو یونہی جنم لینے لگتی ہیں اور ایسا بھرا پرا اجلدار ماحول کہانیوں کے لیے راس بھی آتا ہے۔ ایسے قصے اور ایسے کردار افسانوں اور ناولوں میں ہی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ شاعری میں نہیں۔ بات یہیں نہیں رُکتی، ابھی ایک کردار اور ہے جس نے سجاد ظہیر کو فکشن کی طرف موڑنے میں کلیدی رول ادا کیا۔ ان کا دلچسپ تعارف ہی بتاتا ہے کہ اس نے سجاد ظہیر کی ذہنی زندگی میں کیا انقلابی رول ادا کیا۔ لکھتے ہیں:

> 'ایک ہمارے جھنگری ماموں تھے۔ بوبو کے رشتے کے بھائی۔ یہ بھی خاقان منزل کے مردانے کی بے شمار کوٹھریوں میں سے ایک کوٹھری میں رہتے تھے۔ گاؤں سے شہر آئے تھے نوکری کے لیے...... بالکل نحیف و دبلے پتلے تھے چالیس سال کے رہے ہوں گے۔ گندمی رنگ، داڑھی منڈی، مونچھیں اوپر کے لب سے بے پروائی سے لٹکی ہوئیں۔ گرمیوں میں لکھنؤ کی دوپلی ٹوپی اور انگرکھا پہنتے...... جھنگری ماموں بڑے شوقین آدمی تھے حقہ تو خیر پیتے ہی تھے ان کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ افیون بھی کھاتے ہیں۔ ان کے تین شوق تھے اردو کے اخبار، رسالے اور ناول پڑھنا۔ شام کو چوک یا امین آباد کی سیر کو جانا اور عشق بازی۔ ان کے

بارے میں بہت کچھ سنا کرتا کچھ سمجھ میں آتیں اور کچھ نہ آتیں مثلاً کسی نے آ کر جب بوبو سے کہا۔ 'اے بہنی سنت ہیو جھنگری میاں تو ستیلائن سے پھنسے ہیں'۔ تو میری یہ تو سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ کیا ہے لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آیا کہ کوئی ایسی بات ہے جو بُری ہے اور دلچسپ بھی۔ اس دن کے بعد سے میں جھنگری ماموں اور ستیلائن کو بات کرتے دیکھتا تو دل میں سوچتا شاید اسی کو پھنسنا کہتے ہیں۔ اس زمانے میں ان دونوں سے زیادہ دلچسپ ہمارے لیے کوئی نہ تھا'۔

اس سے زیادہ جس بات کے لیے جھنگری ماموں نے سجاد ظہیر پر اثر ڈالا وہ کچھ اور ہے سجاد ظہیر کے لفظوں میں دیکھیے:

'جب ہماری عمر آٹھ نو برس کی ہوئی تو ہم کو اُردو پڑھنا آ گیا تھا۔ جھنگری ماموں کی کوٹھری میں اُردو ناولوں کا انبار لگا رہتا۔ وہ پلنگ پر لیٹے عینک لگائے انہیں پڑھا کرتے۔ میں چپکے سے ان کے کمرے میں داخل ہوتا اور کوئی نہ کوئی ناول لے کر جیسے بھی بنتا پڑھنا شروع کر دیتا۔ اسی زمانے میں، میں نے ناول پڑھنے شروع کیے۔ وہ ان کتابوں کے مقابلے میں جو مجھے مولوی صاحب سے یا بعد کو اسکول میں پڑھنا پڑتیں کہیں زیادہ دلچسپ تھے۔ خوبصورت ہیروئن، بہادر ہیرو، بدمعاش، بُرے اور دھوکے باز لوگ جو ہیرو ہیروئن کو پیار محبت کرنے سے روکتے کتنی مزیدار اور خوشگوار تھی یہ خیالی دنیا، زیادہ تر یہ وہ ناول تھے جن کو آج کل رومانی یا جاسوسی کہا جاتا ہے یا پھر شرر کے ناول...... بڑی ماں مجھے ان ناولوں کے پڑھنے سے روکتیں لیکن جھنگری ماموں کے یہاں سے ان کی لگاتار سپلائی جاری رہتی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ جب ماموں نہیں ہوتے تو میں چپکے سے ان کے کمرے میں گھس کر ان کے انبار میں سے کوئی ناول نکال لیتا اور پھر کسی کونے میں چھپ کر، ماں کی نظر بچا کر دوپہر کو یا رات کے وقت

انہیں بے تحاشا پڑھتا، ختم کرنے کے بعد پھر جا کر انہیں واپس رکھ آتا۔
جھنگری ماموں کو خبر بھی نہیں ہوتی'۔

بچپن کے اس واقعے اور اس کردار نے سجاد ظہیر پر کس قدر اثر ڈالا اور انہیں کتنا تبدیل کیا اور جھنگری ماموں انہیں ایک نعمت کے طور پر ملے۔ اس کا احساس انہیں زندگی بھر رہا۔ بہت بعد میں اپنی آپ بیتی میں اس ملاقات کو تاریخی اور تعلیمی حیثیت دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہمارا نظام تعلیم اور اخلاق اور مذہبی تربیت کا طریقہ کتنا ناقص اور مجہول ہے کہ معمولی طور پر اس سے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو اگر کچھ سیکھنے کو ملتا بھی ہے تو کتنی ذہنی اور روحانی اذیت کے ساتھ۔ ! کیا کم عمر معصوموں کو اس بُری طرح سے دکھ پہنچانا ضروری ہے؟ چالیس سال سے زیادہ گذر گئے ہیں، ابھی تک اس نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ہم اگر کچھ سیکھتے بھی ہیں اور ہمارے ذہن میں کچھ کشادگی اور روشنی بھی آتی ہے تو اس اذیت اور کوفت کے بابعد۔ شکر ہے کہ مجھے میرے جھنگری ماموں مل گئے تھے'۔

جھنگر ماموں کا زندگی میں آنا، اُن سے متاثر ہونا یا ان کے ذریعہ ناولوں کا شوق سجاد ظہیر کی زندگی کی کایا پلٹ دیتا ہے اور وہ شکر ادا کرتے ہیں کہ ان کی زندگی میں ایسا عاشق مزاج کردار داخل ہوا جس نے ان کے اندر کے خشک ماحول کو تر و تازہ کیا اور ایک راستہ بھی دکھایا۔ جھنگری ماموں کا شام کو چوک میں سیر کے لیے جانا ایسا ہی ہے جیسے ان کی کہانی گرمیوں کی ایک رات میں منشی برکت علی کا چہل قدمی کرتے ہوئے امین آباد تک جانا۔ کیا یہ دونوں کردار ایک دوسرے کے قریب نہیں ہیں؟ اور بات صرف کرداروں کی بھی نہیں ہے اس نفسیات اور اس غور و فکر کی ہے جس نے سجاد ظہیر کو ابتدا سے ہی نچلے طبقے کی ایسی دنیا اور اس کے رنگا رنگ کرداروں سے روشناس کرایا جس نے بچپن سے ہی ان کی دلچسپی ایسی دنیا اور ایسے کرداروں سے پیدا کر دی اور وہ اس میں اتنا گم ہو گئے کہ جب انہیں مکتب میں بٹھایا گیا تو ان پر بجلی سی گر پڑی۔ لکھتے ہیں:

'ہم چھے سات برس کے رہے ہوں گے کہ آزادی اور خوشی اور بے فکری کی

اس رنگ برنگی دنیا پر جیسے ایک بجلی گری۔ میری بسم اللہ کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور دوسرے دن مجھے باقاعدہ مکتب میں بٹھا دیا گیا۔
میرے بڑے بھائیوں کو دینیات، عربی، فارسی پڑھانے کے لیے ہمارے والدین نے ایک عالم فاضل مولوی کو ہمارے گھر پر ہی رکھ لیا۔ وہ جائس کے بڑے مشہور مولوی کے خاندان کے ایک فرد تھے۔ دُبلے پتلے، لمبے خش خشی داڑھی عمر کوئی تیس پینتیس سال کی ہوگی۔ مجھے مولوی صاحب سے بڑا ڈر لگتا تھا ان کی آواز بڑی کرخت تھی۔ ہمارے بابا روزہ نماز کے پابند نہیں تھے اسی لیے ہماری ماں نے مولوی صاحب کو کہہ رکھا تھا کہ باپ کے اثر سے نہیں تو مولوی صاحب کے اثر سے ہم لوگ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہوں اور اچھے مسلمان بنیں لیکن اس نسخہ کا کچھ الٹا ہی اثر ہوا'۔

الٹا اثر تو ہونا ہی تھا اس لیے کہ سجاد ظہیر تو جھنگری ماموں، گوری، سیتلائن کے راستے سے ہوتے ہوئے رومانی جاسوسی ناولوں کی دنیا میں غرق تھے۔ کچھ ان کرداروں اور ناولوں کی غیر معمولی دلچسپیاں۔ اس سے زیادہ اس طبقے کی زندگی کی حیرت خیزیاں، زندگی کی رنگا رنگ اور بے رحم سچائیاں سجاد ظہیر کو دوسری دنیا میں لے جا رہی تھیں ایسے میں دین، مذہب کی اصولی اور اخلاقی باتیں انہیں کیسے راس آسکتی تھیں چنانچہ اس وقت یا بعد میں بھی انہوں نے اس طرح کی دینی تعلیم کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ بے حد معنی خیز ہے۔ لکھتے ہیں:

'میں نے ان مولوی صاحب سے کوئی چھ سات برس تک تعلیم حاصل کی۔ دینیات اور اخلاقیات کے سبق کے لیے نمازیں پڑھیں۔ آج اتنے برس بیت جانے پر بھی اس تلخی کی یاد دل پر نقش ہے اور کوئی سبق مجھے مولوی رضی حسن صاحب مرحوم سے ملا ہو یا نہ ملا ہو اس بات کا مجھے عملی تجربہ ضرور ہے اور اس لیے یقین ہے کہ اچھائیاں اور نیکیاں شدت اور جبر کے ساتھ ہرگز کسی کو سکھائی نہیں جاسکتیں اور یہ کہ زہد وتقویٰ پارسائی بسا اوقات انسان کی انسانیت کم کرکے اسے شقی القلب، مغرور اور خود پرست بنا دیتے

ہیں۔ ہمارے مولوی صاحب برے آدمی بالکل نہ تھے۔ دنیا کو صراطِ مستقیم
پر لگانے کی دھن نے انہیں برباد کر دیا تھا'۔

ملاحظہ کیجئے کہ مولوی صاحب کے ساتھ گذارے ہوئے لمحے ان کی تلخ یادوں کا حصہ ہیں اور جھنگری ماموں کے ساتھ گذارے ہوئے لمحے ان کی شیریں اور قیمتی یادوں کا حصہ ہیں۔ اسی سے سجاد ظہیر کی بدلتی ہوئی نفسیاتی اور انقلابی فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس نے آگے بڑھ کر 'جنت کی بشارت' جیسی کہانی لکھنے پر مجبور کر دیا کہ اس کہانی کے مولوی محمد داؤدان کے بچپن کے مولوی رضی حسن سے جدا نہ تھے اور کہانی میں ان کا سراپا بھی اسی طرح پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان احساسات کے پیچھے کردار نہیں بلکہ پورا اخلاقی و مذہبی نظام کام کر رہا تھا جسے سجاد ظہیر بہت قریب سے دیکھ رہے تھے اور جس نے ان کے ذہن کو بری طرح سے جھنجھوڑ رکھا تھا اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ والدین گھر کی تعلیم و تربیت، گھر کے دیگر افراد، علم و شعور، تہذیب و تمدن کے اعتبار سے تعمیری رول ادا کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک حساس و سنجیدہ نوجوان انہیں حوالوں سے لاشعوری طور پر خیالات و تصورات کی ایک نئی دنیا سے دوچار ہوتا چلا جاتا ہے۔ سجاد ظہیر خود لکھتے ہیں:

'اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ذہنی اور شعوری طور پر ایک خیال یا تصور کو صحیح بھی تسلیم کر لیتے ہیں ہماری عقل ایک بات کو قبول بھی کر لیتی ہے لیکن اپنے طبقے اور خاندان کے خصائل اور اسی قسم کے دوسرے اثرات، عادتیں، توہمات، روایتیں اور جبلتیں خفیہ اور غیر شعوری طور پر ہمارے عمل حرکات اور سکنات پر اثر ڈالتی رہتی ہیں۔ ہم اپنے متعلق طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم فلاں لائحہ عمل کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تاہم ہمارے عمل اور خود ہماری فکر کو بعض انجانی طاقتیں ایسی جگہ کھینچ لے جاتی ہیں جو اس لائحہ عمل اور ان کے اخلاقی اصولوں سے کافی حد تک دور ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تہذیب کے معنی دراصل انسان کو اندھی فطرت جبلت، تحت الشعور یعنی تمام انجانے، تاریک، نہ سمجھ میں آنے والے اتفاقی اور سانحاتی اثرات اور ان سے پیدا

ہونے والی کیفیتوں سے چھٹکارا دلا کر روشن، شعوری، عقلی کبھی ہوئی منظم
راہوں پر لے جاتا ہے۔ ہمارے وہی خواب سب سے خوبصورت اور
مسرت بخش ہوتے ہیں جن کی بنیاد حقیقت اور سچائی پر ہو۔

اسی حق پسندی اور بے خوفی نے ہی اُن سے 'انگارے' کے نہ صرف افسانے لکھوائے بلکہ چھپوائے اور ہنگامے کروائے۔ آج ان ہنگاموں اور افسانوں کے بارے میں کوئی کچھ بھی کہے لیکن وہ حق پسندی، بے باک کلامی اور فرسودہ نظام کے خلاف ایک آوازِ جرس تو تھے ہی اس کی تاریخیت اور انقلابیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ اب ان افسانوں کو نئے تناظر میں سمجھنے اور ان کے فکر وفن پر ایک نئے سرے سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی ماحول میں ایک خاص راستہ پا کر جب سجاد ظہیر کے ذہن اور زندگی کا سفر آگے بڑھا تو ملک کی ریاست اور وطن کی محبت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت ملک و معاشرے کے حالات ہی کچھ ایسے تھے جس نے ہوش مند اور سنجیدہ سجاد ظہیر کو نئے نئے معاملات، حالات اور تصورات سے دوچار کیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ملک کی سیاست سجاد ظہیر کے گھر میں بھی پنپ رہی تھی۔ ان کے والد مذہب میں نہ سہی لیکن ریاست کے معاملات میں اچھا خاصا دخل رکھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

'ہمارے گھر کی سیاسی فضا آزادی خواہی کی تھی۔ میرے والد مسلمان
لیڈروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کانگریس کے ساتھ مل کر
انگریزی حکومت کے سامنے ہندوستان کے لیے ذمے دار حکومت کا
مطالبہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں مسلم لیگ کے
سیکریٹری تھے اور ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا پیکٹ
ہوا تو اس میں وہ پیش پیش تھے۔ لکھنؤ میں قیصر باغ کی بارہ دری میں لیگ
کا وہ سیشن مجھے اچھی طرح یاد ہے جس میں کانگریس کے لیڈر بھی شریک
تھے۔ گاندھی جی، مسز سروجنی نائیڈو، بال گنگادھر تلک، جناح صاحب کو
میں نے اسی زمانے میں دیکھا'۔

پھر ایک بار سروجنی نائیڈو سجاد ظہیر کے گھر بھی آئیں اور سب کو اپنا اسیر کر لیا۔ خاص طور پر سجاد

ظہیر کو۔ اس کے دوسرے ہی دن قیصر باغ کی بارہ دری میں نوجوان سجاد ظہیر نے پہلی بار مسز نائیڈو کی تقریر سنی اور اسی جلسے میں گاندھی جی کو بھی دیکھا اور اسی دن سے سجاد ظہیر کے دل میں وطن کی آزادی اور قومی اتحاد کا احساس غیر معمولی طور پر بیدار ہوا اور وہ عملی سیاست کے بارے میں غور کرنے لگے:

'نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک جب شروع ہوئی تو میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔ میری عمر کوئی پندرہ سال کی ہوگی۔ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ مجھ پر اس تحریک کے اثر پڑے۔

ہر جگہ جلسے جلوس، اسٹرائیک، بائیکاٹ، پولیس کا تصادم اور پھر یہ شعر۔

بولیں اماں محمد علی کی   جان بیٹا خلافت پہ دیدو

انہیں کیا معلوم کہ ان کا خطاب تو اصلاً اپنے بیٹے سے تھا لیکن نجانے کتنے بیٹے جنگِ آزادی میں کودنے کے لیے تیار تھے۔ سجاد ظہیر بھی ان میں سے ایک تھے۔ ان کے لیے یہ بات زیادہ خوش کن تھی کہ اودھ کے دیہات کے کسان، زمیندار کو لگان دینے سے انکار کر رہے ہیں بڑی بڑی کسان سبھائیں ہو رہی ہیں ان سب کا براہ راست اثر سجاد ظہیر پر پڑ رہا تھا اور وہ ہر اعتبار سے بدل رہے تھے۔ لکھتے ہیں:

'میں نے ان حالات اور فضا سے متاثر ہو کر کھدر پہننا شروع کر دیا تھا۔ سر کے بال منڈوا دیے تھے۔ گوشت کھانا ترک کر دیا تھا۔ پلنگ پر سونا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے چرخا کاتنا بھی شروع کر دیا تھا اور اپنی ماں بہن کو بھی چرخا کاتنے اور کھدر پہننے پر آمادہ کر لیا تھا۔ میرے والد نے میری ان حرکتوں پر کوئی تعارض نہ کیا۔ جب بھی کسانوں کی عام بے چینی، بمبئی میں مزدوروں کی ہڑتال کی خبریں آتیں تو میرا دل خوش ہوتا۔ انگریزوں یا انگریزی حکومت کے تشدد کے خلاف ہندوستانیوں کے جوابی حملوں کی خبر سے بھی خوشی ہوتی'۔

لیکن گاندھی جی کی طرف سے امن و آشتی اور صلح پسندی کی بات ہوتی تو سجاد ظہیر حیران

ہوتے، وہ کبھی حسرتؔ موہانی کے اعلان سنتے تو کبھی تلک مہاراج کی جے جے کار، تشدد اور عدم تشدد کے درمیان پھنسی اس سیاست کی کشمکش و تذبذب سے جلدی ہی نکل کر وہ اپنی راہ مزدوروں اور کسانوں کے درمیان تلاش کرنے لگے۔ اسی زمانے میں وہ کانگریس کی اقتداری سیاست سے نکل کر مزدوروں کی جماعت میں شامل ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ کمیونسٹ تحریک اور مارکسی نقطۂ نظر کے قریب آ گئے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

'یہ ظاہر ہے کہ میری زندگی پر یعنی اس کا رُخ اور سمت متعین کرنے میں ہمارے وطن کی قومی آزادی کی جدوجہد اور کمیونسٹ تحریک اور مارکسی نظریۂ حیات نے سب سے زیادہ اور فیصلہ کن اثر ڈالا۔'

اور پھر سجاد ظہیر ایک ایسی راہ پر چل پڑے جو ان کے خاندانی روایات، اسلامی شعار اور اس عہد کے عام سے نوجوانوں کی راہ سے بالکل الگ تھی اور وہ اس راہ پر چل کر خوش و مطمئن تھے۔ غریبوں کی مدد، مزدوروں کی حمایت اور عوام کی محبت نے سجاد ظہیر کو بدل کر رکھ دیا وہ بڑے افتخار سے لکھتے ہیں:

'جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس جہادِ اکبر میں سب سے زیادہ جس چیز نے میری مدد کی وہ ہندوستانی عوام ہیں یعنی مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کی وہ جدوجہد ہے جو انہوں نے اپنی زندگی آزاد، خوشحال اور مہذب بنانے کے لیے جاری رکھی اور جس کا ایک ناچیز حصہ بننے کا مجھ کو شرف حاصل ہوا ہے اس جدوجہد کی بہترین تنظیم اور رہنمائی میری نظر میں یہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے کی ہے اس لیے کہ میرے نزدیک وہ ہماری قوم کی اعلیٰ ترین روایتوں کی نمائندگی کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جس مارکسی نظریہ پر اس کے عمل کی بنیاد ہے سماج کو سمجھنے اور بدلنے اور اس کی نئی اور بہت زیادہ منصفانہ اور زیادہ لطیف اور بارآور تربیت و تنظیم کرنے کے لیے اس نظریہ سے زیادہ سائنٹفک نظریہ نوعِ انسانی کے پاس اس عہد میں کوئی اور دوسرا نہیں ہے۔'

روزہ نماز کرنے والے، تلاوت کلام پاک کرنے والے، مولانا رضی حسن سے اسلامیات کا درس حاصل کرنے والے، جھنگری ماموں سے اثر لینے والے، گاندھی جی اور نائیڈو سے متاثر ہونے والے نوجوان سجاد ظہیر کو جواماں ملی تو کہاں ملی۔ یہ سب اچانک کسی حادثے یا فیشن کے طور پر نہیں ہوا اس کے پس پردہ پندرہ بیس برس کا گذرا ہوا زمانہ گھر یا باہر کا سانحہ، افراد سے ملنے کا تجربہ، ہندو مسلم کا جھگڑا، ملک کا مرحلہ، اس سے زیادہ انسان، مزدور کسان کے وجود کا مسئلہ ان سب نے مل کر ایک نئے سجاد ظہیر کو تیار کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے کچھ تھا جو لاوے کی طرح ان کے ذہن میں کھول رہا تھا۔ ایسے میں جب جتن داس نے ایک انگریز کو گولی ماری۔ بسمل اشفاق اللہ وغیرہ نے سرکاری خزانہ لوٹا تو ان سب واقعات کو سجاد ظہیر نے تعریف کی نگاہ سے دیکھا اور انہیں اس بات کا یقین ہو گیا:

> 'اب میں رفتہ رفتہ اس خیال کا قائل ہو گیا کہ بغیر انقلاب کے ہندوستان کو آزادی نہیں مل سکتی۔ کچھ مبہم طریقے سے یہ خیال بھی سامنے آنے لگا کہ ہمیں اپنے ملک میں روس کی طرح مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کرنی چاہیے'۔

اور اس طرح سجاد ظہیر کمیونزم کے قریب آتے ہی گئے اور ان کے اشتراکی خیالات مضبوط اور مستحکم ہوتے گئے۔

یہی وہ دور ہے جب سجاد ظہیر نے ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے میں داخلہ لیا اور تاریخ، سیاست اور معاشیات کے مضامین منتخب کیے لیکن ابتداء سے ادب اور فکشن کی طرف مائل ذہن نے نصاب کی کتابیں کم انگریزی اور روسی ناول کی طرف زیادہ مائل کیا۔ لکھتے ہیں:

> 'اسی زمانے میں، میں نے ٹالسٹائی، تورگنیف، اناطول، بالزاک وغیرہ کے ناول پڑھے۔ ایک کتاب جس کا میرے اوپر بہت اثر ہوا اور جسے میں نے بعد کو خرید کر پڑھی۔ "برٹرنڈ رسل کی روڈس ٹو فریڈم" (آزادی کی راہیں) تھی۔ اس کتاب کو پڑھ کر مجھے کیمونزم، سوشلزم، انارکزم وغیرہ کے بارے میں کسی قدر ٹھوس واقفیت ہوئی۔ رسل کی تحریریں مجھے پسند آنے

لگیں اور اب میں نے ان کی دوسری کتابیں بھی پڑھیں۔ رسل کی کتابوں اور اناطول فرانس کے ناولوں میں مذہبی عقیدہ پرستی خاص طور پر عیسائی مذہب عقائد پر عقل پسندی اور سائنس کی بنا پر سخت فلسفیانہ اور اخلاقی اعتراضات کیے گئے تھے اس کا میرے اوپر بہت گہرا اثر ہوا۔ رسل اور اناطول کے بیشتر اعتراضات ہندوستانی مذہبی عقائد پر بھی صادق آتے تھے۔ اِدھر ہمارے ملک میں مذہب کا جو عملی مظاہرہ ہو رہا تھا وہ پسندیدہ تو نہیں تھا۔ ان سب باتوں کا میرے بھی دل و دماغ پر اثر پڑا اور یہ خیال حاوی ہونے لگا کہ مذہب اپنی موجودہ شکل میں نوع انسان کے لیے رحمت نہیں بلکہ ایک ...... ہے۔ ایسے عقیدے جو دلوں میں گداز، نرمی، محبت اور مُروّت پیدا کرنے کے بجائے انسانوں اور انسانوں کے درمیان نفرت اور دشمنی پیدا کریں ایسے عقیدے جو انسانوں کو عقل کی روشنی، تجربے تجدید اور ارتقا سے دور کریں بلکہ ان کی راہ میں رکاوٹ بنیں اور جن کو رجعت پرست انسانوں پر ظلم اور تعدی کرنے والے اور انہیں غلام بنانے والے اپنے پست مقاصد کے لیے ہر موقع پر استعمال کر سکیں کیا ان میں کوئی بنیادی کھوٹ نہیں ہے؟''

بہت سارے سوالوں اور الجھنوں میں گھرے سجاد ظہیر نے حیات و کائنات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور ان کی سوچ کا سلسلہ آگے بڑھتا ہی رہا۔ دماغ کی کھڑکیاں کھل چکی تھیں۔ انسان اور انسانی محنت کے کرشمے، فکر و شعور کے کارنامے ان کے شعور کو متزلزل کر چکے تھے ایسے میں جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے برطانیہ روانہ ہوئے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغربی علوم و فنون، تعلیمی و تہذیبی فضا، تصورات و تحریکات نے ان تمام عناصر کو کس نوع کی جلا بخشی ہوگی جو وہ ہندوستان کی سماجی اور سیاسی فضا سے لے کر گئے تھے۔ پروفیسر عتیق احمد لکھتے ہیں:

۱۹۳۰ء کے لگ بھگ انہوں نے زندگی کی پگڈنڈی پکڑ لی۔ اس وقت ۲۴/۲۵ برس کی بھری جوانی کے دن تھے۔ گھر سے کالے کوسوں دور پیسے

دھیلے کی فکر سے آزاد لندن جیسا آزاد منشوں کا شہر، اوپر سے کوئی نہ روکنے
والا نہ کوئی ٹوکنے والا۔ مگر عجیب مٹی کے بنے ہوئے تھے نہ آوارگی نہ عشق
معاشقے۔ انہوں نے ہر قسم کی آوارگی اور بے راہ روی کے راستے اور گلیاں
خود اپنے ہاتھوں سے ایک ایک کر کے اپنے اوپر بند کر لیے۔

اور جو راستہ کھولا اس میں آگ لگ گئی یا یوں کہیے کہ یہ آگ بھی خود انہوں نے ہی لگائی۔ 'انگارے' کے تمام افسانے انہوں نے لندن میں ہی لکھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہے چھپوایا لکھنؤ میں آ کر اور اسے لکھنؤ میں چھپنا ہی چاہیے تھا۔ ان افسانوں کے موضوعات تو ہندوستان کے تھے لیکن خیالات و تصورات، جرأت و جسارت مغرب کی تھی یا پھر اس پورے ذہنی سفر کی جس کے نئے سلسلے مغرب میں جا کر شروع ہوئے تھے اور پھر یہ سلسلے دراز ہوتے ہی چلے گئے۔ خرابی صحت نے فرانس اور سوئزر لینڈ کے سفر کرائے۔ سال دو سال کے قیام نے سجاد ظہیر کو فرانسیسی ادب سے قریب کیا اور عالمی صورتِ حال کو مزید قریب سے سمجھنے کے مواقع ملے۔ جب واپس لندن آئے تو وہ مکمل کمیونسٹ ہو چکے تھے۔ یہیں ان کی ملاقات محمود الظفر، ملک راج آنند، ڈاکٹر اشرف وغیرہ سے ہوئی۔ لندن میں 'مجلس طلبائے ہند' نام کی انجمن کے وہ فعال رکن بنے اور اس کی نمائندگی کرتے ہوئے فسطائی مخالف کانفرنس میں شرکت کرنے فرانکفرٹ گئے اور سوویت گروپ سے ملاقات کی۔ ۱۹۲۹ء میں ہی انہیں سائمن کمیشن کے خلاف جلوس نکالنے کی سزا میں پولیس کے ڈنڈے بھی کھانے پڑے۔ اس کے بعد ان کا سارا وقت ہندوستانی دوستوں اور اس سے زیادہ مغربی مصنفین کے مارکسی گروپ کے ساتھ گذرتا۔ ۱۹۳۵ء میں بیرسٹری پاس کی اور پیرس میں ہونے والی ادیبوں کی عالمی کانفرنس میں شرکت کی۔ اس لیے کہ کمیونسٹ ہونے اور مارکسی نظریۂ حیات پر یقین کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بنیادی طور پر ادیب تھے اور ادب سے ہی انہیں اولین لگاؤ تھا اور اظہار خیال کا بنیادی وسیلہ۔ سبط حسن لکھتے ہیں:

'سجاد ظہیر بنیادی طور پر ادبی مزاج رکھتے تھے چنانچہ لندن میں ان کے
تعلقات آڈن لوئس میکنس' اسٹیفن اسپنڈر' رالف فاکس' جیک لنیے'
ڈیوڈ گیسٹ ملک راج آنند ایسے اہم ادیبوں اور شاعروں سے ہو گئے تھے

جوان دنوں ترقی پسند رجحانات کے لیے مشہور تھے۔ سجاد ظہیر فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر پورا عبور رکھتے تھے لیکن انہوں نے ہمیشہ اپنے خیالات کا اظہار اردو ہی میں کیا اس لیے انہیں اردو سے بڑا گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔ لندن ہی میں انہوں نے اپنا مشہور و معروف ناول "لندن کی ایک رات" لکھ لیا تھا'۔

سچ یہ ہے کہ 'لندن کی ایک رات' کا بڑا حصہ لندن میں نہیں بلکہ پیرس میں لکھا گیا۔ یادیں میں لکھتے ہیں:

'اس درمیان میں، میں قانونی تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے لندن و انگلستان کو آخری خیر باد کہہ کر کچھ دنوں کے لیے پیرس میں مقیم تھا۔ یہاں میں اپنے دوست شوکت اللہ انصاری کے ساتھ رہتا تھا جو اس زمانے میں ڈاکٹری پڑھتے تھے۔ میرا زیادہ تر وقت 'لندن کی ایک رات' لکھنے میں صرف ہوتا۔ میں چاہتا تھا کہ اس ناول کو ختم کرلوں پھر وطن واپس آؤں کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ ہندوستان میں رہ کر فرصت نہ ملے گی'۔

سچ یہ بھی ہے کہ آزادی، آزاد خیالی اور انقلابی نوع کے رجحانات کا مرکز برطانیہ سے زیادہ یورپ تھا۔ اگر ایک طرف یہ علاقے ظلم اور فسطائیت کا مرکز بنے ہوئے تھے وہیں دوسری طرف انہیں ملکوں سے ان سب کے خلاف انقلابی عناصر سر ابھار رہے تھے۔ بلگیریا کا باغی دمتروف ان دنوں جرمنی میں ہی جلاوطنی کی زندگی گذار رہا تھا۔ اس کی رہائی کے لیے فرانس اور انگلینڈ میں مزدوروں کے مظاہرے ہوئے۔ جرمنی کے مصنفین، مصور، سائنس داں بھی اس ظلم کی مخالفت کر رہے تھے۔ فرانس بھی اس سے الگ نہ رہ سکا۔ فسطائیت کے خلاف یہاں کے عوام میں بھی بیداری آچکی تھی۔ سجاد ظہیر نے لکھا ہے:

'دمتروف کا مقدمہ، فرانس کے مزدوروں کی بیداری، آسٹریا کا ناکامیاب مزدور انقلاب آج ان واقعات کی اہمیت اکثر لوگوں کے لیے کچھ نہیں لیکن ہمارے لیے بہت تھی۔ یہ تو بالکل ظاہر معلوم ہوتا تھا کہ انسانیت کے

لیے بہت دنوں تک امن سکون چین ختم ہو گیا ہے۔ بڑی سخت کشاکش،
جدوجہد، بین الاقوامی جنگ، انقلاب کے دور کا آغاز ہم اپنے چاروں
طرف دیکھ رہے تھے۔ کیا آدمیت کبھی بھی اس سیلاب آتش و آہن سے
نجات حاصل کر سکے گی؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ ہم نوجوان جن کی رگوں میں
زندگی کا گرم خون گردش کر رہا تھا اپنے کو اس طوفان سے بچا سکیں گے؟'

۱۹۳۳ء میں فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ کی تحریک فرانس سے ہی شروع ہوئی۔ مشہور فرانسیسی ادیب ہنری باربس کی لگاتار کوششوں سے پیرس میں جولائی ۱۹۳۵ء میں ورلڈ کانگریس آف رائٹر فار دی ڈیفنس آف کلچر قرار پائی جس کے انعقاد میں مکسیم گورکی، رومین رولان، آندرے مالرو، ٹامس مان جیسے شہرۂ آفاق ادیب تھے۔ اس کانفرنس میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے شرکت کی اور اس عہد کے مشہور فرانسیسی ادیب آندرے ژید سے بھی ملاقات کی۔ لوئی آراگوں، رال فاکس اور پروفیسر بیر سارو سے بھی ملاقاتیں کیں اور اثرات قبول کیے۔ ہر چند کہ یہ سارے بڑے ادیب کلچر کے تحفظ کے لیے متفق تھے لیکن ان کا نظریہ حیات اور نظریہ ادب باہم مختلف بھی تھا۔ سجاد ظہیر ان سب سے ملاقات کر کے باطنی سطح پر ایک عجیب سی متضاد و متصادم دنیا سے دوچار ہوئے لیکن ان تمام تضادات و تصادمات میں ایک حوصلہ تھا جوش تھا اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ اور نظریہ۔ تاہم دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں کے خیالات و تصورات، ان کے علم و عمل نے سجاد ظہیر کی ذہنی و باطنی دنیا میں کھلبلی مچادی۔ مختلف نظریات و خیالات باہم ٹکرا رہے تھے کہ عین اسی کیفیت میں انہوں نے 'لندن کی ایک رات' جیسا ناول لکھا۔

'انگارے' کے افسانے اور 'لندن کی ایک رات' کی تخلیق کے درمیان آٹھ دس سال کا وقفہ سجاد ظہیر کی عملی اور فکری زندگی کا عجیب و غریب وقفہ ہے جہاں وہ ایک طرف 'انگارے' جیسے ہنگامہ خیز افسانے لکھ رہے ہیں جسے اُردو ادب و تنقید فکری و فنی اعتبار سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہی ہے۔ دوسری طرف 'لندن کی ایک رات' جیسا عمدہ اور کسا ہوا ناول لکھ رہے ہیں جس کے بارے میں خود سجاد ظہیر یہ کہتے ہیں:

'تعلیم ختم کرنے کے بعد چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر ایک مخصوص جذباتی

کشمکش سے متاثر ہو کر سوڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔ میں اس قسم کی کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں'

ان جملوں میں پوشیدہ سجاد ظہیر کی بیزاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے نیز اردو تنقید کی معصوم و متضاد کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت تو اپنی جگہ مسلم ہے کہ تغیرات، انقلابات اور عالمیت کی آگ اگلتی یہ کہانی جو حقیقت بن کر پوری دنیا کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھی افسانے اور ناول میں ہی مناسب و موثر انداز سے پیش کی جا سکتی تھی۔ سجاد ظہیر کے لیے ایسا فطری بھی تھا کہ وہ جو ذہن لے کر آئے تھے اور ابتدا جو ماحول گذار کر آئے تھے اس کے راستے فکشن کی طرف جاتے تھے یا فلسفے کی طرف۔ فکشن نے تو افسانے اور ناول کی راہ اختیار کی اور فلسفے نے فلسفۂ مارکسیت کی، جس کی بنیاد پر پوری ترقی پسند تحریک کھڑی ہوئی ہے اور جس کی تاریخ ساز ابتدا کا سہرا بھی سجاد ظہیر کے سر بندھتا ہے۔

لیے بہت دنوں تک امن سکون چین ختم ہو گیا ہے۔ بڑی سخت کشاکش، جدوجہد، بین الاقوامی جنگ، انقلاب کے دور کا آغاز ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ کیا آدمیت کبھی بھی اس سیلاب آتش و آہن سے نجات حاصل کر سکے گی؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ ہم نوجوان جن کی رگوں میں زندگی کا گرم خون گردش کر رہا تھا اپنے کو اس طوفان سے بچا سکیں گے؟'

۱۹۳۳ء میں فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ کی تحریک فرانس سے ہی شروع ہوئی۔ مشہور فرانسیسی ادیب ہنری باربس کی لگاتار کوششوں سے پیرس میں جولائی ۱۹۳۵ء میں ورلڈ کانگریس آف رائٹر فار دی ڈیفنس آف کلچر قرار پائی جس کے انعقاد میں مکسیم گورکی، رومین رولاں، آندرے مالرو، ٹامس مان جیسے شہرۂ آفاق ادیب تھے۔ اس کانفرنس میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے شرکت کی اور اس عہد کے مشہور فرانسیسی ادیب آندرے ژید سے بھی ملاقات کی۔ لوئی آراگوں، رال فاکس اور پروفیسر بیر سارو سے بھی ملاقاتیں کیں اور اثرات قبول کیے۔ ہر چند کہ یہ سارے بڑے ادیب کلچر کے تحفظ کے لیے متفق تھے لیکن ان کا نظریۂ حیات اور نظریۂ ادب باہم مختلف بھی تھا۔ سجاد ظہیر ان سب سے ملاقات کر کے باطنی سطح پر ایک عجیب سی متضاد و متصادم دنیا سے دوچار ہوئے لیکن ان تمام تضادات و تصادمات میں ایک حوصلہ تھا جوش تھا اور کچھ کر دکھانے کا جذبہ اور نظریہ۔ تاہم دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں کے خیالات و تصورات، ان کے علم و عمل نے سجاد ظہیر کی ذہنی و باطنی دنیا میں کھلبلی مچا دی۔ مختلف نظریات و خیالات باہم ٹکرا رہے تھے کہ عین اسی کیفیت میں انہوں نے 'لندن کی ایک رات' جیسا ناول لکھا۔

'انگارے' کے افسانے اور 'لندن کی ایک رات' کی تخلیق کے درمیان آٹھ دس سال کا وقفہ سجاد ظہیر کی عملی اور فکری زندگی کا عجیب و غریب وقفہ ہے جہاں وہ ایک طرف 'انگارے' جیسے ہنگامہ خیز افسانے لکھ رہے ہیں جسے اُردو ادب و تنقید فکری و فنی اعتبار سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہی ہے۔ دوسری طرف 'لندن کی ایک رات' جیسا عمدہ اور کسا ہوا ناول لکھ رہے ہیں جس کے بارے میں خود سجاد ظہیر یہ کہتے ہیں:

'تعلیم ختم کرنے کے بعد چلتے وقت پیرس میں بیٹھ کر ایک مخصوص جذباتی

کشمکش سے متاثر ہو کر سو ڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔ میں اس قسم کی کتاب اب نہیں لکھ سکتا اور نہ اس کا لکھنا ضروری سمجھتا ہوں'

ان جملوں میں پوشیدہ سجاد ظہیر کی بیزاری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے نیز اردو تنقید کی معصوم و متضاد کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت تو اپنی جگہ مسلم ہے کہ تغیرات، انقلابات اور عالمیت کی آگ اُگلتی یہ کہانی جو حقیقت بن کر پوری دنیا کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھی افسانے اور ناول میں ہی مناسب و موثر انداز سے پیش کی جا سکتی تھی۔ سجاد ظہیر کے لیے ایسا فطری بھی تھا کہ وہ جو ذہن لے کر آئے تھے اور ابتدا جو ماحول گذار کر آئے تھے اس کے راستے فکشن کی طرف جاتے تھے یا فلسفے کی طرف۔ فکشن نے تو افسانے اور ناول کی راہ اختیار کی اور فلسفے نے فلسفۂ مارکسیت کی، جس کی بنیاد پر پوری ترقی پسند تحریک کھڑی ہوئی ہے اور جس کی تاریخ ساز ابتدا کا سہرا بھی سجاد ظہیر کے سَر بندھتا ہے۔

ڈاکٹر سید جعفر احمد

سجاد ظہیر ـــــ ایک صدی کی آواز

سید سجاد ظہیر ۱۹۳۲ء میں ہندوستان کے ادبی افق پر ایک نوآموز افسانہ نگار کے طور پر طلوع ہوئے۔ 'انگارے' کے دوسرے افسانہ نگاروں کے ساتھ ان کے نام کا بھی خوب چرچا ہوا۔ 'انگارے' کے خلاف جو طوفان اٹھا اُس میں وہ بھی تنقید اور دشنام دونوں کا نشانہ بنے۔ اگر اُن کی ادبی اور تخلیقی صلاحیتیں اتنی ہی ہوتیں جن کا اظہار 'انگارے' میں شامل اُن کے پانچ افسانوں میں ہوا تھا تو کچھ بعید نہ تھا کہ اُن کا نام 'انگارے' کے اوپر اٹھنے والی گرد کے بیٹھ جانے کے بعد بھلا دیا گیا ہوتا اور ہمارے زمانے تک پہنچتے پہنچتے ان کا نام ادبی تحقیق کی کسی کتاب میں نظر آجانے والا کوئی غیر معروف سا نام بن چکا ہوتا۔ لیکن سجاد ظہیر کی ادبی صلاحیتیں اتنی محدود نہ تھیں۔ انہیں تو ہندوستان کے ادبی اور سیاسی منظرنامے پر ابھی اور بہت سے نقوش مرتسم کرنے تھے۔ 'انگارے' کی کچی پکی کہانیاں تو اُن کی صلاحیتوں کا محض ایک ابتدائی اور نوآموزانہ اظہار تھیں۔

سجاد ظہیر نے قرطاس وقلم کے ہمراہ پہلا قدم تو ادب کے میدان میں رکھا تھا مگر ان کے اگلے قدم انہیں صحافت اور سیاست کی گزرگاہوں میں بھی لے کر گئے اور ۱۹۷۳ء میں جب انہوں نے ۶۸ سال کی عمر میں الما آتے میں وفات پائی تو وہ اُس وقت تک برصغیر کی ادبی و سیاسی تاریخ میں اپنے لیے ایک اہم مقام حاصل کر چکے تھے اور یہاں کی تہذیبی فضا پر اپنے اَنمٹ نقوش مرتب کر چکے تھے۔

سجاد ظہیر نے اپنی پوری زندگی بنی نوع انسان کے روشن مستقبل اور ایک صحت مند معاشرے کے خواب دیکھنے اور اس خواب کی تعبیر تلاش کرنے میں گزاری۔ وہ زندگی کو انسان کی سب سے قیمتی متاع تصور کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ تحفظِ ذات اور فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما، انسان کا بنیادی حق ہے۔ اس حق کے بغیر نہ تو انسان کی زندگی خوشگوار بن سکتی ہے اور نہ ہی زمین پر انسان کا عرصۂ حیات کشادگی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ ان اسباب کا سدِ باب چاہتے تھے جو انسانی معاشرے میں کدورتوں، نفرتوں، عصبیتوں اور تقسیم در تقسیم کا زہر گھولتے ہیں اور انسان کو استحصال اور غلامی کے شکنجے میں کس دیتے ہیں۔ حب بشر اور آزادیٔ فکر و عمل، سجاد ظہیر کی زندگی بھر کی کاوشوں کا محور تھے۔ اس محور سے وہ کبھی نہ ہٹے۔

سجاد ظہیر نے جو ادب تخلیق کیا اُس میں اعلیٰ ادب کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے اور فنکارانہ کمزوریوں کے پہلو بھی دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ یہ موضوع ایسا ہے جس پر اظہار خیال کرنا ادب کے نقادوں ہی کو زیب دیتا ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ اسی طرح ان کی سیاست کے بارے میں بھی مختلف زاویوں سے بات کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایسا ہوتا بھی رہا ہے اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ وہ اشتراکیت کے علمبردار تھے اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے۔ اشتراکیت اور اشتراکیت پسندوں پر تنقید روزِ اوّل سے ہی ہوتی رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود اشتراکی عناصر بھی دل کھول کر ایک دوسرے پر تنقید کرتے چلے آئے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹیوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ دلچسپ بات سامنے آتی ہے کہ کسی ملک میں یا تو کمیونسٹ پارٹی ہوتی ہی نہیں یا اگر ہوتی ہے تو ایک نہیں ہوتی، کئی ہوتی ہیں اور یہ سب ایک دوسرے پر تنقید کرنے میں کسی رو رعایت کی قائل نہیں ہوتیں۔ تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے بھی اس زمانے میں ہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی، اور آج تک، بحث و تمحیص کا موضوع بنے رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد سجاد ظہیر پاکستان آ گئے اور یہاں کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں راولپنڈی سازش کیس سے رہائی کے بعد وہ واپس ہندوستان چلے گئے اور پھر وہاں کی کمیونسٹ تحریک سے وابستہ رہے۔ ان کی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ وابستگی ان کے مسلک حیات کا حصہ تھی۔ انہوں نے اپنے تئیں جو بہترین فیصلے اور اقدامات ہو سکتے تھے

انہیں کا اہتمام کیا مگر ضروری نہیں کہ بظاہر تمام تر سنجیدگی کے ساتھ کیے گئے فیصلے معروضی حالات کے بالکل درست ادراک کے بھی حامل رہے ہوں۔ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی سے بھی تقسیم کے بعد سیاسی غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی — اور ان کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، مگر پچھلے پچاس پچپن برسوں میں منظرِ عام پر آنے والی دستاویزات یا کسی بھی دوسرے ذریعے سے کم از کم یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ اس تحریک سے وابستہ نمایاں لوگوں میں سے کوئی بھی اپنے مسلک سے بددیانتی کا مرتکب ہوا ہو۔ جس انتہا پسندی کے نتیجے میں اشتراکی تحریک کو آزادی کے بعد اپنے امکانی حلیفوں سے دُور ہونا پڑا اور معاشرے اور ریاست کے جابرانہ عناصر کو اپنے ہاتھ ان کے گلوں تک پہنچانے میں سہولت ہوئی، وہ انتہا پسندی بھی حالات کے معروضی تجزیے کی کمی کا ہی نتیجہ تھی — جب ہر طرف آزادی کے غلغلے بلند ہو رہے ہوں، خوابیدہ چینی بیدار ہو رہے ہوں، مشرق بعید اور جنوب مشرقی ایشیا سے فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کے بحری بیڑے اپنے استعماری توپ و تفنگ چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کر رہے ہوں تو ایسے میں کون سا ایسا غلط تھا کہ ہمارے شوریدہ سر انقلابیوں نے بھی منزل کو بہت قریب دیکھ لیا مگر غلطیاں بڑی ہوں یا چھوٹی اپنا تاوان تو وصول کرتی ہی ہیں اور ان کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسا موضوع ہے جس پر مستقبل کا مورخ شاید زیادہ مناسب تجزیہ پیش کر سکے گا۔ سجاد ظہیر کے باب میں تو یہی کہا جا سکتا ہے — اور بہت تیقن کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر اشتراکیت کے فلسفے کو قبول کیا تھا۔ وہ آخر وقت تک اسی پر کاربند رہے اور اپنی طویل عملی زندگی میں انہوں نے مصلحتوں اور مصالحتوں کے راستے خود پر بند رکھے۔

سید سجاد ظہیر بیک وقت ادیب، شاعر، صحافی، ایک تنظیم کار، سیاسی کارکن اور رہنما تھے۔ انہوں نے اپنی تمام عملی کاوشوں کے لیے جو بھی میدان چنا اُس میں اپنے لیے ایک مقام بنایا۔ وہ عملی زندگی میں پہلے پہل ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ گو بعد کے زمانے میں وہ فکشن پر تو مزید توجہ نہیں دے سکے مگر ادب سے بحیثیت مجموعی اُن کا بڑا قریبی تعلق رہا۔ 'انگارے' میں اُن کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کا مرقع تو تھے ہی مگر ان میں معاشرے کی بیمار اور ژولیدہ قدروں سے بغاوت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ انہوں نے نازک اُمور کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا اور گو کہ ان کہانیوں میں فنکارانہ پختگی کا فقدان موجود تھا لیکن محض بیس پچیس برس کی عمر میں انہوں نے جس

تخلیقی توانائی کا مظاہرہ کیا تھا اُس سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر وہ فکشن کو زیادہ وقت دیتے تو اُن کے موئے قلم سے بہت بہتر افسانے نکل سکتے تھے۔

سجاد ظہیر کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک مظہر ان کا ناولٹ 'لندن کی ایک رات' بھی ہے جو اپنی ہی وضع کی ایک نادر چیز ہے۔ اس ناولٹ میں انہوں نے لندن میں زیر تعلیم چند ہندوستانی نوجوانوں کی بیٹھکوں کا احوال لکھا ہے جو اپنی گفتگو میں دنیا جہان کے مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں اور اپنے تئیں مشکل سے مشکل عقدوں کو حل کرتے ہیں۔ یہ ناول اپنی تکنیک اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے ایک اچھوتا تجربہ تھا اور کم از کم اس وقت تک اردو میں اس طرح کی کوئی قابلِ ذکر چیز یں سامنے نہیں آئی تھیں۔

شاعری کی طرف سجاد ظہیر بہت بعد میں آئے۔ کچھ جیل میں اپنی اسیری کے زمانے میں انہوں نے شاید زیادہ یکسوئی سے اس طرف توجہ دی ہو لیکن اُن کا پہلا اور واحد شعری مجموعہ 'پگھلا نیلم' کے نام سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ 'انگارے' ہو یا 'لندن کی ایک رات' یا پھر 'پگھلا نیلم' سجاد ظہیر کی ساری ہی تخلیقی کاوشیں بحثوں کا موجب بنیں۔ 'انگارے' پر ہماری نام نہاد اخلاقی قدروں سے انحراف اور عریانیت اور فحاشی کے الزام لگے، یہاں تک کہ اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی۔ 'لندن کی ایک رات' پر یہ بحث چل نکلی کہ یہ ناول ہے بھی یا نہیں۔ اسی طرح 'پگھلا نیلم' کی نظمیں نثری نظمیں ہونے کی بنا پر مباحثے کا موضوع قرار پائیں۔ خود ترقی پسندوں کو بھی اس ضمن میں یہ حیرت لاحق ہوئی کہ سجاد ظہیر نے شاعری شروع کی بھی تو نثری نظم کو ہی اپنا پیرایہ اظہار کیوں بنایا۔

سجاد ظہیر ہیئت کا یہ تجربہ شعوری طور پر کر رہے تھے اور اُن کا خیال یہ تھا کہ 'دراصل سوال یہ ہے کہ ایک فنکار اپنی تخلیق کے لیے اپنے خام مواد کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ جس قدر زیادہ یہ مواد اس مفہوم و مقصد کو ادا کرنے کے لیے صحیح اور مناسب طور پر استعمال ہوگا جو کہ فنکار کا مدعا ہے اُسی حد تک اُس کی تخلیق کامیاب ہوگی۔ اس خام مسالے کی بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں ہے۔'

سجاد ظہیر گھسے پٹے اور پامال راستوں کی جگہ نئے راستوں کی تلاش کے جویا تھے۔ چنانچہ اپنے خیالات کو شعری پیکر میں ڈھالتے وقت انہوں نے پرانے حصاروں کو توڑنا ضروری سمجھا۔ ایسا

کرتے وقت وہ اپنے تجربے کی اصابت سے زیادہ اپنا تجربہ کرنے کے حق کی پاسداری میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ 'میری عرض یہ ہے کہ میں نے جس قسم کی تخلیق کی کوشش کی ہے، جو اثر میں پیدا کرنا چاہتا ہوں، جس خاص کیفیت کا اظہار مجھے مقصود ہے اور جس شعری پیکر کی تخلیق میرا مدعا ہے وہ صرف اسی طرح سے ادا ہو سکتا ہے، دوسرے فنکار اس سے بدرجہا بہتر تخلیق کر چکے ہیں اور کریں گے لیکن یہ تخلیق ناچیز سہی، میری اپنی ہے۔'

سجاد ظہیر کی بہت اہم وجہ شہرت انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے اُن کی خدمات کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ انجمن کی تشکیل کا منصوبہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں مقیم چند ہندوستانی طالب علموں کے مشورے سے بنا تھا۔ ان نوجوانوں میں سجاد ظہیر کے علاوہ ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے ایس بٹ، ڈاکٹر ایس سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔ انجمن کو بناتے وقت ان نوجوانوں نے ایک مینی فسٹو بھی جاری کیا جس میں ہندوستان کی ادبی صورت حال کا ذکر بھی تھا اور اپنے عزائم کا اظہار بھی۔ بعد ازاں یہ مینی فسٹو ہندوستان پہنچا اور ادیبوں، شاعروں اور تخلیق کاروں میں اس کو بڑے پیمانے پر تقسیم کیا گیا اور اس پر اُن کے دستخط حاصل کیے گئے۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی گئی اور سجاد ظہیر جو ہندوستان واپس آچکے تھے، اس کے پہلے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ وہ اگلے دس بارہ برس اسی حیثیت میں انجمن کی توسیع اور تنظیم میں شب و روز مصروف رہے۔ اس عرصے میں ترقی پسند ادب کی تخلیق کا مشن دور دراز علاقوں تک پہنچا اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں لکھنے والے اہلِ قلم ایک دوسرے سے قریب آئے اور انہیں اس بات کا موقع ملا کہ زیادہ شعوری اور مربوط انداز میں اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو اپنے معاشرے اور اپنی سرزمین کے اُفتادگانِ خاک کے ساتھ ہم آہنگ کر سکیں۔

ترقی پسند تحریک کسی خلا میں شروع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کے پیچھے اسباب و محرکات کی کوئی کمی موجود تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں اور یہاں کی ادبی فضا میں ایک ایسی تحریک کے فروغ کے امکانات پوشیدہ تھے جو عوام کی محرومیوں اور ان کی زندگیوں کی سفاک حقیقتوں کو تخلیقی سطح پر اظہار کا موقع فراہم کرتی اور لوگوں کو انسانیت کے ایک ایسے رشتے میں پروتی چلی جاتی جس کے

وسیلے سے لوگوں میں ایک دوسرے کے لیے دردمندی و بھائی چارے کا جذبہ بیدار ہوتا۔ گو کہ لندن کے نوجوان ادیبوں نے اپنے مینی فسٹو میں کسی قدر یک طرفہ انداز میں یہ حکم لگا دیا تھا کہ 'ہندوستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہو گیا ہے۔ ہیئت میں بھی اور معنی میں بھی اور آج ہمارے ادب میں بھگتی اور ترک دنیا کی بھرمار ہو گئی ہے۔ جذبات کی نمائش عام ہے عقل و فکر کو یکسر نظر انداز بلکہ رد کر دیا گیا ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں بیشتر اسی طرح کے ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے جو ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے'۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نئی طرح کے ادب کا عزم لے کر اُٹھنے والے یہ روشن فکر نوجوان کم از کم اُس وقت اُس ادبی اور تہذیبی روایت کا اعتراف نہیں کر سکے جو انیسویں اور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں زمانہ سازی اور روشن خیالی کی امین بن کر پہلے ہی سامنے آ چکی تھی۔ جیسا کہ بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ اہلِ قلم نے تسلیم بھی کیا کہ ۱۹۳۶ء میں انجمن نے جس حقیقت افروز ادب کا پرچم بلند کیا تھا اُس کی اساس ہماری تہذیب میں موجود تھی اور انیسویں صدی میں غالب اور سرسید نے بہت کھل کر اُس فکری انقلاب کی بنیادیں رکھ دی تھیں جس کا پرچم بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں ترقی پسندوں کے ہاتھوں میں آنا تھا۔ سجاد ظہیر نے تو 'روشنائی' میں اپنے بارے میں یہاں تک لکھا کہ 'میں خود جب اپنی ذہنی اور ادبی تربیت کے متعلق اپنی طالب علمی کے زمانے کا خیال کرتا ہوں تو اردو کے شاعروں میں انیس، غالب، حالی اور اقبال کا اس میں سب سے زیادہ حصہ نظر آتا ہے'۔

انیسویں صدی میں غالب اور سرسید سے جس روشن خیالی کا احیا ہوا تھا بیسویں صدی میں اُس کا تسلسل اور ارتقاع پریم چند، حسرت موہانی، علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کی تخلیقات میں ہوا۔ پریم چند نے ہندوستان کے دیہی معاشرے کے دل دوز حقائق پر سے کچھ ایسے فنکارانہ انداز میں پردہ اٹھایا کہ بعض صورتوں میں تو اُن کی تخلیقات حرفِ آخر قرار پائیں ___ اُن کا افسانہ 'کفن' بہت سوں کے نزدیک اردو کا سب سے بڑا افسانہ ہے۔ حسرت موہانی نے جمہور کے جذبۂ بغاوت کو اپنی صحافت کی زبان فراہم کی اور غلامی کے طوق سے نفرت کا وہ جذبہ بیدار کیا جس نے اُن کی ہی نہیں بلکہ اگلی نسلوں کی بھی فکری آبیاری کی اور اُن کو جرأتِ انکار سے متصف کیا۔ اقبال نے استعمار

کی چیرہ دستیوں سے پردہ اٹھایا اور اہلِ ہند میں آزادی کی خو بیدار کی۔ جوش شاعرِ انقلاب بن کر اُبھرے اور انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غلامی کی حقارت آمیز ذلتوں سے گلوخلاصی کا اذنِ عام کیا۔ سو ترقی پسند تحریک کا آغاز جب ہوا تو اس کے پاس بنیادیں پہلے سے موجود تھیں اور ایک بڑی اور موثر ادبی وفکری تحریک اٹھانے کی سماجی وفکری اساس موجود تھی۔

یہی نہیں بلکہ ترقی پسند تحریک کو اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو ابتدا میں مستند ادیبوں کی جو پشت پناہی حاصل ہوئی وہ بھی اس امر کی توثیق کرتی ہے کہ سینئر لکھنے والوں کے لیے ترقی پسند ادبی تحریک ہوا کا ایک نیا جھونکا ضرور تھی مگر خود ترقی پسند ادب کوئی نئی چیز یا نئی خبر نہیں تھا۔ چنانچہ جب پریم چند، قاضی عبدالغفار، جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالحق جیسے ادیبوں تک انجمن کے قیام کی اطلاع پہنچی اور انجمن کے ذمے داروں نے ان سینئر ادیبوں سے تعاون کے لیے رابطے کیے تو اُن کو کسی بھی طرف سے مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور یوں انجمن کا کام آسان ہوتا گیا۔

ترقی پسند تحریک نے ہمارے ادب، ہمارے طرزِ فکر واحساس اور ہمارے سماجی احوال پر کیا اثرات ڈالے یہ ایک طویل موضوع ہے جس پر یہاں گفتگو ممکن نہیں لیکن مختصراً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ترقی پسند ادب اور تحریک نے ہمارے معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ کئی نسلیں ہیں جن کی ذہنی تربیت میں اس ادب نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں ظلم کے خلاف، سماجی عدم برابری کے خلاف، استحصال اور انسانی بے توقیری کے خلاف جو جذبات پائے جاتے ہیں ان کی تشکیل میں اس ادب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادبی تحریکوں کی کارگزاری اور ان کی اثر آفرینی کو ناپنے کا پیمانہ سیاسی تحریکوں اور سیاسی انجمنوں کی کاوشوں کو ناپنے کے پیمانے سے مختلف ہوتا ہے۔ سیاسی تنظیموں کی کامیابی اور ناکامی کا معیار تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اقتدار میں آسکیں یا نہیں یا انہوں نے حکومت سازی کی طرف کس قدر پیش قدمی کی۔ مگر فکری وادبی تحریکیں معاشرے میں اپنے افکار کے نفوذ اور نئی اقدار کی تخم ریزی کے پیمانے سے پرکھی جاتی ہیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک نے ہمارے معاشرے کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے مختلف زبانوں کے لکھنے والوں کے درمیان فکری رشتے

استوار کیے ہیں اور ترقی پسندی کے باب میں آج کوئی گفتگو کسی ایک زبان اور اس کی تخلیقات کے حوالے سے نہیں کی جا سکتی بلکہ مختلف زبانیں، مختلف علاقوں کے ادب اور ان کی تخلیقی سرگرمیاں باہم مل کر ہی آج کے ترقی پسند ادب کو متشخص کرتی ہیں۔

سجاد ظہیر کی مختلف جہات میں ایک اہم جہت ان کی صحافت کی بھی ہے۔ انہوں نے آکسفورڈ میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں بھارت کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ لیکن یہ کچھ ہی دنوں بعد یونیورسٹی کی انتظامیہ کی طرف سے بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں جب وہ ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے سہارن پور سے 'چنگاری' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ نکالنا شروع کیا۔ یہ رسالہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان تھا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ چھڑنے پر جب ہندوستان میں پکڑ دھکڑ کا دور دورہ ہوا تو 'چنگاری' بھی بند کر دیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب دوسری جنگ عظیم ایک نئے موڑ پر پہنچی اور سوویت یونین پر جرمنی نے حملہ کیا تو سوویت یونین اور دیگر اتحادی ممالک جرمنی کے خلاف یکجا ہو گئے اس کا براہ راست اثر ہندوستان پر یہ ہوا کہ ہندوستان میں انگریز حکومت کی طرف سے کمیونسٹوں پر عتاب کی پالیسی تبدیلی ہوئی اور یوں کمیونسٹ پارٹی کو نسبتاً بہتر ماحول میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی سال پارٹی کی جانب سے انگریزی میں 'پیپلز وار' اور اردو میں 'قومی جنگ' نکالے گئے جو ان دو زبانوں کے علاوہ ہندی، گجراتی اور مراٹھی میں بھی شائع ہوتے تھے۔ 'قومی جنگ' کسی سیاسی جماعت کے پروپیگنڈہ آرگن سے بہت مختلف رسالہ تھا۔ اس میں ملکی و غیر ملکی حالات حاضرہ پر سنجیدہ تبصرے شائع ہوتے تھے۔ ادبی اور تہذیبی اُمور پر مبسوط مضامین شائع کیے جاتے تھے اور اس کا پیرایۂ اظہار بہت سنجیدہ اور ادبی ہوتا تھا۔ دوسری جنگ کے خاتمے کے بعد 'قومی جنگ' کا نام تبدیل کر کے 'نیا زمانہ' رکھ دیا گیا۔ اس پرچے کا مزاج اور انداز بھی وہی تھا جو 'قومی جنگ' کا تھا۔ اس کے انداز صحافت اور طرز نگارش کا اعتراف ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے بھی کیا جنہوں نے 'نیا زمانہ' کے نام ایک خط میں اعتراف کیا کہ سیاسی اختلاف سے قطع نظر صحافت کے اعتبار سے 'نیا زمانہ' اردو کا سب سے اچھا ہفت روزہ ہے۔ اس ہفت روزہ کی اشاعت ایک زمانے میں دس ہزار تک پہنچ چکی تھی جو اس کی مقبولیت کا مظہر تھی۔ ۱۹۵۳ء میں 'نیا زمانہ' روزنامہ بن گیا اور سوبھن سنگھ اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ سجاد ظہیر کے پاکستان سے ہندوستان واپس جانے کے بعد

دسمبر ۱۹۵۹ء میں عوامی دور کے نام سے اُن کی ادارت میں ایک نیا ہفت روزہ نکلنا شروع ہوا۔ 'عوامی دور' جولائی ۱۹۶۳ء میں بند ہوا اور چند ہی ماہ بعد نومبر ۱۹۶۳ء میں ہفت روزہ 'حیات' نکالا گیا۔ اس کے ادارتی بورڈ میں بھی سجاد ظہیر سرفہرست تھے۔ وہ ۱۹۷۳ء میں اپنی وفات تک 'حیات' کی خدمت کرتے رہے۔

سجاد ظہیر نے مختلف جرائد سے اپنی وابستگی کے دوران سینکڑوں مضامین اور اداریے تحریر کیے جو منتشر شکل میں بکھرے پڑے ہیں اور ضرورت ہے کہ اُن کو مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ یہ محققین کے لیے دستیاب ہوں۔ سجاد ظہیر کے مضامین میں سے جن چالیس پچاس مضامین کو دیکھنے کا راقم السطور کو دیکھنے کا موقع ملا، وہ یہ باور کرانے کے لیے کافی ہیں کہ سجاد ظہیر خواہ ادبی اور تہذیبی اُمور پر لکھ رہے ہوں یا سیاسی و معاشی مسائل کا تجزیہ کرنے میں مصروف ہوں اُن کی تحریروں میں مطالعے کی گہرائی اور تجزیہ نگاری کی غیر معمولی اہلیت نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک سیاسی جماعت کے بہت ہی کمیٹڈ کارکن اور رہنما ہونے کے باوجود وہ اپنی ادبی تحریروں میں تو بڑی بات ہے، صحافتی تحریروں میں بھی نعرے بازی اور سطحیت نگاری کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کی ہر تحریر میں ایک وقار، متانت اور شادابی دیکھی جا سکتی ہے۔

سجاد ظہیر کی علمی و سیاسی زندگی کا ایک سادہ سا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنی جملہ توانائیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ تمام عمر ایک عظیم مقصد کے لیے سرگرداں رہے اور وہ مقصد اپنے ملک، اپنے معاشرے بلکہ ساری ہی دنیا کے انسانوں کے لیے ایک منصفانہ ماحول کے حصول کا مقصد تھا۔ وہ امن و آشتی انسانی تخلیقی صلاحیتوں کے ارتفاع اور ایک خوبصورت دنیا کے خواب کو تعبیر دینے کے لیے سرگرداں رہے۔ جب تک انسان کی یہ سرگردانی باقی رہے گی سجاد ظہیر کی یاد بھی زندہ رہے گی۔

دوسرا حصّہ

تفہیمِ معانی

عتیق احمد

'لندن کی ایک رات': موضوع اور مواد

افسانہ نویسی کے بعد سجاد ظہیر کی پہلی بڑی اور آخری افسانوی تحریر (fiction) میں 'لندن کی ایک رات' سجاد ظہیر کو مکمل اور بیک نظر یعنی compact انداز میں سمجھنے کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ ہے۔ موضوع اور فن کے اعتبار سے بھی یہ ان کی اہم تصنیف شمار ہوتی ہے۔

'لندن کی ایک رات' یوں تو پہلی بار ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی لیکن سجاد ظہیر نے اسے لکھنا کوئی ڈھائی تین برس پہلے شروع کیا تھا۔ مکمل ہونے کے بعد بھی وہ اسے اشاعت کے لیے دینے یا نہ دینے پر سوچتے رہے۔ انہوں نے خود اپنے ابتدایئے میں لکھا ہے: 'اس کا بیشتر حصہ لندن، پیرس اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا۔ آج اسے دو سال سے زیادہ ہو گئے۔ اب میں اس مسودے کو پڑھتا ہوں تو اسے چھاپتے ہوئے رکاوٹ ہوتی ہے'۔ اس رکاوٹ کا سبب 'لندن کی ایک رات' پس از وقت (out of date) یا نامناسب (irrelevant) ہو جانا انہیں اس لیے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صرف خیالات اور تحریر کے ذریعے اپنے افکار کی اشاعت کی منزل سے گزر کر مداوائے درد دل کے لیے عملی طور پر مزدور اور مظلوم عوام کی حمایت میں ان کی صفوں میں شامل ہو چکے تھے۔ چنانچہ اپنے ابتدایئے میں انہوں نے اپنی بدلی ہوئی مصروفیات کا بھی خود بھی ذکر کیا ہے۔ 'چند مخصوص جذباتی کشمکش سے متاثر ہو کر سو ڈیڑھ سو صفحے لکھ دینا اور بات ہے اور ہندوستان میں ڈھائی سال مزدوروں، کسانوں کی انقلابی تحریک میں شریک ہو کر کروڑوں

انسانوں کے ساتھ سانس لینا اور ان کے دل کی دھڑکن سننا دوسری چیز ہے۔

بنیادی طور پر تو یہ 'دوسری چیز' بھی ادبی شعور کو پختہ کرنے، ادب کی تخلیق کا محرک بننے میں اہم کردار ادا کرتی ہے یعنی خیالات، احساسات اور جذبات کا تجربات کی کسوٹی پر کھرا کھوٹا ثابت ہو جانے کے بعد ان کی ادبی پیشکش میں جو زاویہ نظر بنتا ہے وہ اس 'دوسری چیز' کے ذریعے بہت واضح شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن بہر حال ہر ادیب کے لیے یہ شرط نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی صفوں میں جا کر پہلے ریفریشر کورس کرے اور اس کے بعد قلم کو ہاتھ لگائے، لیکن اس سے بھی انکار محال ہے کہ جن ادیبوں کو ایسا کرنے کا موقع ملا، ان کی تخلیقات میں اثر آفرینی درجہ کمال کی رہی۔

اس گزارش کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ مذکورہ بالا 'ریفریشر کورس' کے بغیر حقیقت اور سچائی تک پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ خود 'لندن کی ایک رات' بھی سجاد ظہیر کی عملی سیاست میں آنے سے پہلے کی تخلیق ہے اور اس کی اثر آفرینی اپنے زمانے کے سیاق و سباق میں انگریز قوم، انگریز حکام، بیوروکریسی اور اس کے گماشتوں کے حوالے سے شعلہ جوالہ تو تھی ہی، آج کے یکسر بدلے ہوئے حالات میں بھی انگریز بیوروکریسی اور ان کے گماشتوں کی ذریات کے حوالے سے اپنی تاریخی اپروچ (approach) کی اثر آفرینی کے سبب ایک زندہ اور باقی رہنے والی کتاب ہے۔

یہ بحث بہت طویل ہے اور اس پر ہمارے بہت سے معتبر نقادانِ ادب نے پہلے بھی بہت کچھ لکھا ہے کہ صرف احساس اور جذبات کے ذریعے یعنی عوامی صفوں کی عملی سیاست میں عدم شرکت کے باوجود ان کے مسائل اور مصائب سے آگہی اور حقیقت پسندانہ نمائندگی کا حق کیسے ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس بحث کا نہ موقع ہے نہ ضرورت صرف ایک مختصر سی گزارش پر توجہ مبذول کرانی ہے اور وہ یہ کہ واقعاتی، سیاسی اور سماجی تاریخ پر گہری نظر رکھنے، اپنے عہد کو بھرپور طریقے سے پیش کرنے، اپنے ماضی کی سماجی روایات اور زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان میں تغیر و تبدل سے گہری واقفیت اور مستقبل کی تعمیر کے واضح خطوط ذہن میں رکھنے والے ادیبوں کے لیے اس کمی کو پورا کرنا، ناممکن نہیں ہے، جس کی طرف ابھی اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر ناول کا حوالہ ایک بار پھر دینا اس نکتے کی وضاحت کے لیے سیاق و سباق سے خارج نہیں۔ آیئے اب اسی ناول کی

طرف رجوع کرتے ہیں۔

'لندن کی ایک رات' پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے تقریباً سب ہی نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ اتنی قلیل ضخامت کے باوجود اس کا فکری اور جذباتی کینوس بڑی بڑی ضخامت کے ناولوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس ناول میں برتی گئی تکنیک یعنی شعور کی رو ہے جو کردار کے خیال اور تلازمہ خیال کی برق رفتاری اور پلک جھپکنے میں صدیوں پر محیط ماضی اور سامنے پھیلے ہوئے وسیع حال کو تمام کیف وکم کے ساتھ قاری کی نظروں کے سامنے لے آتی ہے۔

یہ ناول فنی اعتبار سے چونکہ ناول نگاری کے مروّج طور طریقوں یعنی واقعہ یا واقعات کی پیشکش میں کردار اور فضا نگاری، کرداروں کا ارتقائی سفر، قصے کا زینہ بزینہ ارتفاع اور پھر اینٹی کلائمکس سے گزر کر اختتام کو پہنچنے کی تکنیک کا پابند نہیں ہے اس لیے اس کی کوئی مربوط کہانی نہیں بلکہ مختلف خیال کرداروں کے سوچنے، باتیں کرنے اور منصوبے بنانے کے عمل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ خود سجاد ظہیر نے بھی اپنے ابتدائیے میں صراحت کردی ہے کہ 'یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا ایک رُخ اگر دیکھنا ہو تو اسے پڑھیے'۔ وہ اسے ناول یا افسانہ کہنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ یہ ان کی انکساری ہے۔

اس ناولٹ کا آغاز لندن میں زیرِ تعلیم ایسے ہی دو طالب علموں راؤ اور اعظم کی رسل اسکوائر کے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن پر ملاقات سے ہوتا ہے۔ اعظم یہاں اپنے دوست جین کا انتظار کررہا ہے جسے ساتھ لے کر اسے ایک دوسرے طالب علم نعیم الدین کے گھر پارٹی میں پہنچنا ہے۔ اسی دوران میں انڈر گراؤنڈ اسٹیشن سے راؤ نکلا تو وہاں نعیم کو کھڑا پایا۔ دونوں کی آپس کی گفتگو سے کھلا کہ راؤ بھی نعیم کے گھر دعوت پر مدعو ہے۔ راؤ اسے چلنے کو کہتا ہے لیکن اعظم کو جین کا شدت سے انتظار ہے۔ وہ اس خوف سے وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتا کہ جین اسے یہاں سے غائب پاکر ناراض نہ ہوجائے بہرحال راؤ اسے سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرلیتا ہے۔ چونکہ سردی زیادہ تھی اس لیے راؤ مشورہ دیتا ہے کہ راستے میں کسی پب سے ایک ایک گلاس بیئر پی لیں۔ چنانچہ وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے پہنچے اور اندر داخل ہوگئے۔ پب میں اس وقت خاصا ہجوم تھا۔ بڑی تعداد میں مزدور اور دوسرے لوگ بھرے ہوئے تھے۔ یہیں ایک مزدور شراب کے نشے میں جھومتا

ہوا آتا ہے اور اعظم، راؤ کو دیکھ کر بڑی نفرت سے 'بیلو ابلیکی' کہتا ہے۔ اس پر تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ بڑی مشکل سے یہ جھگڑا نمٹتا ہے اس لیے کہ دونوں طرف شراب اپنا رنگ جما چکی تھی۔

دوسری طرف نعیم الدین اپنے گھر میں حسبِ معمول آرام کرسی پر لیٹا ہوا مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ سب سے پہلے آنے والی مہمان شیلا گرین ہے۔ اس کے بعد دوسرے ہندوستانی طالب علم عارف، احسان، راؤ، اعظم، کریم، خان اور سنگھ ایک ایک کر کے آتے ہیں۔ ان ہی مہمانوں میں شیلا گرین کے علاوہ جین اور ایک لڑکی (اس کا نام نہیں دیا) مقامی یعنی انگریز نسل کی شامل ہیں جو ان ہندوستانی طالب علموں کی دوست ہیں۔ نعیم کے گھر یہ پارٹی رات دو بجے تک ابھی جاری ہی تھی کہ یکا یک لینڈ لیڈی دروازے پر آ کر نعیم کو ایک ضروری کام سے بات سننے کے لیے بلاتی ہے۔ نعیم واپس آ کر اعلان کرتا ہے کہ لینڈ لیڈی نے وارننگ دی ہے کہ اگر اس ہی طرح سے رات بھر شور وغل رہا تو صبح نعیم کو یہ مکان خالی کرنا پڑے گا۔ سب لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ انھیں اب چل دینا چاہیے۔ چنانچہ سب لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگتے ہیں۔ جب شیلا جانے لگتی ہے تو نعیم کہتا ہے کہ کیا تم بھی جا رہی ہو؟ اگر کچھ دیر اور رُک جاتیں تو اچھا ہوتا۔ شیلا 'بہت اچھا' کہہ کر کھڑکی کے پاس جا کر اکیلی کھڑی ہو جاتی ہے اور نعیم اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نعیم کے سب مہمان رخصت ہو گئے اور صرف وہ اور شیلا رہ گئے۔

یہ ناول کا واقعاتی خلاصہ ہے۔ آپ نے محسوس کیا کہ صرف دوستوں کی ایک پارٹی ناول کا موضوع نہیں بن سکتی جب تک اس پارٹی کے دوران کوئی واقعہ یا حادثہ رونما نہ ہو جو ناول کے پورے اسٹرکچر کی تعمیر میں کوئی ایسا مثبت یا منفی کردار ادا نہ کرے کہ پورے ناول کی شناخت بن جائے یا کسی کردار کے مستقبل کو یکسر نئی ڈگر پر نہ ڈال دے وغیرہ وغیرہ۔ شام سے صبح دو بجے تک جاری رہنے والی پارٹی میں کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ نعیم اصرار کر کے شیلا گرین کو روک لیتا ہے تو قاری کے ذہن میں از خود آتا ہے کہ اب کم از کم ایک (ہندوستانی طالب علم) کردار کے ساتھ تو کوئی ایسی بات ضرور ہوگی کہ ناول میں پارٹی ہی اس کردار کا مستقبل بدلنے کا وسیلہ بن جائے گی۔ مثلاً نعیم اور شیلا کے درمیان عشق اور عاشقی کا دور شروع ہو جائے یا وہ یہیں ایک دوسرے کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھنے کا فیصلہ کر لیں وغیرہ وغیرہ لیکن قاری کی

تمام توقعات پر اوس پڑ جاتی ہے جب باقی کی رات شیلا اپنے ناکام عشق کی داستان نعیم کو سنا کر گزار دیتی ہے کہ کس طرح اس کی ملاقات ایک بنگالی نژاد میڈیکل کے طالب علم ہیرن پال سے سیر وتفریح کے دوران میں ہو جاتی ہے۔ دونوں کچھ عرصے ساتھ اس مقام پر ایک ہی ہوٹل میں رہتے ہیں اور روز روز کی ملاقات کس طرح عشق میں بدل جاتی ہے۔ پھر ہیرن پال اپنی تعلیم مکمل کر کے گھر واپس چلا جاتا ہے۔ خاصے عرصے تک ان دونوں کے درمیان پابندی سے خط وکتابت ہوتی رہتی ہے مگر گزشتہ چھ ماہ سے نہ شیلا کے کسی خط کا جواب آیا ہے اور نہ کسی اور ذریعے سے اسے ہیرن پال کی خیریت معلوم ہوئی ہے۔ شیلا بے حد پریشان ہے اور اسے خدشہ ہے کہ ہیرن کہیں اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے کہیں قید میں نہ ڈال دیا گیا ہو۔ نعیم شیلا کو تسلی دلاتا ہے کہ اگر ہیرن واقعی گرفتار نہیں ہوا ہے اور محض کسی اور وجہ سے خط نہ لکھ سکا ہو تو عنقریب اس کا خط ضرور آئے گا۔ پھر اچانک شیلا نعیم کو مخاطب کر کے کہتی ہے:

'اُفوہ صبح ہو گئی۔ معاف کرنا میں اتنی دیر بیٹھی، باتیں کیا کیں۔ لیکن نعیم میں مجبور تھی۔ تم سمجھتے ہو نا؟ اچھا اب میں جاتی ہوں'۔

اتنا کہہ کر شیلا نے اپنا کوٹ اور ٹوپی جلدی سے پہنا اور نعیم سے ہاتھ ملا کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ نعیم بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

'کیا پھر کبھی ہم ملیں گے' نعیم نے پوچھا۔

'معلوم نہیں۔ خدا حافظ نعیم'۔ یہ کہہ کر لڑکی آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

اور ناول بھی اسی کے ساتھ اختتام کو پہنچتا ہے۔ نعیم پھر اپنے کمرے میں آ کر حسب عادت تنہا اپنی آرام کرسی پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ ناول صرف ان طالب علموں کی اپنی سوچ اور پارٹی میں باتوں کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور ان ہی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

سجاد ظہیر نے یہ لکھتے ہوئے کیا واقعتاً یہ مبالغہ نہیں کیا ہے 'اس کتاب کو ناول یا افسانہ کہنا مشکل ہے۔ یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا ایک رُخ دیکھنا ہو تو اس کتاب کو پڑھیے'۔ ناول تو اسے بہرحال تسلیم کر لیا گیا ہے اور ہے بھی یہ ناول ہی (جدید تکنیک یعنی شعور کی رَو یا آزاد

تلازمہ خیال کا ناول) لیکن موضوعاتی اعتبار سے یہ صرف لندن میں زیرِ تعلیم ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا ایک رُخ ہے یعنی یہ کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے دور اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے یا اس سے بھی بہت سوں کی طرح اغماز برتتے ہوئے، کس طرح ایک دوسرے سے ملنے ملانے، بحث مباحثہ کرنے، سیر و تفریح اور وقتی طور پر چھوٹا موٹا عارضی عشق (صرف دل بہلانے کے لیے) کرنے میں اپنا وقت گزار دیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے طالب علم اپنے والدین کی بھیجی ہوئی ماہانہ رقم پڑھائی کی جگہ تفریح میں اُڑا دیتے ہیں اور برسوں رہ کر بھی مطلوبہ تعلیمی کورس پورا نہیں کر پاتے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو سیر و تفریح کے ساتھ اپنا تعلیمی مقصد حاصل کرنے کے لیے بھی محنت کرتے ہیں اور معینہ مدت میں تعلیم حاصل کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ ایسے طالب علموں کی اکثریت بھی ہندوستان کے ایسے بڑے گھرانوں کے فرد کی ہوتی ہے جو آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے کے امتحانات یا انجینئرنگ اور ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے آتے ہیں۔ جن کے دماغوں میں واپس جا کر اپنے ہی ابنائے وطن پر حکومت کر کے غیر ملکی حکومت کی مشینری کا کل پُرزہ بن جانے کی دُھن سمائی ہوتی ہے۔ (مثلاً عارف جو آئی۔ سی۔ ایس بننے آیا ہوا ہے) یہ پورا ناول ان ہی طالب علموں کے زندگی گزارنے کے مختلف طور طریقوں، ان کی بات چیت اور ان کے سوچنے کے انداز پر مشتمل ہے۔

نعیم کو ایک طرح سے اس ناول میں مرکزی کردار کی حیثیت یوں مل جاتی ہے کہ پورا ناول (صرف ابتدائی دو باب چھوڑ کر) اس پارٹی کے حال و اقوال کی روئیداد ہے جو نعیم نے اپنے دوستوں سے ملاقات اور گپ شپ کی خاطر ترتیب دی تھی۔ تیسرے باب سے نعیم اس ناول میں آتا ہے اور ساتویں باب کے آخری صفحات تک میزبان کے طور پر وہ خاصا نمایاں رہتا ہے اور آخری سطور میں جب سارے مہمان دوست ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں وہ اسی طرح تنہا اپنی کرسی پر بیٹھا سوچتا رہ جاتا ہے جس طرح سے اس کا تعارف تیسرے باب میں ہم سے کرایا جاتا ہے۔ سجاد ظہیر کے الفاظ میں دو چار سطریں نعیم الدین کے بارے میں آپ بھی پڑھ لیں۔

"نعیم ان طالب علموں کے زمرے میں تھا جو ہندوستان سے دو یا تین برسوں کی تعلیم کے لیے انگلستان جاتے ہیں اور وہاں جا کر پانچ چھ برس

تک رُکتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنے والدین کو خواہ مخواہ ستانا چاہتے ہیں اوران پر انگلستان میں معینہ میعاد سے زیادہ کا بارڈالنا چاہتے ہیں......
بلکہ وہی لوگ جو شروع میں اپنی ذہنی اور جسمانی تیزی کا ثبوت دیتے ہیں سال چھ مہینے وہاں رہنے کے بعد رفتہ رفتہ سست ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ انگلستان میں جیسے چپک سے جاتے ہیں'۔ (ص ۲۷) نعیم الدین بھی ایسے ہی کئی برسوں سے چپکے ہوئے تھے۔

اب ذرا نعیم الدین کی مرکزی حیثیت کے متعلق بھی دو چار باتیں سن لیجیے تا کہ ان کی مقبولیت کے اصل اسباب بھی سامنے رہیں۔

'نعیم سے سب کو محبت سی تھی۔ ہمیشہ ہر شخص کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے...... کسی کے پاس روپیوں کی کمی ہوئی وہ نعیم کے گھر قرض مانگنے آ پہنچا۔ کسی کو مفت دعوت کھانی ہوتو وہ نعیم کے یہاں آ کر کھانے کے وقت آ کر ڈٹ جاتا۔ کسی کے پاس تازہ ترین پڑھنے کے لیے ناول نہ ہوئے تو وہ نعیم کی کتابیں بے تکلفی سے اٹھالے جاتا۔ کسی کو میٹنگ کرنی ہوتی وہ نعیم کے یہاں پہنچ کر اس سے لفافوں پر پتہ لکھواتا۔ کسی کی معشوقہ اگر اسے داغ فراق دے جاتی تو وہ دلجوئی کے لیے نعیم کے یہاں آتا'۔ (ص ۲۸)

'نعیم الدین کا کمرہ ان کے دوستوں کے لیے اور جان پہچان والے لوگوں کے لیے کلب کا بھی کام دیتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن چھ سات آدمی ضرور وہاں پہنچ جاتے اور پھر گفتگو کا سلسلہ چھڑ جاتا جو رات کے بارہ ایک بجے تک جاری رہتا'۔ (ص ۲۹)

آپ نے دیکھ لیا کہ نعیم الدین صاحب کی مقبولیت کے اسباب کیا تھے۔ خود یہ حضرت انتہائی کاہل ہیں۔ چھ سات سال سے نکمے ہونے کے باوجود بھی اپنے تھیسس پر شاید ابھی ابتدائی کام بھی نہیں کیا ہے لیکن کئی برس سے ہر بار یہ پوچھنے پر کہ نعیم تمہارے تھیسس کا کیا حال ہے؟ بس ایک ہی جواب دیتے کہ پانچواں باب شروع کرنے والا ہوں۔ پھر ایک اور لکھنا ہوگا۔ بس کام ختم۔ کاہلی

میں دن رات آرام کرسی پر بیٹھے پائپ پیتے رہتے ہیں اس لیے موٹے بھی ہو گئے ہیں اور اب صرف ایک غم ہے کہ موٹے ہونے کی وجہ سے کوئی لڑکی انہیں لفٹ نہیں دیتی۔ حالانکہ وہ اپنے دور کے ذہین طالب علموں میں رہے ہیں۔ اب بھی ان کی ذہانت میں کمی نہیں آئی۔ شکل وصورت بھی بہت سے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں اچھی ہے۔ مگر صرف ان کے موٹے ہونے اور توند نکل آنے کی وجہ سے نہ کوئی لڑکی انہیں نہ کسی ڈانس پارٹی میں اپنا ساتھی بناتی ہے نہ ویسے توجہ دیتی ہے۔ سیاست سے انہیں کوئی دلچسپی ہے نہیں، بس اپنی ذات ہی ان کی ساری سوچ اور خود کلامی کا مرکز ہے اور غم صرف یہی کہ کوئی لڑکی ان پر عاشق کیوں نہیں ہوتی؟

ایک اور طالب علم اعظم ہیں۔ یہ ان طالب علموں کی نمائندگی کرتے ہیں جو شاعرانہ مزاج لے کر لندن میں قدم رکھتے ہیں اور نہایت ثابت قدمی کے ساتھ آخر تک جمے رہتے ہیں۔ وہ ایک نئی دنیا میں پہنچ جانے کے باوجود یہاں کے رسم و رواج، رہن سہن اور لوگوں کی آزاد فطرت کے برخلاف عشق کے روایتی تصور یا زیادہ بہتر یہ کہنا ہوگا کہ عشق کے شاعرانہ تصور کو سینے میں بسائے رہتے ہیں۔ وہ انگریز لڑکیوں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہندوستانی لڑکی کی طرح بس ایک دفعہ انہیں دیکھ کر جی جان سے فدا ہو جائے اور ان کی خاطر ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرے، گھر میں اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ جائے وغیرہ وغیرہ لیکن یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ 'تو نہ سہی اور سہی اور سہی' نتیجتاً یہ بار بار عشق میں زک اٹھاتے ہیں۔ اپنے روایتی تصورات کی بنا پر نئے ماحول میں ہمہ وقت احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ چنانچہ غم غلط کرنے کے لیے پھر کوئی یکطرفہ عشق شروع کر دیتے ہیں۔

ان ہی کی کاربن کاپی ہندوستانی طالبہ کریمہ صاحبہ ہیں جو انتہائی فرسودہ ماحول سے نکل کر صرف اپنی ضد اور سرکاری طور پر تعلیمی قابلیت کی بنا پر وظیفہ پا جانے کے سبب والدین سے باغی ہو کر لندن تعلیم حاصل کرنے آئی ہیں، مگر حال یہ ہے کہ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ یہاں کی آزاد منش اور دل پھینک لڑکیوں کو دیکھ کر غم و غصے کے سبب جلنے اور کھولتے رہنے میں بسر ہوتا ہے۔ فی الحقیقت ان کے دل میں یہ احساسِ کمتری ہے کہ سارے ہندوستانی طالب علموں میں سے کوئی ایک بھی ان پر نگاہِ غلط انداز تک نہیں ڈالتا اور سب ہی ان 'آوارہ و بدکردار' لڑکیوں کے پیچھے مارے

مارے پھرتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کی چمڑی گوری ہے۔

ایک اور نک چڑھے صاحب بہادر ٹائپ عارف صاحب ہیں جو ہندوستان میں آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں ناکامیاب ہوکر اب لندن کے کونے سے یہ امتحان پاس کرنے آئے ہیں۔ ان کے والدین کے دماغ میں خود یہ خناس ہے کہ ان کا بیٹا صرف اور صرف آئی۔سی۔ایس بننے کے لیے اس دنیا میں اللہ میاں نے بھیجا ہے۔ یہی خناس اب عارف صاحب کے دماغ میں بھی سمایا ہوا ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے ابھی سے اپنے آپ کو کہیں کا ڈپٹی کمشنر یا کمشنر بنائے ہوئے ہیں۔ دوستوں تک سے ملنا اور باتیں اول تو ہوتی ہی نہیں اگر ہوتی ہیں تو بالکل ٹھیک آئی۔سی۔ایس کے انداز میں۔ ان کا لباس، ان کی باتوں کا انداز، ان کی چال تک پر آئی سی ایس ہونے کا ٹھپہ لگا ہوا ہے اور اصلیت یہ ہے کہ ان کی اس اسنوبری کی وجہ سے نہ کوئی دوسرا طالب علم اور نہ کوئی لڑکی گھاس ڈالتی ہے۔ سب ان سے عجیب طنزیہ اور تمسخرانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔

راؤ اور احسان دونوں مذکورہ بالا طالب علموں سے مختلف ہیں۔ دونوں مسلسل ہندوستان کی غلامی اور اقتصادی بدحالی، شدید غربت، تعلیم کی کمی اور اوپر سے ان سے کام لینے والے سیٹھ ساہوکاروں اور جاگیرداروں کی ظلم اور زیادتی یہ سب باتیں انہیں مستقل طور پر بے چین رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کے رویے میں ایک تلخی اور جھلاہٹ مسلسل حاوی رہتی ہے۔ ایک طرف وہ اپنے ملک کی حالت پر بے چین ہیں اور دوسری طرف وہ ان طالب علموں کو دیکھتے ہیں جو اگر سنجیدگی سے اپنی تعلیم مکمل کرلیں اور اپنے اندر بھی ملک کی فلاح اور بہبود کا جذبہ پیدا کر کے واپس جائیں تو بدقسمت لوگوں کے حالات اور تقدیریں بدلنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ شراب اور عورت ان کی زندگیوں سے بھی خارج نہیں، لیکن صرف تفریحاً اور وقت گزارنے کے مشغلے کے طور پر ورنہ وہ پوری تندہی اور محنت سے اپنی تعلیمی میعاد پوری کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ وہ لندن کے ایسے لوگوں سے بھی ملتے جلتے رہتے ہیں جن کی سوچ انقلابی بھی ہو اور ہندوستان پر برطانوی حکمرانی کو خود انگریز ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ سمجھتے ہیں اور اس عزم کے ساتھ زندہ ہیں کہ بہر حال ہندوستان کی پیشانی سے کالک دھلنی چاہیے۔ جس میں ان کا بھی اپنا کردار اور حصہ ہوگا۔

نعیم الدین کے یہاں پارٹی میں تین انگریز لڑکیاں بھی ہیں۔ ایک شیلا گرین ہے جو عرصے سے ہیرن پال کے عشق میں مبتلا ہے اور اس کے جانے کے بعد بھی اس کی یادیں سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اس کا حال پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔

دوسری لڑکی جین ہے جسے اعظم صاحب اپنا دل دے بیٹھے ہیں۔ مگر یہ عشق یک طرفہ ہے صرف اعظم کی طرف سے۔ جین ایک چلتی پرزہ لڑکی ہے جو بار بار اعظم سے ملنے کا وعدہ کرتی ہے اور ہر بار اسے غچا دے جاتی ہے۔ مگر یہ پھر بھی اس کے عشق لازوال میں زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں۔ ذرا اعظم کی خود کلامی پر کان دھریئے۔

'کمبخت آج پھر وعدہ کر کے معلوم ہوتا ہے نہیں آئے گی، یہ پہلی بار نہیں ہے۔ مجھے خود اپنی حالت پر شرم آتی ہے۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ذرہ برابر بھی میرا خیال نہیں کرتی۔ مگر میں ہوں کہ اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ آخر لندن میں بہت سی لڑکیاں ہیں اور میں ایسا بدصورت بھی نہیں مگر میں اس قدر کمزور ہوں۔ مجھے اپنے اوپر ذرہ برابر بھی قابو نہیں۔ کتنی دفعہ ارادہ کر چکا ہوں کہ اس سے ملنا چھوڑ دوں۔ اس سے بات نہ کروں۔ سڑک پر ملے تو دوسری طرف منہ پھیر لوں اور اگر میرے پاس اپنی مرضی سے آئے تو صاف صاف کہہ دوں چلی جا میرے پاس سے۔ اگر مجھ سے تجھے محبت نہیں ہے تو کیوں میرے پاس آتی ہے۔ اور عاشق ڈھونڈ۔ تیرے بہت سے طلبگار ہیں۔ میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں......' (ص۔۲)

آپ نے دیکھ لیا کہ کس طرح ایک بے عمل اور محض تصور پرست طالب علم کس حد تک اپنا قیمتی وقت محض ایک ایسی لڑکی کی خاطر ضائع کر رہا ہے جو اسے مسلسل نظرانداز کر رہی ہے۔ لیکن وہ صرف یکطرفہ طور سے اس کے گلے کا جھاڑ بنا ہوا ہے۔ یہ بے عملی اور اپنے خیالات اور تصورات سے الجھے رہنے کی خو بہرحال نعیم کے مقابلے میں بہت گھٹیا اور احساس خودی کا اپنے ہاتھوں خود گلا گھونٹنے والی لایعنی اور بے مصرف وارفتگی ہے۔ نعیم بھی بے عمل ہے۔ تصورات کی دنیا میں رہتا ہے، لیکن وہ اس حد تک گرا ہوا کردار نہیں ہے جس طرح کا ہمیں اعظم کے روپ میں ملتا ہے۔ مناسب ہو کہ

ایک خودکلامی ہم یہاں نعیم کی بھی دیکھ ڈالیں۔ تا کہ ذہنی سطح کا ایک فرق سامنے رہے۔ اس خودکلامی کا موقع یہ ہے کہ نعیم کے یہاں پارٹی پر مدعو دوستوں اور ان کی دوست انگریز لڑکیوں میں سب سے پہلے پہنچنے والی شیلا گرین ہے، چنانچہ اس لڑکی کو دیکھ کر نعیم کے خیالات کی رَو بہہ نکلتی ہے۔

'آخر یہ کون ہے، کیا کرتی ہے۔ راؤ اسے کہاں ملا ہوگا، خوبصورت لڑکی ہے۔ خوبصورت۔ لیکن میں...... مجھے کوئی خوبصورت کہہ سکتا ہے؟ مجھ پر کوئی لڑکی عاشق نہیں ہوئی۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے؟ میں موٹا بہت ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان میری توند حائل ہے۔ معلوم نہیں یہ لڑکی مجھے کیا سمجھتی ہے۔ توند سے کیا ہوتا ہے۔ اکثر دنیا کے بڑے بڑے...... انسانوں کی توندیں تھیں، لیکن اگر توند نہیں تو کونسی چیز؟ شاید مجھے عورت سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ اب یہ لڑکی اتنی دیر سے یہاں ہے اور مجھ سے ایک بھی ٹھکانے کی بات نہیں کی جاتی۔ اپنے دل میں خیال کرتی ہوگی کہ کتنا غیر دلچسپ گھامڑ آدمی ہے، لیکن میں نے دیکھا ایسے لوگ جن سے دو لفظ بھی ٹھکانے کے نہیں بولے جاتے عشق میں کامیاب ہیں۔ پھر آخر مجھ میں کونسی کمی ہے۔ میرے دوست خیال کرتے ہیں کہ مجھے ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں۔ اچھی صورت دیکھ کر مجھ پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ غلط "مرا در دیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد" دوسرا مصرعہ اس وقت یاد نہیں آتا۔ کیا یہ سچ ہے کہ میرا حافظہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جارہا ہے۔ میں یہاں برسوں سے اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ میں کند ذہن تو نہیں ہوگیا۔ اسکول میں جو ایک لڑکا میرے ساتھ بیٹھتا تھا اس کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں تھی اور حساب میں وہ بیچارہ ہمیشہ فیل ہو جاتا تھا۔ میں تو کبھی اس اسکول اور کالج کے امتحانوں میں فیل نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ شان کے ساتھ پاس ہوتا تھا۔ میں کند ذہن؟ کون کہتا ہے۔ میؔر اور غالبؔ کے جتنے شعر مجھے یاد ہیں شاید ہی کسی کو یاد ہوں۔ مجھ سے کوئی بیت بازی کرے۔

دیکھیں کون بازی جیتتا ہے۔ کیا اس وقت ایک حرف بھی مجھ سے نہ بولا
جائے گا۔ اتنی دیر سے یہ بیچاری بیٹھی ہوئی ہے اور میں نے اس سے ایک
بات بھی نہیں کی'۔ (ص ۳۳،۳۴)

اس طرح نعیم کی' شعوری رَو' نعیم کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔ ہم بہ یک وقت اس کے ماضی سے بھی واقف ہو جاتے ہیں اور اس کی نفسیاتی کیفیت بھی پورے طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

نعیم، راؤ، اعظم اور عارف جہاں اپنی اپنی جگہ ایسے نوجوان ہیں جو کبھی اپنی ذات اور اپنے مفادات کی حدود سے آگے نہیں بڑھتے۔ پھر بھی راؤ اور اعظم کبھی کبھی اشتراکیت پسند نوجوانوں کی انقلابی سرگرمیوں اور سوچ کے حوالے سے ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر دو چار منٹ طنزیہ گفتگو کر لیتے ہیں۔ ایک موقعے پر راؤ، اعظم سے ان نوجوان انقلابیوں کے بارے میں کہتا ہے۔

'...... وطن کی بھلائی میں کوشاں ہیں، ذرا مجھے بتایئے تو سہی کسی کو یہ تک
معلوم نہیں کہ بھلائی ہے کس چڑیا کا نام، اس کے لیے کوشاں ہونا تو
درکنار۔ زنانہ بن کر چرخہ کاتنے میں بھلائی ہے؟ یا مہاتما گاندھی کی طرح
سچ کی کھوج لگانے میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا کونسل کی ممبری اور منسٹری میں
وطن کی بھلائی ہے؟ یا سوشل ریفارم اور اچھوت کانفرنس میں حصہ لینے
میں بھلائی ہے؟' (ص ۳۶)

گویا سجاد ظہیر یہاں ان طالب علموں کے مختلف اور متضاد خیالات اور رجحانات کو ان کی بات چیت، خود کلامی اور ان کے شعور کی رَو کے ذریعے ہم تک پہنچا رہے ہیں۔ ان میں سے ہر کردار کے ساتھ کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی عشق کی کہانی وابستہ ہے۔ اس کہانی کی لندن کی آزاد فضاؤں اور آزاد فحشی کے مظاہروں میں کوئی حیثیت، کوئی وقعت اور اہمیت نہیں ہے۔ یہاں چلتے پھرتے، فٹ پاتھوں پر، گلیوں میں، کلبوں میں اس قسم کے مناظر عام ہیں۔ لیکن لندن میں نووارد طالب علموں کی نفسیات پر اس کا گہرا اثر ہے۔ ایسے ہی یکطرفہ معاشقوں میں جب ان میں سے کسی کو اس کی محبوبہ ملاقات کا وقت دے کر پورے پورے دن انتظار کراتی ہے اور پھر بھی نہیں آتی تو یہ چڑ چڑا جاتے

ہیں اور اس ہی چڑچڑاہٹ کے زیر اثر وہ انگریزوں و ہندوستانیوں کے بارے میں ایسی طنزیہ انداز کی بات چیت کر کے اپنے دل کا غبار نکالتے ہیں جیسی کہ راؤ کی ایک گفتگو کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔

راؤ اگرچہ اشتراکیت کی طرف مائل ہے۔ اسے یہ خیالات اچھے تو لگتے ہیں، لیکن ابھی تک اس کے دل و دماغ پر تشکیک کا غلبہ ہے۔ وہ اپنے طور پر ہندوستان کے سیاسی مسائل کے بارے میں بھی سوچتا رہتا ہے اور زندگی کے مسائل پر بھی۔ نعیم کے یہاں پارٹی میں جب راؤ شیلا کے ساتھ ناچ کر نعیم کے پاس جا کر کھڑا ہوتا ہے تو نعیم اسے بتاتا ہے کہ وہ شیلا گرین سے مل کر بہت خوش ہوا ہے۔ ہم زندگی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ مس گرین کے خیالات زندگی کے بارے میں نہایت دلچسپ ہیں اور قابل غور ہیں۔ راؤ قہقہہ مار کر ہنسا۔

> 'زندگی اور اس پر بحث! اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہو سکتی ہے۔ انسان اپنے کو کس قدر عظیم الشان ہستی خیال کرتا ہے، لیکن نظامِ کائنات میں ہمارا کیا درجہ ہے؟ زمین پر رینگنے والے کیڑوں میں ذلیل ترین کیڑے اور ہم زندگی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کائنات کا مرکز ہیں۔ یہ کتنی مضحک بات ہے'۔ (ص ۶۰)

ظاہر ہے کہ یہاں راؤ کی ان باتوں میں مستقبل سے مایوسی کا اظہار ہو پڑتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ابھی پہلی جنگِ عظیم کے جھٹکے سے عالمی معیشت پورے طور پر بحال نہیں ہو پائی تھی۔ بیکاری کا بھوت ابھی تک اس دور کے طالب علموں کو خوفزدہ کیے ہوئے تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اتنا پڑھ لکھ کر بھی جب وہ واپس اپنے وطن جائیں گے تو انہیں کوئی ڈھنگ کی نوکری ملے گی بھی یا نہیں۔ ان نوجوانوں کو، نوجوان کے لیے جو سوچنے سمجھنے کے عادی ہیں اور عملی زندگی میں قدم رکھنے والے ہیں اپنی محنت، اپنی تعلیم، اپنی ذہانت سب کچھ بے کار اور بے سود نظر آتی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی ان پر دل برداشتگی اور مایوسی کا شدید دورہ پڑتا رہتا ہے۔

ان سب کے برعکس رویوں والا احسان ہے۔ وہ پکا اشتراکی بن چکا ہے۔ اس کے نزدیک ہندوستان پر غاصبانہ حکومت کرنے والی انگریز سامراج ہی نہیں بلکہ پوری سرمایہ داری کا جلد ہی

بیڑہ غرق ہونے والا ہے۔ یہ زیادہ دنوں چلنے والی نہیں۔ نعیم کے یہاں اس ہی پارٹی میں جب خان صاحب شراب کے نشے میں دُھت اپنی پوتڑوں کی رئیسی کے بارے میں ڈون کی لے رہے تھے تو احسان بپھر گیا۔

'تم سب کے سب رئیس، مہاجن، بنیے، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، سرکاری نوکر، جونک کی طرح ہو اور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ یہ حالت قیامت تک قائم نہیں رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے۔ بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا'۔ (ص ۶۷۔۶۸)

اسی موقعے پر راؤ کو بھی یکا یک جوش آ جاتا ہے۔ وہ بول اٹھتا ہے۔ ہر چند کہ وہ احسان کی موافقت میں بول رہا ہے، لیکن اس کے خیالات پر وہی کچا پن، بے تعلقی اور تشکیک غالب ہے۔

'مجھے احسان سے اتفاق ہے۔ ہماری حیثیت کسی طرح چوروں اور ڈاکوؤں سے بہتر نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کی دولت جو ہم یہاں لٹا رہے ہیں ہم کو اس کا حق ہے؟ ہماری زندگی سے ہندوستان کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ خاک، پتھر...... لیکن میں کہنا چاہتا ہوں...... کہ ہندوستان کے محنت مزدوری کرنے والوں کو جب تک جوتا کھانے میں مزہ آتا ہے اس وقت تک ان بھیڑ کے گلّوں کے لیے سر کھپانا اور ان کی بھلائی کی کوشش کرنا محض تضیع اوقات ہے'۔ (ص ۶۸۔۶۹)

ان میں سے ایک کردار عارف اور دوسرا اس خاموش طبع لڑکی کا ہے۔ (اس کا نام نہیں بتایا ہے) جسے پارٹی ختم ہو جانے کے بعد عارف شب باشی کی نیت سے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ عارف اس قدر بے چین ہے کہ اس نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ اگر کوئی لڑکی اس کے ساتھ جانے کے لیے راضی نہ ہوئی تو وہ پکاڈلی کے قریب کلبوں میں سے کسی سڑک پر ٹہلنے والی رنڈی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ (یہ ہیں وہ آئی۔سی۔ایس صاحب جو ہندوستان جا کر حکومت کرنے کے خواب دیکھ

رہے ہیں) لیکن لڑکی بہت خاموش طبع اور وہاں موجود دوسری لڑکیوں (جین اور شیلا گرین) سے بہت مختلف ہے۔ نعیم کے گھر سے نکل کر عارف اپنے طرزِ عمل سے اس لڑکی پر اپنی ڈھکی چھپی نیت واضح کر دیتا ہے۔ کافی ہاؤس جاتے ہوئے باتیں کرتے کرتے عارف اپنے آپ کو اس لڑکی پر پوری طرح ایک گری ہوئی ذہنیت کے انسان کے طور پر ایکسپوز کر دیتا ہے۔ چلتے چلتے یہ دونوں اگاش ہم کورٹ روڈ کے چوراہے پر پہنچ جاتے ہیں۔ وہ دونوں کارنر ہاؤس میں داخل ہونے والے ہی تھے کہ لڑکی کی نظر اخبار فروش پر پڑتی ہے۔ وہ عارف سے رسمی سی معذرت کر کے سڑک سے دوسری طرف اخبار خریدنے چلی جاتی ہے اور وہاں سے 'ڈیلی ورکر' خرید کر لے آتی ہے۔ اب عارف کے کان کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ خود سے کہتا ہے۔'یہ لڑکی کمیونسٹوں کی صحبت میں رہ کر خراب ہوئی ہے' لڑکی واپس آ کر عارف کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے۔ اتنے میں سامنے سے ایک بس آتی ہے۔ لڑکی عارف سے کہتی ہے۔'یہ تو میری بس ہے۔ بالکل میرے گھر کے سامنے ہی اتارتی ہے'۔ اور یہ کہہ کر' اگر دیر ہو گئی تو پھر عارف کو اسے ٹیکسی میں پہنچانا پڑے گا اور زیادہ دام لگیں گے'۔ وہ ایک دَم سے سامنے رُکی ہوئی بس میں سوار ہو کر عارف کو خدا حافظ کہہ دیتی ہے۔ عارف غم، غصے، جھلاہٹ میں ہونٹ کاٹتا رہ جاتا ہے۔

اعظم، احسان، راؤ، خان صاحب کے آزادانہ سوچنے کی رَو، خود کلامیوں سے عارف کی قبل از وقت افسرانہ رعونت کے مظاہروں، اس کی گری ہوئی ذہنیت کی باتوں سے یعنی ان سب کرداروں کے رہنے سہنے، بات چیت کے انداز، تفریحات، تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ان کے سوچنے کے انداز سے بھی پوری واقفیت ہو جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جو سب سے اہم پہلو سامنے آتا ہے وہ سجاد ظہیر کے اس ناول کے محرکات، مقصد اور مطمعِ نظر کو سمجھنے والا پہلو ہے۔

یوں بھی یہ بہت سامنے کا سوال ہے کہ سجاد ظہیر یورپ میں زیرِ تعلیم طالب علموں کی زندگی کا یہ رُخ دکھا کر ہمیں کیا بتانا چاہتے ہیں؟ کیا یہ بتانے کے لیے یہ لوگ لندن جا کر اپنی تعلیم سے غافل، بے ہودہ باتوں، سیر و تفریح، عشق و عاشقی کی پینگیں بڑھانے، کثرت سے شراب نوشی کرنے وغیرہ وغیرہ کی علتوں میں پھنس جاتے ہیں؟ اگر اس دور کے اخبارات اور رسائل اٹھا کر دیکھیے تو اس ناول سے کہیں زیادہ تفصیلات کے ساتھ یہ حقائق مضامین اور مراسلوں کی شکل میں چھپے ہوئے ملیں

گے۔ کیا یہی کچھ سجاد ظہیر کا مطمحِ نظر بھی تھا؟

یقیناً اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ سجاد ظہیر بھی جب یہ کہتے ہیں کہ یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا ایک رُخ دیکھنا ہو تو اسے پڑھئیے۔ تو اس کا مطلب دیکھنا ہی نہیں بلکہ اس رُخ کے کم و کیف سے جو نتائج مرتب ہو رہے تھے ان کو سمجھنا اور اس پر غور کرنا بھی اس دیکھنے ہی میں شامل ہے۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ان کرداروں کی حیثیت اپنی اپنی جگہ انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے خاندانی پس منظر جدا جدا ہیں۔ اسی لیے ان کے طرزِ عمل بھی الگ الگ شخصیتوں کے نمائندے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ سب لوگ ایک مخصوص ملک (بھارت) سے نسبت رکھنے کی بنا پر نہ صرف ایک اجتماعی گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اپنے ملک کی تہذیب اور ثقافت کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام اہم اور غیر اہم پہلوؤں کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ اس ہی بنا پر وہ اپنے وطن کی وہ آوازیں ہیں جو بیک وقت اپنے ماضی اور حال یعنی قدیم اور جدید افکار و رجحانات ـــ اور مستقبل ـــ یعنی بنتے ہوئے اذہان ـــ کی آئینہ داری بھی کرتی ہیں۔ ان ہی طالب علموں کی وساطت سے ہمیں لندن میں زیرِ تعلیم طلبا کے ان افکار و خیالات کا بھی پتا چلتا ہے کہ وہ انگریزوں کی اس دو رُخی پالیسی کو بھی سمجھنے لگے تھے کہ وہ اپنے وطن میں تو عدل و انصاف، سماجی بہبود اور وطن کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے والا لائحہ عمل اختیار کیے ہوئے ہیں، لیکن ہندوستان میں اس کے برعکس وہ رویہ اپنائے ہوئے ہیں جو صرف اور صرف ظالم اور بے انصاف حکمرانوں کا ہوتا ہے۔

سجاد ظہیر قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مارچ ۱۹۲۷ء یعنی تیسری دہائی کے آخری برسوں میں لندن پہنچے تھے۔ یہاں ان کی میل ملاقات لندن کے پڑھے لکھے افراد، دانشوروں، انقلابیوں اور طالب علموں سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ بہت سے نئے افکار و خیالات اور انقلابی طرزِ فکر سے بہت قریبی رابطہ پیدا ہوا لیکن یہ باتیں سجاد ظہیر کے لیے یکسر انوکھی اور نئی نہیں تھیں اس لیے کہ وہ ہندوستان میں بھی اپنے زمانہ طالب علمی میں نئے دور کے تقاضوں اور تبدیلیوں سے بہت کچھ آشنا ہو چکے تھے۔ اس کا بڑا سبب ان کے گھرانے کا سیاست اور سیاستدانوں سے قریبی تعلق تھا اور

ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات وجرائد کے مطالعے کا رواج بھی ان کے یہاں تھا۔

اس دور کی ہندوستانی سیاست ومعاشرت پر نظر ڈالیے تو جہاں وافر وسائل والے اونچے اونچے خاندانوں کے نوجوان بڑی حد تک یورپی زندگی اور افکار وخیالات میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں اس دور کے بہت سے نوجوان ہندوستان اور عالمی سطح پر بائیں بازو کی سیاست اور انقلابی افکار کے بھی دلدادہ نظر آئیں گے۔ اس کی بڑی وجہ اولاً تو کانگریس کی احتجاجی سیاست کی پیدا کی ہوئی گرماگرمی تھی اور دوسری طرف اس ہی دور کی دو اہم تحریکیں یعنی تحریکِ خلافت اور تحریکِ ہجرت نے ہندوستان کے زیرِ تعلیم نوجوانوں کے لیے بین الاقوامی رابطوں کی راہ ہموار کی۔ ہجرت تحریک کے نوجوانوں کو جب افغانستان سے ترکی جانے کی سہولتیں بوجوہ فراہم نہ ہوسکیں تو مولانا عبیداللہ سندھی کی قیادت میں ایک گروہ روس جانکلا۔ یہاں رائے، ان کی اہلیہ اور دوسرے دو ایک ساتھی نئی سوشلسٹ قیادت سے پہلے ہی قریب تھے۔ ہندوستان کے نوجوانوں کی نئی کھیپ نے منظم طریقے پر نووارد ہندوستانی نوجوانوں کو سوشلزم اور انقلاب کے لیے تیار کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ہندوستان کی فضا میں سوشلزم اور مزدوروں کی حکومت قائم کرنے کے چرچے جس انداز میں کھلم کھلا ہونے شروع ہوئے تھے وہ ہم سب کی نگاہ میں ہیں۔ ان سب حقائق کے پیشِ نظر یہ بات کہنے کی نہیں رہ جاتی کہ لندن میں اپنی تعلیم کے وقت سجاد ظہیر کس حد تک سوشلزم کے نظریات سے ذہنی طور پر ہم آہنگ ہوچکے تھے، البتہ یہ ضرور ہے کہ یہاں آکر باقی کسر اس نئی فضا میں پوری ہوگئی۔ اگر اس بارے میں خود سجاد ظہیر کی گواہی درکار ہو تو 'یادیں' کا یہ اقتباس حاضر ہے۔ (اس کے پس منظر میں جرمنی، فرانس اور آسٹریا میں فاشزم کی بڑھتی ہوئی سیاہ کاریوں کا ذکر کیا گیا ہے):۔

'ہمیں محسوس ہونے لگا کہ فاشیت کی گو آج جیت ہوئی ہے، لیکن دوسری طرف محنت کشوں کا انقلابی شعور بڑھ رہا ہے۔ انھیں ناکامیوں کا تجربہ کامیاب انقلاب کو ممکن بنادے گا...... بڑی سخت کشاکش، جدوجہد، بین الاقوامی جنگ اور انقلاب کے دور کا آغاز ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔ کیا آدمیت کبھی بھی اس سیلاب آتش وآہن سے نجات

حاصل کر سکے گی؟ کیا یہ ممکن تھا کہ ہم نوجوان جن کی رگوں میں زندگی کا
گرم خون گردش کر رہا تھا اپنے کو اس طوفان سے بچا سکیں گے......؟ کیا یہ
ممکن تھا کہ ہم اپنی نجی زندگی کو سماج کے مضطرب بیاکل جیون سے الگ
کر لیں؟ ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارا
دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں
کو سمجھنے اور ان کو سلجھانے میں مدد دے سکے......'

اتنے واضح اقرار اور سوشلزم کی نئی راہ اپنانے کے عزم کے ایسے واضح اعلان کے بعد یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی اس قسم کا سوال ضرور ہی کیا جائے کہ کیا ان حقائق کے بعد بھی 'لندن کی ایک رات' میں سجاد ظہیر صرف اور محض ہندوستانی طالب علموں کی عیش پرستانہ اور بے رہروانہ زندگیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھانا چاہتے تھے؟

کسی سوال کے جواب میں نہیں البتہ ایک حقیقت کو سامنے لانے کے لیے 'یادیں' کی ابتدائی سطور کی طرف اب توجہ دلانا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں درج اس چھوٹے سے اقتباس سے ہمیں بہت واضح انداز میں اس نئی صورت حال سے ہم آہنگ ہو جانے کے لیے قبل از وقت سجاد ظہیر کی ذہنی آمادگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'قانون جسے پڑھنے کے لیے میں لندن ٹھہرا تھا میرے لیے ایک چھوٹی سی
چیز ہو کر رہ گیا تھا بالکل غیر معمولی، غیر ضروری اور اہمیت سے خالی۔ اصل
بات یہ تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے یورپ میں خاص طور پر اور عام
طریقے سے ساری دنیا میں جو دن بدن تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ یہ جو معلوم
ہوتا تھا کہ زمانہ مٹ رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کے پیدا ہونے کے
آثار ہیں، اس کا نقشہ ہر گھڑی سامنے رہتا تھا...... ۱۹۳۵ء کے پہلے کے دو
سال کا ذرا خیال کیجیے، ساری دنیا پر نازل ہونے والی اکنامک کرائسس کا
سیاسی اثر جرمنی میں ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ کی صورت
میں ظاہر ہوا۔

مندرجہ بالا اقتباسات کو سامنے رکھ کر ذرا 'لندن کی ایک رات' کی اس فضا کو ذہن میں تازہ کیجیے کہ جس رات نعیم الدین کے یہاں دعوت ہوئی اس دعوت میں شرکت کے لیے اعظم اور راؤ اتفاقاً ساتھ ہو جاتے ہیں۔ راستے میں ان کی گفتگو اس اضطراب، بے چینی اور بے بسی کی صدائے بازگشت ہے جس ماحول کی نشاندہی اوپر کے اقتباس میں سجاد ظہیر نے اس دور کے ذہنوں میں بسی ہوئی دکھائی ہے۔ فرق صرف مقام کا ہے۔ سجاد ظہیر نے ہٹلر کے مظالم جرمنی میں بیان کیے ہیں۔ اعظم اور راؤ کی بات چیت ہندوستان کے حوالے سے ہے:

> 'تم نے آج کا اخبار دیکھا؟ ہندوستان میں پھر کہیں گولی چلی ہے'۔ اعظم نے کہا۔ 'نہیں میں نے اخبار تو نہیں دیکھا مگر اشتہار دیکھے ہیں۔ اب تو یہ روز کا دستور ہوتا جا رہا ہے۔ ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑے مکوڑوں کے برابر ہے قصور صرف ہمارا ہی ہوگا۔ ہم ہندوستانی اس ہی لائق ہیں۔ کمینے، ذلیل، بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے...... خیال تو کرو ۳۵ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر حکومت کرتے ہیں اور حکومت بھی کیسی حکومت! ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ انگلستان میں رہ کر انگریز چاہے ہمارے جوتے صاف کرے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں مگر سویز سے اس پار ہم سب ''کالا لوگ'' ''نیٹوز'' غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں...... اتنی ذلت برداشت کرنے پر بھی جس قوم کے کان پر جوں تک نہ رینگے اس کا تو صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جانا ہی بہتر ہے۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے جب ہندوستان سے گولی چلنے کی خبر آتی ہے'۔ راؤ نے تلخی کے ساتھ کہا۔

کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ سجاد ظہیر نے 'یادیں' میں جرمنی کے ظلم و تشدد کے بیان میں اپنے جذبات پر جس درجے ضبط اور قابو کا مظاہرہ کیا تھا ہندوستان کے حوالے سے جب بات کرنے کا موقع آیا تو وہ ان دو طالب علموں کی بات کا سہارا لے کر کس درجہ کرب اور غم و غصے کا اظہار بے ساختہ کر جاتے

ہیں۔'لندن کی ایک رات' میں ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا دراصل یہی رُخ دیکھنا ہو تو، بھی ہمیں اس ناول کو اپنا حوالہ بنانا پڑتا ہے اور وہ دوسرا رُخ جو بے فکری، سیر و تفریح اور لمبے وقفے تک والدین کے اخراجات پر لندن میں ٹکے رہنے سے تعلق رکھتا ہے دراصل اس پہلے رُخ کو ابھارنے، اسے تیز کرنے اور ہندوستان میں انگریزوں کے پیدا کردہ حالات کی تلخی کو زیادہ اجاگر کر کے محسوس کرانے کا ذریعہ ہے۔

بات اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بھی بڑھتی ہے یعنی راؤ اور اعظم نعیم الدین کی دعوت میں جاتے ہوئے راستے میں پڑنے والے پب میں تھوڑی تھوڑی برانڈی پی کر سردی کا اثر کم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پب انگریز مزدوروں کا پسندیدہ پب ہے۔ ابھی راؤ اور اعظم ایک ایک گلاس ختم ہی کر پائے تھے کہ راؤ کے قریب آ کر ایک انگریز مزدور نے اس سے ماچس مانگی اور اپنا پائپ سلگاتے ہوئے ان دونوں سے بھی وہی سوال کیا۔ ہندوستان بھر میں گڑبڑ ہو رہی ہے......؟ راؤ تو پہلے ہی اعظم کی باتوں پر بھنایا ہوا تھا۔ وہ اس مزدور پر بھی پلٹ پڑا۔'ہاں! ہندوستان سے بری خبر آئی ہے، لیکن مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ جتنی زیادہ ہندوستان میں گڑبڑ ہوتی ہے مجھے اتنی ہی خوشی ہوتی ہے'۔ اس مزدور نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ راؤ کی بات سن کر بغیر کسی جوش و خروش کے جواب دیا۔'مجھے فساد، گڑبڑ، خون خرابے کی خبر سن کر خوشی نہیں ہوتی اور جب ہم انگریز ہندوستان میں جا کر بغیر فوج کی امداد کے حکومت نہیں کر سکتے تو......اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ہندوستان سے اپنا بوریا بستر سنبھال کر واپس چلے آئیں...... میں تو کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ ہمارے انگلستان پر جرمن یا فرانسیسی یا کوئی اور قوم آ کر حکومت کرے۔ تو پھر ہندوستان میں رہنے کا ہم کو کیا حق ہے' ('لندن کی ایک رات' ص۔۲۰)۔

اسی تسلسل میں اس انگریز مزدور 'ٹام' اور اس کے دوست 'جم' کے درمیان بھی مخصوص بات ہوتی ہے۔ جس میں ٹام، کے برعکس جم، ہندوستان پر انگریزوں کی حکمرانی کو اس لیے جائز سمجھتا ہے کہ ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ وہاں ہندو اور مسلمان دو مذہب کے لوگ ہیں اور ان میں ہمیشہ آپس میں لڑائی ہوا کرتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ اگر ہم ہندوستان میں امن نہ رکھیں اور اس ملک کو چھوڑ کر چلے آئیں تو وہاں ہندوستان میں بہت خون خرابے کا ڈر

ہے۔ ('لندن کی ایک رات' ص۔۲۱)۔

پب میں انگریز مزدوروں کی مندرجہ بالا گفتگو کے علاوہ اور دوسرے انگریز مزدور بھی ملکی اور بیرونِ ملک کے سیاسی حالات پر بے تکان، بے تکلف اور پورے جوش و خروش کے ساتھ دیر تک بحث و مباحثہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ 'لندن کی ایک رات' کا ایک دوسرا رُخ ہے۔ جس میں ہندوستانی طالب علموں کا یہاں آکر زندگی گزارنا، ایک ضمنی سا پہلو بن جاتا ہے۔ اصل میں یہ رُخ مزدوروں کی بات چیت کے حوالے سے سوشلسٹ مزاج کا وہ پہلو پیش کرتا ہے جس میں کسی بھی قوم کا دوسری قوم پر زبردستی اپنا تسلط رکھنے کی مذمت اور مزاحمت کا سوال کھل کر سامنے آتا ہے۔ راؤ اور اعظم کی اس بات چیت میں موجودگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہی خیالات ہندوستان کے بعض طلبا کے لیے ان کی ذہنی تربیت کا سبب بن رہے تھے۔

سجاد ظہیر نے ان حوالوں سے یا یوں کہہ لیجیے کہ ان حوالوں کے سہارے خود اپنے افکار و خیالات پر سوشلزم کی گہری ہوتی ہوئی چھاپ کو موضوعِ سخن بنا کر اپنے پڑھنے والوں کو بھی اس طرف متوجہ کرنا چاہا ہے کہ وہ بھی ہندوستان میں انگریز حکومت کی ڈھکی چھپی نیتوں اور ان کے ناول کے کرداروں کی گفتگو اور طریقۂ فکر کو واضح طور پر جان لیں تاکہ مستقبل کا لائحہ عمل بناتے وقت اپنے اردگرد کی دنیا میں تیزی سے ہونے والی تبدیلیوں کو سامنے رکھیں۔ ناول کا یہ پہلو بہرحال طالب علموں کی لندن میں گزاری جانے والی زندگیوں سے بالراست یا براہِ راست تعلق ضرور رکھتا ہے۔

نعیم الدین کی پارٹی کے دوران میں بھی راؤ، اعظم، خان، سنگھی، عارف اور دوسرے نسوانی اور مرد کرداروں کی گفتگو میں جا بجا ملک کے حالات پر کڑھن، بیزاری اور کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا بھی پرتو ملتا ہے اور اس سارے ماحول سے بے خبری، لاتعلقی اور صرف اپنی ذات کے خول میں اترے ہوئے کرداروں کی بات چیت بھی آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناول کا موضوع، ماحول اور کردار اتنے بے ضرر اور معصوم نہیں ہیں کہ جتنا سجاد ظہیر نے اپنے چند سطری ابتدائی نوٹ میں بتانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ بہت صاف ہے۔ اس ناول کی اشاعت کے وقت (اواخر ۱۹۳۸ء) سجاد ظہیر اور ان کے تمام ساتھی 'انگارے' کی اشاعت (۱۹۳۲ء) اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام (۱۹۳۶ء) کے دو باغیانہ جرائم کے بعد انگریز حکمرانوں کے تعزیراتی عزائم اور ان پڑھ ملاؤں

کی فتوے بازیوں کے حصار میں گھرے ہوئے تھے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی ایک اہم پہلو رہا کہ گو دوسری جنگِ عظیم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے آثار بہت نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ انگریز حکمران اپنے لیے جتنا خطرناک جرمنی کو جانتے تھے اتنا ہی روس کی سوشلسٹ حکومت اور خود ہندوستان کے اندر کمیونسٹ پارٹی کو بھی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس ناول کی اشاعت کے وقت اگر اس کی نوعیت کسی طرح سے بھی انگریز دشمنی پر مشتہر ہو جاتی تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو 'انگارے' کا ہوا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس ناول کی پبلسٹی انگلستان میں زیرِ تعلیم ہندوستان کے بے فکرے طالب علموں کی کارگزاری کے طور پر ہوئی اور یوں اس کے اندر کا مواد قبل از وقت چوکنا کر دینے اور بعد کی تعزیراتی کارروائیوں کا 'دعوت نامہ' نہ بن سکا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ اس ناول کے شائع ہوتے ہوتے انگلینڈ اور ہندوستان کی انگریز حکومتیں جنگ کی لپیٹ میں آ گئیں اور یوں یہاں ہندوستان کی حکومت کو شعر و ادب کی چھان بین اور باغی مواد کی کرید کرنے کے مشغلے کو جاری رکھنے کی فرصت نہ ملی ورنہ تو سجاد ظہیر نے طالب علموں کی گپ بازی کے پردے میں ہی سہی انگریزوں کے ہندوستان پر طرزِ حکومت اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کے خلاف اس ناول کو بھی کیا کچھ رنگ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ اس زاویے سے غور کیجیے تو یہ کوئی معمولی نہیں بلکہ اپنے دور کے سیاق و سباق میں خاصا تیز ناول ہے۔ یہ بات ماننی پڑے گی کہ اپنی نرم خوئی کے برخلاف سجاد ظہیر نے اسے خاصے تیز انداز میں لکھا ہے۔ اوپر جو اقتباسات دیئے گئے ہیں انہیں ناول میں پوری فضا کے ساتھ پڑھیے تو ان کا رنگ ہی اور ہے۔ پھر اوپر دیئے گئے اقتباسات ہی سب کچھ نہیں ہیں بلکہ اعظم اور راؤ کی گفتگو کے علاوہ پب میں انگریز مزدوروں کی بات چیت، ہندوستان کی سیاست اور وہاں انگریزوں کا رویہ، خود ہندوستانیوں کے متعلق ان کی آراء، انقلاب کی باتیں، نعیم الدین کی پارٹی کے بعد عارف (مستقبل کا آئی۔ سی۔ ایس) کو ایک انقلابی لڑکی کا جُل دینا، جین کی طویل داستانِ معاشقہ جس کا مرکزی کردار ہیرن پال ایک انقلابی ہنگامہ خیز آدمی ہے جو اپنے ملک واپس جا کر جین کی محبت کا جواب اپنی انقلابی سرگرمیوں کی قیمت پر دینا یکسر تضیع اوقات سمجھتا ہے۔ سوچنے کا مقام یہ ہے کہ یہ سب کیا ہے؟ اور اس کا لندن میں بالخصوص اور یورپ میں بالعموم ہندوستانی طلبا کا عیش پرستانہ زندگی گزارنے سے کیا تعلق ہے؟

حقیقت وہی ہے، جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے یہ ناول لندن میں زیرِ تعلیم ان ہندوستانی طلبا کی زندگیوں کا رُخ دکھانے والا ہی ہے کہ وہ کس طرح ہندوستان پر حکومت کرنے والی قوم کے عین مرکز میں بیٹھ کر ان کو اپنے ملک سے بھگانے کے جذبات اور عزائم پرورش دے رہے ہیں۔ رہ گئی یہ بات کہ ناول میں زیادہ تر ایسے طالب علموں کی زندگی کا رُخ دکھایا گیا ہے جو محض تفریح بازیوں میں وقت گزار رہے ہیں۔ سو یہ بات کیوں بھلا دی جاتی ہے کہ اصل بات کو نمایاں اور مستحکم انداز میں پیش کرنے کا یہ قاعدہ زندگی اور ادب میں عام ہے کہ منوائی جانے والی بات کی ضد یا مثبت کو منوانے کے لیے منفی رُخ پیش کرنا، کھرے اور کھوٹے کی شناخت کو آسان بنا دیتا ہے۔ اگر سجاد ظہیر نے بھی 'لندن کی ایک رات' میں انگریزوں کے خلاف انقلابی معمولات میں پڑے ہوئے طلبا کی زندگیوں کا رُخ بھی پیش کر دیا ہے تو کیا انہوں نے اپنے پڑھنے والوں کو لندن جانے اور وہاں جا کر بے فکروں کی سی زندگی گزارنے کی ترغیب دلانے کی خاطر یہ ناول لکھا تھا؟ اور اس کا لندن میں بالخصوص یورپ میں اور بالعموم ہندوستانی طلبا کا عیش پرستانہ زندگی گزارنے سے کیا تعلق ہے؟

حقیقت وہی ہے، جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے یہ ناول لندن میں زیرِ تعلیم ان ہندوستانی طلباء کی زندگیوں کا یہ رُخ دکھانے والا ہے کہ وہ کس طرح ہندوستان پر حکومت کرنے والی قوم کے عین مرکز میں بیٹھ کر ان کو اپنے ملک سے بھگانے کے جذبات اور عزائم پرورش دے رہے ہیں۔ رہ گئی یہ بات کہ ناول میں زیادہ ایسے طالب علموں کی زندگی کا رُخ دکھایا گیا ہے جو محض تفریح بازیوں میں وقت گزار رہے ہیں۔ اس سوال کے جواب ہی میں 'لندن کی ایک رات' لکھے جانے اور اس کے اصل رُخ کا جواز موجود ہے اور یہ جواب دیا جا چکا ہے۔

تکنیک:

جس طرح سے 'لندن کی ایک رات' کو ہمارے فکشن میں انقلابی مواد، نقطہ نظر اور کرداروں کی پیشکش میں اہمیت حاصل ہے اسی طرح سے تکنیک کے لحاظ سے بھی اسے شعور کی رَو کی تکنیک کو برتے جانے کی بنا پر فنی اعتبار سے اجتہادی حیثیت حاصل ہے۔ سجاد ظہیر نے 'لندن کی ایک رات'

لکھنے سے پہلے ہی اپنے ایک افسانے 'نیند نہیں آتی' میں اس تکنیک کو تلازمِ خیال کی رَو کے ساتھ ملا کر پیش کیا تھا۔

موضوع، مواد اور فن کے لحاظ سے یہ ناول اتنی اہمیت رکھنے کے باوجود نہ پوری طرح تنقید کا موضوع بن سکا اور نہ ہی ناول سے متعلق ہمارے یہاں ادب اور ناول کی تواریخ میں اس کے ساتھ انصاف کیا گیا۔ اس صورتِ حال کو یوں دیکھیے کہ 'ترقی پسند ادب' پر سب سے پہلی کتاب عزیز احمد کی 'ترقی پسند ادب' تھی۔ پھر بعد میں سردار جعفری کی ترقی پسند ادب آئی۔ کتابیں تو دو اور بھی ترقی پسند ادب اور تحریک سے متعلق پنڈت کشن پرشاد کول کی 'نیا ادب' اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی 'ترقی پسند تحریک' آئیں مگر ان تینوں کتابوں میں بھی بوجہ 'لندن کی ایک رات' پر سرسری سے اشاروں سے بات آگے نہیں جاتی۔

کول صاحب اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتابیں تو ترقی پسند ادب اور تحریک پر کچھ مخالفانہ اور معاندانہ نقطۂ نظر کے تحت لکھی گئی ہیں، لیکن زیادہ اہمیت ان کتابوں کی بنتی ہے جو تحریک اور ادب دونوں سے، مثبت اور مخلصانہ رویوں کی حامل ہیں۔ ایک دو اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔ سب سے پہلے عزیز احمد کی کتاب 'ترقی پسند ادب' کی یہ چند سطریں ملاحظہ فرمایئے:

> 'ترقی پسند تحریک کی ابتدا کے زمانے میں سجاد ظہیر کا ایک ناول 'لندن کی ایک رات' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ بجائے ناول کے اگر اسے ایک طویل افسانہ کہا جائے تو بجا ہوگا۔ کتاب دو غیر متوازن حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ پہلے حصے میں تو ایک ہندوستانی نوجوان کے یہاں کچھ ہندوستانی دوستوں اور انگریز لڑکیوں کا اجتماع ہے اور ضمناً انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات اور آرٹ کے متعلق مباحث آگئے ہیں۔ دوسرے حصے میں سوئٹزر لینڈ کی ایک شام کا ایک انگریز لڑکی اور ہندوستانی نوجوان کی محبت کا قصہ ہے، جس کی رومانیت سے کوئی اہم نتیجہ نہیں نکلتا'۔
>
> (ص: ۱۵۳۔ طبع دوم۔ خواجہ پریس دہلی۔ سنہ ندارد)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اوّلاً تو عزیز احمد اسے ناول ہی نہیں مانتے۔ چلیے طویل افسانہ ہی

سمجھنے۔ پھر بھی اس کے موضوع اور اس کی تکنیک پر تو بات کی جاسکتی تھی۔ پھر جو کچھ لکھا وہ بھی اس بے اعتنائی کے ساتھ کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات اور یورپ کے آرٹ کے متعلق ایسی باتوں کے حوالے ضمناً آگئے ہیں، فرما دیا۔ حالانکہ اس ناول میں ہندوستانی طالب علموں کے ذہنوں کو سمجھنے کے لیے یہ دونوں باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ سجاد ظہیر کے ابتدا میں لکھے ہوئے نوٹ کی رُو سے تو اس کتاب کا بنیادی موضوع ہی یہی کچھ بنتا ہے۔ گزشتہ اوراق میں اس نکتے پر تفصیلی بات کی جاچکی ہے۔

عزیز احمد کی مذکورہ بالا کتاب کے مقابلے میں علی عباس حسینی صاحب کی کتاب اس لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ یہ تو ہے ہی 'ناول کی تاریخ اور تنقید'۔ حق کی بات یہ ہے کہ اردو میں ناول نگاری کی کوئی تاریخ و تنقید حسینی صاحب کی اس کتاب سے پہلے ہمارے یہاں موجود ہی نہیں تھی جس جانفشانی اور تحقیق کے ساتھ یہ کتاب لکھی گئی ہے بعد میں نہ تو اس سے آگے بڑھ کر کوئی کام ہوا۔ (بجز ۱۹۵۴ء کے بعد کی کتابوں میں ہم عصر ناول نگاروں کی تصانیف کے تذکروں کے) اور نہ ۱۹۵۴ء کے جو ناول حسینی صاحب نے cover کیے تھے ان پر ان کی باتوں کے حصار سے نکل کر کچھ لکھا گیا۔ اتنی اہم کتاب لکھنے کے باوجود نہ جانے علی عباس حسینی صاحب 'لندن کی ایک رات' سے اتنے سرسری سے کیوں گزرے۔ 'ناول کی تاریخ اور تنقید' میں صفحہ ۳۳۲ پر اس ناول کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ صفحہ ۳۳۳ پر جو چار سطریں اس پر بطور تبصرہ ہیں وہ پیش خدمت ہیں۔

> 'سجاد ظہیر نے یہ ناولچہ جیمس جوائس کا یولی سس دیکھنے کے بعد لکھا ہے۔ وہاں ڈبلن کا ایک دن تھا، یہاں لندن کی ایک رات ہے، وہ تحت الشعور کی انسائیکلوپیڈیا ہے یہ جیبی ڈکشنری، پھر بھی اس چھوٹے سے ناول میں نفسیاتی تحلیل اچھی پیش کی گئی ہے اور اشتمالیت کا پروپیگنڈا فنکارانہ طور پر پیش کیا گیا ہے'۔
>
> (ص: ۳۳۲، ۳۳۳۔ پہلا ایڈیشن۔ انڈین بک ڈپو، لکھنؤ)

اشاروں اشاروں میں سہی، حسینی صاحب نے بنیادی باتیں تو کہہ ہی ڈالی ہیں۔ حالانکہ اس ناول کے مقابلے میں بہت سی کم اہم اور طاقِ نسیاں کی زینت بن جانے والے ناولوں پر خاصے

طویل تبصرے بھی موجود ہیں۔ پھر شعور کی رَو (جسے تحت الشعور کی رَو لکھا گیا ہے) پر بھی محولہ بالا صفحات سے پہلے خاصی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ تاہم سجاد ظہیر نے اس تکنیک سے جو کام لیا ہے حسینی صاحب خود بھی اس پر بہت کچھ لکھنے کے پوری طرح اہل تھے۔

ہمارے یہاں پاکستان میں ناول پر بھی دو تحقیقی کام سامنے آچکے ہیں۔ ایک ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی کتاب اور دوسری ڈاکٹر سہیل بخاری صاحب کی 'ناول نگاری'۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی کتاب اس وقت سامنے نہیں ہے۔ اس لیے موضوعِ زیرِ نظر سے متعلق اقتباس نہ دینے کی معذرت، البتہ دوسری کتاب کا درج ذیل اقتباس حاضر ہے۔

> 'ناول کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں ایک ہندوستانی نوجوان کے گھر پر چند ہندوستانی دوستوں اور انگریز لڑکیوں میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے تعلقات اور تمدنی، سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور اخلاقی مسائل پر لمبی لمبی گفتگوئیں اور بحثیں ہوتی ہیں۔ دوسرے حصے میں سوئٹزرلینڈ کی ایک شام کو ایک ہندوستانی نوجوان اور انگریز لڑکی کی محبت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ دلچسپ ہے اور نعیم کی کردار کشی مصنف کی کامیاب کوشش ہے۔ کتاب میں نفسیاتی تحلیل اچھی ہے اور اشتمالی پروپیگنڈا بھی خوب کیا گیا ہے'۔
>
> (میری لائبریری ایڈیشن۔ ۱۹۶۶ء۔ لاہور)

قطع نظر اس سے کہ اوپر خط کشیدہ الفاظ سے دہشت دیکھ کر گھر یاد آنے لگے (ملاحظہ ہو حسینی صاحب کے اقتباس کی چند سطریں) ہم اپنے فاضل نقاد اور محقق کی یہ رائے پڑھ کر کہ 'نعیم کی کردار کشی مصنف کی ایک کامیاب کوشش ہے'، 'لندن کی ایک رات' اور اس کے مصنف پر ترس آنے لگتا ہے جو اس مختصر سے فقرے کی دھاردار چھری کے تلے تڑپتے نظر آتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ڈاکٹر موصوف کی اس چار سطری رائے میں عزیز احمد اور علی عباس حسینی کی پہلے سے کہی گئی باتوں کا ہی اعادہ کیا گیا ہے۔ خود اپنی طرف سے جو کچھ انہوں نے اضافہ فرمایا وہ اجتہاد سے کم نہیں۔ گویا سجاد ظہیر نے پورا ناول صرف نعیم کی کردار کشی میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر لکھا۔

نہیں عقل و دانش'۔

'لندن کی ایک رات' کے حوالے سے جو کچھ اقتباسات کی شکل میں اوپر پیش کر دیا گیا ہے وہ خود اپنے منہ اپنا حال کہتی نظر آتی ہیں۔ اب اس بارے میں اور کچھ کہنا سننا بے موقع سی بات لگتی ہے البتہ اس ضمن میں ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کی 'مختصر تاریخ ادب اردو' سے ایسا ہی مختصر سا اقتباس قارئین کی نظر ہے۔ جس میں مذکورہ بالا تمام کتابوں سے پہلے انہوں نے سجاد ظہیر کے بارے میں تھوڑے سے الفاظ میں ساری بنیادی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔

> ''لندن کی ایک رات' اس لحاظ سے اہم ناول ہے کہ اس میں اس وقت کی مروجہ ناول نگاری کے اصولوں سے انحراف کی کوشش کی گئی ہے اور پہلی مرتبہ ناول کی مغربی ٹیکنیک ''شعور کی رَو'' کا استعمال اس میں کیا گیا ہے۔ اس کے مسائل ان ہندوستانی طلبا کے مسائل ہیں جو لندن جا کر اس وقت تعلیم تو حاصل کرتے تھے لیکن جن کے سامنے کوئی ان کا مستقبل نہ تھا۔ اس طرح ''لندن کی ایک رات'' سے اردو میں جدید ناول نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ جن میں مغربی فن اور مشرقی مسائل کو ایک نئے طرز پر برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سجاد ظہیر صحیح معنوں میں ایک حقیقت نگار تھے۔ جنہیں اپنی تاریخ، ملکی سیاست اور ادب کی رفتار کا مکمل عرفان حاصل تھا'۔
>
> (ص: ۳۹۰، ۳۹۱۔ الٰہ آباد ایڈیشن ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کی اس تاریخ کا پہلا ایڈیشن تو ۱۹۳۴ء میں آیا۔ ظاہر ہے کہ اس پہلے ایڈیشن میں 'لندن کی ایک رات' پر اظہار خیال ممکن نہیں تھا کہ یہ ناول شائع ہی نہیں ہوا تھا۔ البتہ کوئی نو دس سال بعد ۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر صاحب نے اس پر نظر ثانی کر کے اشاعت کے لیے دیا تو اس ایڈیشن میں سجاد ظہیر کے بارے میں وہ خاصا طویل تذکرہ شامل تھا جو بعد کے ایڈیشنوں میں شامل چلا آتا ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عزیز احمد کی کتاب 'ترقی پسند ادب' (پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء) کو چھوڑ کر ڈاکٹر اعجاز حسین کی 'مختصر تاریخ ادب اردو' میں سجاد ظہیر کی ادبی کاوشوں بالخصوص اس ناول کا

پہلی بار صحیح پس منظر اور مفہوم و مدعا واضح کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کتاب کو اس باب میں خصوصی حوالے کی حیثیت ہمیشہ حاصل رہے گی۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کے بعد احتشام حسین نے دوسری بار اپنی 'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' میں بھی بھرپور توجہ دی ہے۔

> 'نئے انداز کا پہلا ناول ''لندن کی ایک رات'' جس میں سجاد ظہیر نے یورپ کی کئی ایک اسالیب کا تجربہ کیا ہے۔ مگر اس کی اہمیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اس کی تصنیف میں یورپ سے فیضان ملا ہے بلکہ یہ پہلا ناول تھا جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کے تصورات اور خواہشات کو یہاں کے سیاسی پس منظر میں دیکھا گیا ہے'۔ (ص۔۱۱۳)

'لندن کی ایک رات' کے بارے میں اوپر کی سطور میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا مقصد صرف ریکارڈ کی درستگی تھا۔ آیئے اب اس ناول میں برتے گئے ان اسالیب اور تکنیک کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جو ہمارا اصل موضوع ہے۔ سب سے پہلے شعور کی رو پر اور پھر اس کے ساتھ ہی دوسری دو ایک تکنیک پر نظر ڈالتے ہیں جنہیں سجاد ظہیر نے اس ناول میں برتا ہے۔

یہ بات کہنے میں کسی بہت گہرے راز کو افشاں کرنے کا دعویٰ نہیں ہے کہ ابتدا سے 'لندن کی ایک رات' یا اس سے تھوڑا پہلے 'انگارے' میں شامل سجاد ظہیر کے افسانے 'نیند نہیں آتی' تک ہمارے یہاں فکشن صرف بیانیہ اسلوب میں ہی لکھا جاتا تھا۔ اصل بات اس اشارے سے یہ واضح کرنی تھی کہ 'بیانیہ' اپنی ضرورتِ اظہار کے تقاضوں کے تحت منظر کشی، کردار نگاری اور واقعہ نگاری اور پھر اس میں افسانویت پیدا کرنے کی خاطر چھوٹی چھوٹی جزویات کو بھی اپنی گرفت میں لینے پر مجبور رہا۔ اس لیے تفصیل یعنی طوالت نگاری بیانیہ کا جزو لازم ہے۔ اس کے برعکس شعور کی رو کی تکنیک میں چونکہ بالراست کردار کی داخلی کیفیات کو اس کے خیال کی رو کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے، اس لیے منظر کشی، کردار نگاری اور جزویات کو سمیٹنے کا عمل مصنف کے اپنے بیان کا مرہونِ منت نہیں رہتا۔ اس لیے کہ اس تکنیک میں صرف جھلکیوں (flashes) کی مدد سے آناً فاناً میں صدیوں اور صدہا کوسوں کا فاصلہ چشم زدن میں طے کرا دیا جاتا ہے اور محض چند اشارے دے کر باقی سب

کچھ قاری کی اپنی چشمِ تصور پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جتنا پڑھنے والے کا اپنا وژن ہوگا اسی تناسب سے شعور کی رَو برتے جانے والی تحریروں کا ساتھ دے گا۔

اس تکنیک سے ملتی جلتی دو تکنیک اور بھی ہیں۔ ایک تلازمِ خیال اور دوسری سرریلزم۔ تلازمِ خیال میں بات سے بات نکلنے والی صورتِ حال درپیش ہوتی ہے یعنی کردار کا ذہن ایک خیال سے دوسرے خیال تک جست لگا جاتا ہے۔ جب کہ سرریلزم میں کردار کا ذہن کسی سامنے کی چیز کو دیکھ کر اس کے مماثل کسی دوسری چیز تک پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو راستے میں کوئی پرانی گندی سی رسی پڑی نظر آئے اور اس کا ذہن فوری طور پر سانپ کی طرف منتقل ہو جائے۔ شعور کی رَو کی تکنیک میں بالعموم لکھتے وقت ان دونوں تکنیکس کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے تحریر میں تنوع اور پڑھنے والوں کے لیے ایک کشش اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس تکنیک سے متعلق جہاں یہ دو ایک اہم باتیں 'لندن کی ایک رات' سے متعلق آگے آنے والی باتوں کی تفہیم کے لیے عرض کی گئی ہیں وہیں ایک اور اہم نقطے کی طرف بھی توجہ دلانا مقصود تھا یعنی یہ کہ شعور کی رَو کی تکنیک برتی جانے والی تحریروں میں بے ربطی کی شکایت عام ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی مصنف کے اس تکنیک کو برتنے میں کماحقہ دسترس حاصل نہ ہونے کی بنا پر یہ الجھن محسوس ہوئی ہو، لیکن بنیادی بات یہی ہے کہ جہاں اس تکنیک کے ساتھ ساتھ بالخصوص تلازمِ خیال کی تکنیک کو برتا جاتا ہے اور سرریلسٹک امیجز کا سہارا لیا جاتا ہے وہاں تیزی سے بدلتے ہوئے خیالات اور ان خیالات کو پیدا کرنے والی اشیا، مقامات یا حالات کے حوالے مل جل کر کنفیوژن پیدا کر دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے اتنا ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شعور کی رَو کی تکنیک میں کسی تحریر کا ایک ہی رُخ آخر تک اختیار کیے رہنا ممکن نہیں ہے۔ انسانی ذہن ایک ہی نقطے پر دیر تک اس ہی صورت میں جمع رہ سکتا ہے کہ وہ کسی خاص مسئلے پر سوچتے ہوئے بھی (غور و فکر کرنے اور آزادانہ سوچنے کا فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے) اکناف و اطراف میں مخصوص صورتِ حال پیدا کرنے والے عوامل اور عناصر کی کھوج میں ضرور بھٹکے گا۔ اس لیے کہ مصنف کو لازمی طور پر اپنے کردار کے ایسے خیالات پیش کرنے چاہئیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں۔ انسانی

شعور کے فطری بہاؤ کو مقید کرنے والی بات پیدا نہ ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شعور کی رَو کو پہلے پہل ادب میں تجربتاً برتنے والے فرانسیسی مصنفین نے فرانسیسی ماہرینِ نفسیات کی اس تعریف کو سختی سے مدِنظر رکھا کہ شعور کی رَو در حقیقت داخلی زندگی کی رَو ہے۔ اس کے بہاؤ میں خارجی عوامل کو فوری طور سے دخل اندازی کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ فرانسیسی ماہرینِ نفسیات کے نزدیک یہ صرف انسان کا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ انگریزی زبان میں بھی ولیم جیمز نے اپنی کتاب (Principles of Psychology) (۱۸۹۰ء) میں اس اصطلاح کو عین فرانسیسی مفہوم کے مطابق ہی استعمال کیا، لیکن اس سب کچھ کے باوجود جب ادب میں ان نفسیاتی انکشافات (یعنی انسانی ذہن کی کارکردگی) کا سہارا لے کر، کرداروں کی ذہنی کیفیات کے مطابق ادب پارے تخلیق کرنے کی شروعات ہوئیں تو داخلی زندگی کی رَو کو خارجی زندگی کی طرح پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرنے کی عملی کوششیں کی گئیں تو بقول رابرٹ ہمفرے یہ مرحلہ خاصا دشوار تھا کہ نجی یعنی (پرائیویٹ) کو عوامی (پبلک) کیسے بنایا جائے؟ چنانچہ اس اہم رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے ذہن کے آزاد تلازمہ (Mental free association) کے اصولوں کو اپنایا گیا...... یوں کردار کے ماضی کے تجربات اور ان کے آزار (obsessions) کے ذکر اذکار سے مرکب ایک پیٹرن (pattern) وضع کر لیا گیا جو بڑی حد تک 'نجی' کو 'عوامی' بنانے کے مسئلے پر قابو پانے میں مددگار ثابت ہوا۔ بعد کو اس اہم کام میں دوسری اہم تکنیکس کو بھی معاون بنایا گیا' (ص: ۱۲۰، ۱۲۱۔ اسٹریم آف کونشیس نیس اِن دی ماڈرن ناول)۔ ان دوسری تکنیکس میں چھوٹی چھوٹی متعدد Devices کے ساتھ خود کلامی، آزاد تلازمہ خیال اور سرریلزم کا استعمال بھی شامل کر لیا گیا۔

یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ہنری جیمز، ڈورتھی رچرڈسن، جیمز جوائس اور ورجینیا وولف کے ناولوں میں برتی گئی تکنیکس یعنی شعور کی رَو، آزاد تلازمہ خیال، خود کلامی وغیرہ سب ہی ابتدا فرانسیسی ماہرینِ نفسیات کی وضع کردہ تھیں اور ذہنی مریضوں کی نفسیاتی کیفیات کے مطالعے میں کام آتی تھیں۔ یہاں ایک خطرناک غلطی کا ازالہ ضروری ہے کہ اس اوپر بیان کی گئی حقیقت کا یہ مطلب نہیں کہ ان اصطلاحات کے ادب میں مروّج ہونے سے پہلے افسانہ اور ناول نگار انسانی ذہن کی

ان کیفیات کو اپنی تخلیقات میں نہیں برتتے تھے یا ان کیفیات سے واقف نہیں تھے۔ اس صورت حال کی وضاحت فرانسیسی ادب کے تاریخ نگار لوئی کزامیاں نے 'فرانسیسی ادب کی تاریخ' میں ان جدید تکنیکس کے ضمن میں بیان کرتے ہوئے بتایا کہ پہلی جنگِ عظیم سے پہلے تک فرانس میں فرائڈ کے کام سے صرف ذہن کے معالجین ہی واقف تھے...... لیکن تحلیلِ نفسی کے علم سے پہلے بھی انسان کے روحانی سربستہ رازوں کو ٹٹولنے کا رواج بھی تھا اور لکھنے اور پڑھنے والے بالعموم گزشتہ صدیوں تک کے ادب میں ان سربستہ روحانی رازوں کی کھوج تلاش پر خاصی توجہ بھی دیتے تھے۔' (ص ۴۳۱)۔ کزامیاں نے اس باب میں خاصی لمبی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح سے حقیقت پسندانہ تحریروں میں انسانی روح کے سربستہ رازوں اور آزار کے رواج کو بعد میں سمبولسٹ تحریک کے علمبرداروں نے برگساں کے فلسفیانہ افکار کے زیرِ اثر انسانی زندگی کو اس کے نازک احساسات، تاثرات، خوابوں اور مزاج کی بدلتی کیفیات کے ساتھ اپنی گرفت میں لیا اور اس بات پر زور دیا کہ انسان کی ہستی تعقل محض (intelligence) نہیں بلکہ وجدان اور احساسات کا مرکب ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ جسے ہم انسانی شعور کا ڈیٹا (data) کہتے ہیں وہ فی الحقیقت ایسے تجربات ہیں جو لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ سب کچھ شعوری نہیں بلکہ لاشعوری کیفیات ہوتی ہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شعور کی رَو دراصل انسانی لاشعور کی یادداشتیں ہیں اور بات پھر کے وہیں آجاتی ہے کہ شعور کی رَو فی الحقیقت انسان کی باطنی زندگی کی رَو ہے۔

بہت مختصر الفاظ میں اس قدرے طویل بحث کا ماحصل یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ انسان کی داخلی یا باطنی زندگی میں خیال کی ایک مسلسل رَو چلتی رہتی ہے۔ فکشن میں اس کا عمل دخل کردار کی سوچ کے ذریعے پہلے بھی ادیبوں کے یہاں موجود تھا۔ البتہ فلسفہ اور نفسیات نے جب انسانی ذہن کے تخیلوں کو اپنا موضوع بنایا تو ان کی وضع کردہ اصطلاحات کو اپنا کر اپنی تحریروں کو ادبانے باقاعدگی کے ساتھ ایک ادبی تکنیک کے تابع کردیا۔ اس کی پہلی مثال کی نشاندہی والٹر ایلن نے اپنی کتاب 'دی انگلش ناول' میں بھی کی ہے۔

> 'ایسا لگتا ہے کہ شعور کی رَو کی اصطلاح ۱۹۱۸ء میں پہلی بار ادبی حلقوں میں ڈورتھی رچرڈسن کے (۱۲) ناولوں کے مجموعے Pilgrimage پر امریکی

تڑا و نفسیات اور فلسفے کی طالب علم نے سنکلیئر کے تبصروں سے متعارف
ہوئی۔ ۔نے سنکلیئر نے (ان ناولوں کے مطالعے کے دوران میں) محسوس
کیا کہ جس طرح انسان کے باطن میں یہ بہاؤ خود بخود جاری رہتا ہے،
ڈورتھی کے ناولوں میں بھی اس ہی طرح آیا ہے'۔

(ص: ۳۳۵_۱۹۵۴ء ایڈیشن)

شعور کی رو کے بارے میں مذکورہ بالا بنیادی باتیں سامنے رکھیے تو بیانیہ طرز کی تحریروں کی طول طویل کردار نگاری، منظر کشی، کردار کے ماضی کی لمبی لمبی تفصیلات اور حال کے آزار اور مسائل کے مجرد بیانات کے مقابلے میں شعور کی رو کی تکنیک کو برتتے ہوئے اس عمل کو کم سے کم الفاظ میں محدود کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال 'لندن کی ایک رات' میں نعیم کے خیال کی وہ رو ہے جو اپنی پارٹی میں آنے والے مہمانوں میں شیلا گرین کو دوسرے مہمانوں سے پہلے آتے دیکھ کر بہہ نکلتی ہے۔ اس بہاؤ کا محرک دراصل شیلا گرین کی خوبصورتی اور پرکشش شخصیت سے کہیں زیادہ نعیم کا اپنا احساسِ کمتری ہے۔ اس کے ذہن میں فوراً راؤ سے اپنی شخصیت کے تقابل اور شیلا گرین کا راؤ کو پسند کرنے پر ایک کشاکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا ذہن بار بار جھٹکے دیتا ہے کہ آخر لڑکیاں کیوں اس کو نظر انداز کرتی ہیں؟ اس میں کیا کمی ہے؟ یہ اقتباس دیکھیے۔

'آخر یہ کون ہے کیا کرتی ہے؟ راؤ اسے کہاں ملا ہوگا۔ خوبصورت لڑکی ہے۔ خوبصورت لیکن میں۔ مجھے کوئی خوبصورت کہہ سکتا ہے؟ مجھ پر کوئی لڑکی عاشق نہیں ہوئی۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے؟ میں موٹا بہت ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان میری توند حائل ہے۔ معلوم نہیں یہ لڑکی مجھے کیا سمجھتی ہے۔ توند سے کیا ہوتا ہے۔ اکثر دنیا کے بڑے بڑے...... انسانوں کی توندیں بڑی تھیں لیکن اگر توند نہیں تھی تو کون سی چیز تھی؟ شاید مجھے عورت سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ اب یہ لڑکی اتنی دیر سے یہاں ہے اور مجھ سے ایک بھی ٹھکانے کی بات نہیں کی جاتی۔ اپنے دل میں خیال کرتی ہوگی کہ کتنا غیر دلچسپ گھامڑ آدمی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا ایسے

لوگ جن سے دو لفظ بھی ٹھکانے سے نہیں بولے جاتے عشق میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر آخر مجھ میں کونسی کمی ہے؟ میرے دوست خیال کرتے ہیں کہ مجھے ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں۔ اچھی صورت دیکھ کر مجھ پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ غلط! بالکل غلط۔ 'مرا در دیست اندر دل گویم زبان سوزد' دوسرا مصرع اس وقت یاد نہیں آتا۔ کیا یہ سچ ہے کہ میرا حافظہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ میں یہاں برسوں سے اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ میں کند ذہن تو نہیں ہو گیا۔ اسکول میں جو ایک لڑکا میرے ساتھ بیٹھتا تھا اس کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں تھی اور حساب میں وہ بیچارہ ہمیشہ فیل بھی ہو جاتا تھا۔ میں تو کبھی اسکول اور کالج کے امتحانوں میں فیل بھی نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ شان کے ساتھ پاس ہوتا تھا میں! کند ذہن! کون کہتا ہے۔ میر اور غالب کے جتنے شعر مجھے یاد ہیں شاید ہی کسی کو ہوں۔ مجھ سے کوئی بیت بازی کرے۔ دیکھیں کون بازی جیتتا ہے۔ کیا اس وقت مجھ سے ایک حرف بھی نہ بولا جائے گا۔ اتنی دیر سے یہ بیچاری بیٹھی ہوئی ہے اور میں نے اس سے ایک بات بھی نہیں کی'۔ (ص: ۳۳،۳۴)

اس اقتباس میں کئی ایک باتیں غور طلب ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہی کہ نعیم کے اندر جو احساسِ کمتری اپنی شکل وصورت اور اپنی شخصیت کے متعلق بیٹھا ہوا ہے وہ اسے بار بار طالب علمی کے زمانے میں پڑھائی اور شاندار کامیابیوں کے سہارے جھٹکنا چاہتا ہے تاکہ دوسرے دوستوں کے مقابلے میں اپنی شخصیت اور اپنی ذات سے مطمئن ہو جائے کہ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی نکلی ہوئی توند کا جواز بھی دوسرے موٹے لوگوں کی ذات میں تلاش کر لیتا ہے جو دنیا کے بہت نامور لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ دوسری بات احساسِ کمتری کی اندرونی کشمکش کی وجہ شعور کی وہ طاقتور رَد ہے جو کسی صورت رُکنے میں نہیں آتی۔ یہاں تک کہ اسے احساس ہونے لگتا ہے کہ اسے اپنے مہمان کو خوش آمدید کہنا چاہیے تھا۔ اس سے بات کرنی چاہیے تھی، لیکن وہ اپنی سوچ میں بری طرح الجھا ہوا ہے اور یوں وہ حسبِ سابق اس لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں پھر

مارکھا جاتا ہے۔ خیر یہ تو اس تکنیک میں کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کو ان کی خودکلامی کے ذریعے گرفت میں لینے کی عام سی باتیں ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کی خودکلامی کے دوران میں کردار اپنے حال اور ماضی اور کبھی کبھی مستقبل کے ارادوں سے جس اختصار کے ساتھ ایک ایسی داستان بیان کر جاتا کہ بیانیہ انداز کی تحریروں میں ان کے لیے بیسیوں صفحات درکار ہوتے ہیں۔ نعیم کی خودکلامی اس عمل میں جس طرح محض چند اشارات، چند جھلکیوں اور مختصر ترین الفاظ میں اس کے اسکول کے دور سے لے کر زمانہ موجود تک کے حالات آگئے ہیں وہ اس تکنیک کا اہم ترین فائدہ ہے، لیکن یہ فائدہ تب ہی اٹھایا جاسکتا ہے کہ مصنف شعور کی رَو کے ساتھ تلازمِ خیال اور خودکلامی کو بھی معاون بنائے۔ صرف شعور کی رَو کے سہارے مختصر کہانی تو شاید نہ قاری پر بار بنتی ہے اور نہ بیانیہ کی حدود میں آتی ہے لیکن پورا ناول اسی مجرد تکنیک کے سہارے تھوڑی دور چل کر بیانیہ حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ ہم لاکھ یہ کہیں کہ یہ فرد کی اندرونی کیفیات کا بالراست اظہار ہے پھر بھی اس اظہار کو قلمبند کرنے میں لکھنے والے کی اپنی کوشش، ایک پلان، ایک پلاٹ اور اس کو آگے بڑھانے کی تدبیر کاری کو تو دخل ہوتا ہے۔ کیا اس زاویئے سے فرد کی خودکلامی ایک دوسرے فرد کی بیان کردہ کہانی نہیں بن جائے گی؟ خواہ اس میں سے لکھنے والے کا رول بحیثیت Narrator کتنا ہی غیر حاضر اور پوشیدہ کیوں نہ ہو۔

چنانچہ جس طرح سے جیمس جوائس کے ناول یولی سس میں اس خطرے سے بچنے کے لیے شعور کی رَو کے ساتھ خودکلامی اور تلازمِ خیال کو بھی بروئے کار لایا گیا ہے اسی طرح سے لندن کی ایک رات، میں بھی ان معاون رَوؤں کو برتا گیا ہے۔ ان معاونات کو برتے بغیر کہانی کا آگے بڑھنا بہت آہستہ رَو اور یکسانیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں اعظم کی ایک داخلی خودکلامی کا انداز دیکھیے:

> بکمبخت آج پھر وعدہ کر کے معلوم ہوتا ہے کہ نہیں آئے گی۔ یہ پہلی بار نہیں ہے۔ مجھے خود شرم آتی ہے۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ذرہ برابر بھی میرا خیال نہیں کرتی مگر میں ہوں کہ اس پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ آخر لندن میں بہت سی لڑکیاں ہیں اور میں کچھ ایسا بدصورت بھی نہیں ہوں، مگر میں اس قدر کمزور ہوں مجھے اپنے اوپر ذرا بھی قابو نہیں۔ کتنی دفعہ ارادہ کر چکا ہوں

کہ اس سے ملنا چھوڑ دوں، اس سے بات نہ کروں، سڑک پر ملے تو منہ دوسری طرف پھیرلوں اور اگر وہ میرے پاس اپنی مرضی سے آئے تو صاف صاف کہہ دوں۔ چلی جا میرے پاس سے اگر مجھ سے تجھے محبت نہیں ہے تو کیوں میرے پاس آتی ہے، اور عاشق ڈھونڈ ترے اور بہت سے طلب گار ہیں، میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں اور اس طرح کے اور بہت سے تیز وتند کلمے جس سے اس کے دل پر چوٹ لگے اور اسے تکلیف پہنچے اور اذیت ہو۔ اس طرح میں اس سے بدلہ لوں۔ مجھے جو پریشانی اور کوفت، الجھن اور بے اطمینانی، حسد، رشک، غصہ، رنج اس کی وجہ سے ہوتا ہے اس کا بدلہ لوں۔ لیکن کبھی مجھے کامیابی نہیں ہوتی۔ (ص۔۲)

'پہلے ایک بات اس نے سنیچر کی شام کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کہا تھا ساڑھے سات بجے آئے گی۔ چھ بجے تک اسے دفتر میں کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد گھر جائے گی اور پھر ساڑھے سات بجے تک میرے یہاں پہنچے گی۔ ساڑھے سات بجے سے آٹھ بجے اور آٹھ سے نو اور نو سے دس، میں کھانا کھانے بھی نہیں جاسکا۔ انتظار، انتظار۔ دس بجے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ، غصے کے مارے میں نے جواب تک نہیں دیا کہ 'ہاں چلے آؤ' دروازہ کھلا، کون؟ وہ نہیں بلکہ خادمہ 'مسٹر اعظم! آپ سے کوئی ٹیلی فون پر بات کرنا چاہتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرے جسم کا سارا خون ایک لمحے کے لیے دوڑ کر میرے سر میں پہنچ گیا۔ گرم گرم خون'۔ (ص ۲،۳)

اعظم کی اس خود کلامی میں بظاہر تو صرف ایک ہی بات کی تکرار محسوس ہوتی ہے یعنی یہ کہ وہ جمین کی وعدہ خلافیوں (برائے ملاقات پر اپنا خون کھولا رہا ہے، لیکن بین السطور اعظم اور جمین کے معاشقے کی نوعیت، جمین کا اسے جان بوجھ کر آزمائش میں ڈالنے کی ترکیبیں، اس کے جواب میں اعظم کا بار بار اسے نظرانداز کرنے کا عزم، یہ سب کچھ جو بیانیہ میں ایک پورے باب کا مواد رکھتا

ہے، چند سطریں یا چند منٹوں کی خاموش خودکلامی میں سمٹ آیا ہے۔

اتنی بات تو ہم آپ کے تجربے کی بھی ہے۔ ہم جب فرصت کے اوقات میں یا کسی واقعے یا حادثے کے زیر اثر خیالات کی گرفت میں ہوتے ہیں تو خیالات کی رو ایک ہی رُخ میں نہیں چلتی۔ آگے پیچھے کی بہت سی باتیں یاد آتی چلی جاتی ہیں۔ تکنیک زیر بحث میں یہ مقام مشکلات پیدا کرتا ہے کہ لکھنے والا ذہن کی اس منحنی اور کاوے کاٹتی ہوئی اس چال کو کس طرح قلم کی گرفت میں لے۔ خیالات کی ادلتی بدلتی ہوئی ان کیفیتوں کے مطابق بلا فاصلہ دیے ایسے الفاظ بھی انتخاب کرے جو ان کیفیتوں کو ظاہر کرتے چلے جائیں۔ ایسے ہی مشکل مقامات میں تلازمِ خیال کی تکنیک مصنف کی مدد کو آگے بڑھتی ہے۔ سجاد ظہیر بھی اس ناول میں ایسے ہی کئی ایک مشکل مقام سے گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک مثال (پھر) اعظم کے خیالات کی رو اور خودکلامی کی ناول کے باب چہارم میں ہے۔ یہ خاصی طویل رَو ہے اس لیے اس کو پورا تو پیش نہیں کیا جاسکتا، البتہ چند اہم موڑوں کی صرف نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ کہ کس طرح سے تلازمِ خیال کی رَو آڑی ترچھی چلتی ہے، کس طرح سے ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف جست لگاتی ہے۔ اصل سچویشن یہ ہے کہ راؤ اور اعظم، نعیم کی پارٹی سے واپس باتیں کرتے ہوئے آرہے ہیں پھر وہ ایک مقام پر پہنچ کر جدا ہوتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے ہیں۔ اب اصل بات چند اقتباسات کی شکل میں دیکھیے۔

'اعظم نے اپنے کمرے میں پہنچ کر گیس جلائی۔ ٹوپی اتار کر پلنگ پر پھینکی اور بغیر اوورکوٹ اتارے آتش دان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے کی وجہ سے کوئی چیز اچھی طرح دکھائی نہیں دے رہی تھی...... اس تاریکی میں اعظم کو ان گلیوں کا خیال آیا۔ ہندوستان کے شہروں کی گلیاں۔ دلّی، لکھنؤ اور بنارس جن میں رات کو بالکل تاریکی رہتی تھی...... 'ایک مرتبہ رات گئے میں اپنے دست کے ساتھ چوک جا رہا تھا۔ بالکل اندھیرا تھا...... چلتے چلتے ایک طرف روشنی دکھائی دی...... ادھر جو نظر پڑی تو دیکھا دو بڈھے ایک تخت پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں...... اور ان کے سامنے شطرنج بچھی ہوئی ہے...... اس وقت اعظم کو ان دونوں کا خیال کر کے کچھ

خوشی ہوئی۔ یہ کس بات کی خوشی تھی؟ ایک پرانی یاد جس پر منوں خاک پڑی ہوئی تھی۔ اس وقت کیوں اس کے ذہن میں جاگ اٹھی؟ پھر اسے اپنے دوست کا خیال آیا جو اس کے ساتھ تھا...... اس کا نام تھا بشمبھر۔ اس کی شادی تو اسی وقت ہو گئی تھی۔ اب اس کے بچے بھی ہوں گے...... بشمبھر کے بیوی اور بچے ضرور تکلیف میں ہوں گے۔ آج کل بے روزگاری کتنی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا کیا انجام ہوگا؟ میرا کیا انجام ہوگا......؟ اسے اپنی چھوٹی بہن کا خیال آیا جس کا سن کوئی بارہ برس کا ہوگا۔ اس ہفتے گھر سے اس کا خط آیا تھا۔ جس میں لکھا تھا ہم سب کو آپ کے آنے کا بڑا انتظار ہے امی بھی ہر وقت آپ کی کامیابی کی دعا کیا کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ انہوں نے آپ کے لیے بڑی اچھی سی دلہن چنی ہے اس کا خیال پھر آج شام کے واقعات کی طرف گیا۔ اور پھر اسے اپنی محبت کی ابتدا یاد آئی......'
(ص: ۱۰۳، ۱۰۵)

آپ نے دیکھا کہ چند منٹوں کے دورانیے کے اس خیال کی رو میں کتنے منظر بدلے ہیں۔ کیسے ایک سچویشن سے ذہن دوسری طرف رُخ کر لیتا ہے۔ حال سے ماضی، ماضی سے ایک دم مستقبل، پھر ماضی اور پھر لمحہ موجود، کیسے کیسے اچانک موڑ آتے ہیں اور پھر آخر میں تو یہ سب کچھ نیند کے غلبے کی وجہ سے گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کتنی خوبصورت سچویشن ہے۔

'جین! تم یہاں کہاں؟ تم اور پیرس؟ آج تمہیں میرے پاس آنے کی چھٹی کیسے مل گئی؟ کیا میری امی جان کے ڈر کی وجہ سے میرے پاس نہیں آئی تھیں؟ بے وقوف لڑکی!...... آؤ شطرنج کھیلو گی میرے ساتھ! یہ باجہ کتنے زوروں میں بج رہا ہے۔ مجھے پسند نہیں...... اب تم واپس تو نہ جاؤ گی؟ یہیں رُک جاؤ۔ اب کبھی میرے پاس سے نہ جانا...... یہ میری چھوٹی بہن ہے۔ اس سے تو مل لو۔

دیکھیے کہاں لندن، کہاں ایک دم سے پیرس...... ہندوستان میں رہنے والی ماں اور بہن اور

جین سب ایک دَم سے پیرس میں...... لکھنؤ کی تاریک گلی میں رات کو کھیلی جانے والی شطرنج، نعیم کی پارٹی میں بجنے والا باجہ (یعنی پھر لندن واپسی) اور پھر یکا یک ہندوستان جہاں اعظم کی بہن رہتی ہے۔ جین کو اس سے مل لینے کی تاکید کرتا ہے...... سب کچھ واضح طور پر سامنے ہے۔ اس پر کیا حاشیہ آرائی کی جائے حقیقتاً نہ اس صورتِ حال کی وضاحت ضروری ہے اور نہ حاشیہ آرائی۔ البتہ اس عمل کی سائنسی توضیح کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے۔

وقت اور جگہوں کے اس تیز رفتار ادغام کو انسانی ذہن میں ماہرین نفسیات نے آزاد مانا ہے اور اسے Free transformation کہا ہے۔ اس آزادانہ ادغام کی بنیاد دراصل انسانی ذہن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ وقت اور جگہ کی قید سے بے نیازانہ کبھی وقت کے حوالے سے جگہ اور کبھی جگہ کے حوالے سے وقت کے درمیان آزاد تعلق Free associations قائم کرتا رہتا ہے، چنانچہ اس آزاد تلازمہ ذہن Mental free associations کے عمل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھنے والوں نے شعور کے سفر اور اس کی خلوت (Movemnt and privacy) کو اس طور پر قلم بند کرنے میں کامیابی حاصل کر لی کہ لمحہ موجود کا آزار اور ماضی کے تجربات میں ایک رابطے کی کیفیت ممکن ہوگئی۔

سجاد ظہیر نے لندن کی ایک رات میں ان تمام عناصر سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ بہت سے نقادانِ فن نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی کہ 'لندن کی ایک رات' کا اختصار، جسے کبھی ایک طویل افسانہ کہا گیا اور کبھی ناولچہ، شعور کی رَو کی تکنیک کے ساتھ دوسری Devices یعنی تلازمہ خیال، خاموش خود کلامی، بلند خود کلامی کے استعمال کے سبب اپنے اختصار میں کتنی وسعت اور پہنائیاں رکھتی ہے۔ اس پہلو پر خاص طور سے توجہ دینے کے لیے وقت اور جگہ کے آزادانہ ادغام کو سجاد ظہیر نے کافی برتا ہے۔ یوں بھی جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ کردار کے ذہن یا شعور کی رَو میں اشاروں، کنایوں اور جھلکیوں کے سبب جو اختصار اور پڑھنے والے کے چشمِ تصور اور ذہن کے ساتھ ساتھ سفر کی بنا پر اس اختصار میں جو پھیلاؤ ہوتا ہے وہ بیانیہ میں ناول اور کہانیوں میں منظر کشی، کردار نگاری اور واقعات کی تفصیل وغیرہ کی طوالت کی کمی کو پورا کرتا ہے اس لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ شعور کی رَو میں لکھے جانے والے ناول بھی بیانیہ کی طرح طویل اور دبیز ہوں۔

'لندن کی ایک رات' میں لمحہ موجود کی معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی اور سیاسی فضا سے لے کر ماضی کے طویل عرصوں بلکہ مدتوں تک کی ان ہی کیفیات اور حالات کو سامنے لایا گیا ہے۔ لندن ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ کے حوالے سے بیک وقت برطانوی سامراج کی چیرہ دستیوں اور ان کی تعلیم و تہذیب کے پھیلاؤ کے اچھے اور برے یعنی مثبت اور منفی اثرات کا اشاریہ بنتا ہے۔ اگر صفحات کی محدود تعداد کے باوجود ہم یہ سب کچھ جان کر اٹھتے ہیں تو پھر سجاد ظہیر کے اس ناول کی اور خود ان کی اپنی کامیابی میں شک و شبہے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

اور اب آخر میں سجاد ظہیر کا جیمس جوائس کے ناول یولی سس پڑھ کر 'لندن کی ایک رات' لکھنے والی بات اور اس کی مماثلت۔ اس ناول کے تکنیکی جائزے کے آغاز میں کئی ایک نقادانِ گرامی کی تحریروں سے اقتباسات آپ کی نظروں سے گزر چکے ہیں۔ اگر چہ ان اقتباسات سے ناول کے ڈھانچے، نفسِ مضمون، پس منظر کے محرکات یا اس کی فنی خوبیوں اور خامیوں کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا (حالانکہ بہت سے ناولوں پر ان میں سے کئی ایک کتابوں میں خاصی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے) لیکن ایک بات ان سب میں مشترک ہے جسے بہت کھل کر علی عباس حسینی صاحب نے کہا ہے کہ 'سجاد ظہیر نے یہ ناولچہ جیمس جوائس کا یولی سس دیکھ کر لکھا ہے۔ وہاں ڈبلن کا ایک دن تھا یہاں لندن کی ایک رات ہے۔ وہ تحت الشعور کی انسائیکلوپیڈیا ہے، یہ جیبی ڈکشنری'۔

خط کشیدہ الفاظ میں کہی گئی باتیں بلاشبہ غیر متنازعہ ہیں۔ البتہ محض ڈبلن کے دن اور لندن کی رات کے حوالے سے یہ حکم لگا دینا کہ جیمس جوائس کا یولی سس دیکھ کر لکھا ہے، ذرا غور طلب بات ہے۔

'لندن کی ایک رات' ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ جوائس کا یولی سس فرانسیسی میں تو ۱۹۲۲ء میں شائع ہو گیا تھا، لیکن انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ ۱۹۳۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس لیے کہ جوائس کی فحش نگاری پر امریکہ اور برطانیہ میں ۱۹۳۱ء تک اس ناول کی اشاعت پر پابندی رہی۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ کیا ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک کے دوران میں شعور کی رو کی تکنیک میں شائع ہونے اور شہرت پانے والا واحد ناول یہی ہے؟ یا یہ کہ جیمس جوائس ہی ان دنوں اس تکنیک میں لکھنے والا اکیلا ناول نگار تھا؟

ان دونوں سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ جیمس جوائس سے بہت پہلے ہنری جیمس اور ڈورتھی رچرڈسن اور اس کے تقریباً ساتھ کی لکھنے والی ورجینیا وولف اس ہی تکنیک کے لکھنے والوں کی حیثیت سے جوائس کے ہم عصر اس سے کم مشہور نہیں تھے۔ پھر جوائس سے بہت پہلے ہنری جیمس کے ناول تو آ ہی چکے تھے۔ یولی سس سے قبل ڈورتھی کے تین ناول (پوائنٹڈ روف ۱۹۱۵ء، بیک واٹر ۱۹۱۶ء اور ہنی کومب ۱۹۱۷ء) آ چکے تھے اور فرانسیسی زبان میں یولی سس کے عین قریب یعنی ۱۹۲۳ء کے بالکل اوائل میں اس کا چوتھا ناول 'ری وال ونگ لائٹ' بھی شائع ہو چکا تھا۔ اس طرح سے ورجینیا وولف کے چار ناول (مسز ڈیلووے ۱۹۲۵ء، ٹو دی لائٹ ہاؤس ۱۹۲۷ء، اور لینڈو ۱۹۲۸ء اور دی ویوز ۱۹۳۱ء) 'لندن کی ایک رات' سے قبل شائع ہو چکے تھے۔ سجاد ظہیر کے متعلق یہ بات ان کے سب ہی دوستوں اور جان پہچان والے اصحاب کہتے اور لکھتے رہے ہیں کہ وہ بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کے بہت شوقین تھے اور ان کا یہ شوق مطالعہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی رہا، چنانچہ یہ تو کسی صورت قرین قیاس نہیں کہ انھوں نے صرف ایک ہی جدید ترین طرز کا ناول یعنی یولی سس پڑھ کر آگے مطالعہ بند کر دیا ہو اور اس کی تقلید میں ایک ناول خود بھی لکھ دیا۔ بہت محتاط انداز میں بھی اگر ان کے مطالعے کو محدود کیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہنری جیمس اور ڈورتھی رچرڈسن کو نظر انداز کر دیا ہوگا، لیکن ورجینیا وولف کے ناولوں کا نہ پڑھنا قرین قیاس نہیں بنتا۔ خاص طور پر اس لیے کہ اس طرز کی ناول نگاری میں جیمس جوائس کے بعد ورجینیا وولف کا نام دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ آیئے اب اصل بات کریں۔

اتنی بات تو صحیح ہے کہ تکنیک اور وقت کے دورانیے میں ایک رات اور ایک دن، سے تو یولی سس، اور لندن کی ایک رات، کا ظاہری رشتہ قائم ہوتا ہے لیکن اگر یہی ایک دن، کا قصہ سجاد ظہیر کے لیے محرک بنتا فرض کر لیا جائے تو یولی سس، کے انگریزی زبان کے ترجمے کی اشاعت ۱۹۳۲ء سے بہت پہلے ورجینیا وولف کے ناول مسز ڈیلووے (۱۹۲۵ء) میں ایک دن، کا قصہ کیوں محرک نہیں ہو سکتا؟ سجاد ظہیر ۱۹۲۷ء میں لندن میں پہنچ چکے تھے۔ یولی سس انگریزی زبان میں شائع نہیں ہوا تھا اور انہیں ان دنوں فرانسیسی زبان آتی نہیں تھی۔ مسز ڈیلووے ابھی زیادہ پرانا نہیں ہوا تھا اور شعور کی رو کی تکنیک میں لکھے جانے والے اس ناول کی بہت دھوم تھی۔ یہ سب حقائق کس

بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟ کیا کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

دوسری اہم بات مسز ڈیلووے کے حوالے سے یہ ہے کہ اس کا ڈیزائن Form وہی ہے جس ڈیزائن پر لندن کی ایک رات لکھا گیا ہے یعنی دوستوں کی پارٹی۔ یولی سس میں کہیں دور دور بھی پارٹی کا ذکر نہیں ہے۔ فرق اتنا ہے کہ مسز ڈیلووے کی کہانی صبح سے شام تک دوسرے دن ہونے والی دوستوں کی دعوت کی تیاریوں کے ساتھ چلتی ہے اور لندن کی ایک رات دعوت کے شروع ہونے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کے اختتام کے بعد شیلا گرین کی کہانی کے ساتھ ساتھ صبح ہونے تک جاری رہتی ہے۔ جبکہ مسز ڈیلووے کی کہانی دعوت کی تیاریوں کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ علی عباس حسینی صاحب نے خود ہی ورجینیا وولف کا تذکرہ اہم ناول نگاروں کے ضمن میں کیا ہے اور ان کے ناول مسز ڈیلووے اور جیکبس روم کو انگریزی ادب میں مستقل اضافہ مانے جانے کا تذکرہ بھی کیا ہے اور پھر بھی لندن کی ایک رات، اور ڈیلووے کے بنیادی محرک یعنی دوستوں کی دعوت کی اس مماثلت کو نظر انداز کر کے محض تقلیدی طور پر یولی سس کو آگے بڑھایا ہے۔

اس مماثلت کی اہمیت جو بھی ہو یا بالکل ضمنی سی ہو، اصل بات تو سجاد ظہیر کے ناول کی ہے۔ جستہ جستہ اس باب میں جتنا کچھ اس خاکسار کے بس میں تھا وہ عرض کر دیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اگر اب کچھ کہا جا سکتا ہے تو اس مختصر سے ناول کے وہ اثرات ہیں جو اس نے اپنی اشاعت (۱۹۳۸ء) کے بعد ہمارے ناول اور افسانہ نگاری پر مرتب کیے۔ یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نئی تکنیک کو اردو میں مروّج کرنے میں 'لندن کی ایک رات' کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

مشمولہ عتیق احمد، سجاد ظہیر۔ تخلیقی و تنقیدی جہات، کراچی: اُجالا پبلی کیشنز

ضمیر نیازی

'روشنائی' — ایک جائزہ

سید سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے اوّلین معماروں میں تھے۔ ۱۹۳۶ء میں وہ نوجوانوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ساتھ میدان میں آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو کے علاوہ برِصغیر کی بیشتر زبانوں کے ادیب و شاعر اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ وہ اس کے معمار ہی نہیں بلکہ اپنی ذات سے خود بھی ایک تحریک تھے۔ ان کے عقیدے اور ایمان کی پختگی کا یہ عالم تھا کہ اس راہ میں بہت سے نشیب و فراز آئے۔ بہت سے ساتھی اور دوست راہ کو پُر خار دیکھ کر کنارہ کش ہو گئے۔ لیکن سجاد ظہیر ایک مضبوط چٹان کی مانند اپنی آخری سانس تک اس کارواں کی رہبری کا فرض انتہائی دیانتداری اور ایمانداری کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ اردو داں طبقہ اور خاص طور پر تحریک سے دلچسپی رکھنے والوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے اس کی ابتدا، نمو، فروغ و پھیلاؤ کی داستان لطیف کو بہت ہی سادہ اور دلکش انداز میں قلم بند کیا۔

روشنائی کے ابتدائی صفحات میں سجاد ظہیر نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے

• ضمیر نیازی مرحوم کا یہ مضمون دراصل ان کے ایک بڑے مضمون 'جائزوں کا جائزہ' کا حصّہ ہے۔ جس میں انہوں نے ترقی پسند ادب اور تحریک کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کا جائزہ لیا ہے۔ ہم نے اس مضمون میں سے 'روشنائی' پر لکھے گئے حصے کو اس کتاب میں شامل کرلیا ہے اور اس کی سرخی بھی خود قائم کی ہے۔ ضمیر نیازی کا اصل مضمون 'پاکستانی ادب' کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

ربع اوّل میں برِ صغیر کی معاشی اور اقتصادی بدحالی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے اندرونِ ملک مختلف تہذیبی و ثقافتی رجحانات کی نشاندہی کرنے کے بعد ان دو نظریات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ جن میں سے ایک بدیسی سامراج کا پھیلایا ہوا تھا، جبکہ دوسرا نظریہ محبِ وطن ہندوستانیوں کا تھا جو انگریز دشمنی پر مبنی تھا یا ایسے نظریات پر مشتمل تھا جو انگریزی سامراج کا کلی طور پر مخالف نہ ہونے کے باوجود سماجی نظام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہندوستانی معاشرے کو پستی سے نکالنے کا دعوے دار تھا۔ اس نظریے کے حامی سماج میں اصلاح کے خواہاں تھے۔

ان اصلاحی تحریکوں (سرسید اور برہمو سماج، جن میں جدید تعلیم کا حصول بھی شامل تھا) پر تبصرہ کرتے ہوئے سجاد ظہیر لکھتے ہیں 'شعوری طور پر یہ لوگ انگریزی سرکار کا دم بھرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی کاوشیں ترقی پسندی کا پہلو لیے ہوئے تھیں۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ ہم گزشتہ عہد کی مذموم توہم پرستیوں، تقلید کا رونا رونے کی عادت، سستی اور انتشار پسندی کو ترک کر کے جدید طریقے سے سوچنا اور کام کرنا سیکھیں، اور جدید زمانے میں جدید انسان بنیں' (ص۔۸۰)۔ اسی کے ساتھ ہی انہوں نے مذہبی احیا پرست طبقے کے ان تضادات پر بھی روشنی ڈالی ہے جو نیک نیتی اور خلوص کے باوصف ان تحریکوں کو رجعت پرستی سے ملاتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے اُن تاریخی عوامل پر تفصیلی اور مدلل بحث کی ہے جنہوں نے ترقی پسند تحریک کو جنم دیا، جو دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے طول و عرض میں اس طرح پھیلی کہ اردو کے ساتھ ساتھ برِ صغیر کی تمام زبانیں اس سے متاثر ہوئیں۔ سجاد ظہیر کا خیال ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں باشعور اور ترقی پسند قوتوں نے ظلم و جبر، تاریکی و جہالت، مکر و فریب لوٹ و استحصال، کھوکھلی روحانیت و مقدر پرستی، رجعت پرستی و دقیانوسیت، سرمایہ داری اور شخصی استبداد کے لیے کسی قسم کا اعتذار تلاش نہیں کیا بلکہ کھلم کھلا ان عفریتوں کے خلاف نبرد آزما رہی ہیں۔

اس جہاد میں ترقی پسند قوتوں کے سب سے موثر اور قیمتی ہتھیار عصری آگہی، ماضی کی مستحسن روایتیں اور عظیم و صحت مند تہذیبی ورثہ رہے ہیں۔

ترقی پسندی کے ایسے مثبت اور صحت مند نظریہ کو پیش کر کے انہوں نے ان تمام اعتراضات بلکہ یوں کہا جائے کہ تمام الزامات کا جواب دے دیا جو تحریک کی ابتدا سے آج تک مختلف پیرایوں

میں دھرائے جا رہے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ تھا کہ تحریک ملک کی پیداوار نہیں ہے بلکہ وہ ایک بدیسی مال ہے۔ دوسرا الزام یہ تھا کہ ترقی پسند مصنفین ہمارے مشرقی تمدن، اخلاق واقدار اور اس کے تمام فنی مظاہروں کو رد کر دینا چاہتے ہیں۔ ان دونوں الزامات کا جواب سجاد ظہیر کے ایک جملہ میں پوشیدہ ہے کہ جو تحریک ماضی کی مستحسن روایات اور صحت مند تہذیبی ورثے کی امین ہو وہ نہ تو غیر ملکی ہو سکتی ہے اور نہ تہذیبی میراث کو مسترد کر سکتی ہے:

'یہ صحیح نہیں ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کسی بیرونی یا دشمن طاقت کے اشارے پر ہمارے ملک میں جاری کی گئی ہے۔ وہ ادب کی ایسی تحریک ہے جس کی بنیاد حب الوطنی، انسان دوستی اور آزادی پر ہے۔ اس کا مقصد ہرگز ہمارے پرانے تمدن اور اخلاق اور ان کے ادبی مظاہروں کو مسترد کرنا نہیں، وہ اس ملک کی تہذیب کے بہترین عناصر کو زندہ کرنے اور اُجاگر کرنے اور ان کی بنیاد پر نئی زندگی کے حالات کے مطابق پرانے تمدن کے خمیر سے نئے اور بہتر ادب، فنونِ لطیفہ اور کلچر کی تعمیر کی کوشش کرتی ہے'۔ (ص ۱۵۰)

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں سجاد ظہیر نے تحریک کے مخالفین کے الزامات کے مدلّل اور مبسوط جواب دیئے ہیں، وہیں انہوں نے تحریک کی خامیوں پر بھی کھل کر بحث کی ہے اور ان انتہا پسند ساتھیوں کے غلط رجحانات پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ 'جن کا جھکاؤ مصلحت کے نام پر اپنے بنیادی اصولوں کے بدلنے کا یا کم از کم عارضی طور پر انہیں چھوڑ دینے کی طرف تھا' (ص ۱۵۰)۔

۳۶ء یا اس کے آس پاس ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنے ایک مضمون 'ادب اور زندگی' میں قدیم ادب کے متعلق انتہا پسندانہ رویہ اختیار کر کے تقریباً سارے ادب کو تنزل پذیر جاگیری عہد کی پیداوار قرار دے کر معتوب قرار دیا تھا۔ اسی کے ساتھ علامہ اقبالؔ پر فاشستی ہونے کا الزام بھی عائد کیا تھا۔ ۴۸ء میں بنگال کے بھوانی سین نے اپنی اسی انتہا پسندی میں ٹیگور کو رجعت پرست ثابت کر دیا تھا۔ سب سے پہلے عزیز احمد اور اس کے بعد سردار جعفری نے اس انتہا پسندی کی شدید

مذمت کی۔

اس ادبی دہشت گردی کی مذمت کے ساتھ سجاد ظہیر نے اپنے ساتھیوں کی خام کاری، نظریاتی الجھاؤ، اسلوبوں کا کھردرا پن اور علم کی کمی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے انہیں مُلاپن تنگ نظری اور سخت گیری سے اجتناب کی تلقین کی ہے۔ لکھتے ہیں:

'ادب اور فنونِ لطیفہ کے معاملے میں تنگ نظری اور سخت گیری ضرورت سے زیادہ وسیع المشربی کے مقابلے میں زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ یہ بہتر ہے کہ مشتبہ اور ایسی چیزیں جن سے ہم اختلاف بھی رکھتے ہوں شائع کی جائیں اور عام پڑھنے والوں اور نقادوں کو خود ان کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے اور ان پر نکتہ چینی اور تنقید کا موقع دیا جائے بجائے اس کے کہ اختلاف یا ناپسندیدگی کی بناء پر بعض ادیبوں کی تحریروں کو دبایا جائے۔ ادب اور فنونِ لطیفہ میں سنجیدہ احتساب اور تنقید ضروری ہے۔ لیکن آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار اس سے زیادہ ضروری ہے'۔

زندگی بھر وہ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار کے حامی رہے۔ مرحوم اپنے آخری مضمون 'اردو کے ترقی پسند ادیبوں کا سیمینار..... چند تاثرات' (مطبوعہ ماہنامہ کتاب، لکھنؤ بابت جولائی ۱۹۷۴ء) میں لکھتے ہیں:

'ظاہر ہے کہ تمام مقالات کا معیار یکساں نہیں تھا اور نہ بحث میں حصہ لینے والوں کی گفتار کا معیار۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ ان مقالوں اور مباحث سے مجھے اتفاق تھا یا نہیں، بحیثیت مجموعی یہ محسوس کیا جا سکتا تھا کہ سیمینار کا علمی، تحقیقاتی، نظریاتی اور تہذیبی معیار بلند تھا۔ بیشتر مقالے غور و فکر، تفتیش اور محنت سے لکھے گئے تھے..... کچھ ایسے تھے جنہیں سن کر محسوس ہوا کہ زمانہ حال کے اردو ادب، اس کے مختلف نظریاتی رجحانات، ادبی تخلیقات کی خوبیوں اور کمزوریوں کے متعلق ہمیں زیادہ واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ان

مقالوں اور بحثوں کو سن کر یہ بھی احساس ہوتا تھا کہ ادبی نظریات کے تضادات اور مختلف اسالیب اور ہیئتی اختلافات کے تجزیے اور تشریح کے ذریعے ہمارے ادبی شعور میں مجموعی طور سے زیادہ گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی اور نئے جسے ترقی پسند ادب کو نئی نہج سے فروغ اور اسے بہتر بنانے کے لیے خود اعتمادی اور نیا حوصلہ پیدا ہوا۔

ان تجزیوں اور تبصروں سے یہ مقصد اجاگر کرنا ہے کہ تحریک کے سرکردہ رہنما شروع ہی سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ وہ نہ تو کٹ ملّا تھے اور نہ انتہا پسند۔ انہوں نے کبھی بھی حقائق، سنجیدگی اور توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ 'روشنائی' کی ایک ایک سطر اس حقیقت کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتی ہے۔ ان خیالات و نظریات سے ایک ایماندار قاری کو اختلاف تو ہوسکتا ہے لیکن وہ مصنف کے خلوص نیت اور دیانتداری پر شبہ نہیں کرسکتا۔

ترقی پسند تحریک پر اب تک جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں 'روشنائی' اپنا ایک منفرد اور مخصوص مقام رکھتی ہے۔ کیونکہ اسے ایک ایسے شخص نے قلم بند کیا ہے جو اس کے بانیوں میں تھا اور جو آخری سانس تک اس کی قیادت کو احسن طریقے سے انجام دیتا رہا ہے۔ ان کا یہ خیال کہ 'ہماری ادبی تحریکوں کے مورخ کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی'۔ بے جا نہیں ہے۔

'پاکستانی ادب'، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۷ء

زیب النساء

'ذکرِ حافظ'۔ ایک مطالعہ

عملی تنقید کے سلسلے میں سجاد ظہیر کی سب سے اہم تصنیف 'ذکرِ حافظ' ہے جسے سجاد ظہیر نے پاکستانی جیل کے ایامِ اسیری میں لکھا تھا۔ یہ کتاب پاکستان کے مچھ جیل بلوچستان میں جون۔ جولائی ۱۹۵۴ء میں مکمل ہوئی۔ 'ذکرِ حافظ' فارسی کے بلند پایہ مشہور شاعر خواجہ حافظ شیرازی کی شاعری پر تنقیدی مقالہ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اس مضمون کو بھی شامل کرلیا ہے جو انہوں نے ظ۔ انصاری صاحب کے مضمون 'غزل باقی رہے گی' کے جواب میں تحریر کیا تھا۔ ظ۔ انصاری صاحب نے سعدی اور حافظ کی غزل گوئی پر سخت اعتراضات کیے گئے تھے سجاد ظہیر نے ان اعتراضات کا جواب دیا جو سہ ماہی 'شاہراہ' ۱۹۵۵۔۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا ایک مختصر حصہ انہوں نے 'ذکرِ حافظ' میں شامل کرلیا ہے۔

'ذکرِ حافظ' سجاد ظہیر کی خالص تنقیدی کتاب ہے جس میں انہوں نے اپنے تنقید کے بنیادی اصولوں کے ذریعے حافظ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اس کتاب کے تنقیدی رویے میں سجاد ظہیر کی

پیش نظر مضمون زیب النساء صاحبہ کی کتاب 'سجاد ظہیر۔ حیات وخدمات' کے ایک حصے پر مشتمل ہے۔ مذکورہ کتاب مصنفہ کے اس تحقیقی مقالے پر مشتمل ہے جس پر ان کو الٰہ آباد یونیورسٹی نے ڈی فل کی ڈگری تفویض کی تھی۔ یہ کتاب اپریل ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی۔ مصنفہ خود ہی اس کی ناشر بھی ہیں۔ یہ مضمون مصنفہ کے ایک طویل باب 'سجاد ظہیر ادیب وناقد کی حیثیت سے' کے 'ذکرِ حافظ' سے متعلق صفحات پر مشتمل ہے۔ (مرتب)

نظریاتی اساس، ان کے نظریے کی وسعت دونوں ہی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان رویوں کی جھلک جدید ادب کی تنقید اور خصوصاً غزل سے متعلق مضامین میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے سجاد ظہیر ہمیشہ سے اس امر کے سختی سے پابند رہے کہ ماضی کے ادبی ورثے کی تنقید و تجزیے کے سلسلے میں اس عہد کے مروجہ اقدار و روایات تاریخی و معاشرتی حالات کو مدنظر رکھنا ناگزیر ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں اگر اس تقاضے کو نظر انداز کر دیا جائے اور آج کے دور کے معیار و روایات کے تحت ماضی کے ادب کی جانچ پرکھ کی جائے تو وہ اس ادب کے لیے ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے اس نظریے پر خود بھی سختی سے عمل کیا ہے۔ اپنے مضامین اور دیگر تخلیقات میں انہوں نے قدیم شعرا کی تخلیق یا فنکار کی ادبی وراثت کا جائزہ لیتے وقت اس کے عہد کی مروجہ روایات تاریخی، معاشرتی حالات اور اقتصادی و سیاسی مسائل کو مدنظر رکھا ہے۔

چونکہ اس وقت کئی ترقی پسند ادیب و نقاد ایسے تھے جنہوں نے ماضی کے ادب پر تیکھے طنز کیے۔ انہیں فراری بتایا۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک خطبۂ صدارت میں میرؔ کی شاعری کو فراری بتایا۔ اس کے مطالعے کو بے سود قرار دیا۔ دوسرے خواجہ احمد فاروقی کی کتاب 'مثنوی زہر عشق' مرزا شوق لکھنوی پر ہنس راج رہبر نے تنقید کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ یہ مثنوی جاگیردارانہ عہد کے زوال پذیر تمدن کی نشانی اور عشق و عاشقی کی داستان سرائی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کا جواب سجاد ظہیر نے 'غلط رجحان' کے عنوان سے دیا تھا جو 'شاہراہ' (فروری۔ مارچ ۱۹۵۱ء) میں شائع ہوا۔

> 'یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بیدی اور رہبر جیسے حساس اور انسان دوست ادیب آج ترقی پسندوں کے پلیٹ فارم پر سے ایسے کلمے کہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ماضی کی زندگی اور انسانیت سے بھرپور عشقیہ شاعری کو پسند نہیں کرتے۔ اس سے متاثر نہیں ہوتے اس سے مستفید نہیں ہوتے اس کو بیکار اور نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم ماضی کے عظیم ورثے کو مسترد کرتے ہیں۔ ہم نامکمل ہیں۔ بے حس اور مجہول رکھے جانے پر قانع ہیں بظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر غلط ہے اور ترقی پسند اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے تمام رجحانات کے خلاف

جدوجہد کرنی چاہیے۔'[1]

اسی قسم کے خیالات کا اظہار ممتاز ادیب ظ۔ انصاری نے اپنے مضمون 'غزل باقی رہے گی' میں کیا تھا۔ ظ۔ انصاری نے حافظ کی شاعری پر جو الزامات عائد کیے تھے ان کی صورتِ حال کچھ اس طرح تھی۔

۱۔ حافظ نے علم و فلسفے کی راہ ترک کر دینے کی ترغیب دی ہے۔

۲۔ زاہد و مشائخ پر حافظ کا طنز استہزا ہے۔

۳۔ ان کے یہاں زندگی سے فرار پایا جاتا ہے۔

۴۔ ان کے یہاں زندگی کا مقصد صرف عیش کوشی و سرمستی ہے۔

ظ۔ انصاری سے قبل بھی لوگوں نے حافظ پر الزام تراشی کی تھی لیکن جب ظ۔ انصاری جیسے بلند پایہ نقاد کا مضمون سجاد ظہیر جیسے باشعور مارکسی نقاد کی نگاہوں سے گزرا تو وہ ان الزامات کو برداشت نہ کر سکے اور ایک طویل مقالہ سپردِ قلم کر دیا۔ حافظ پر لگائے گئے الزامات کا مدلل اور مفصل جواب تحریر کیا جو ستمبر ۱۹۵۶ء میں 'ذکرِ حافظ' کے نام سے 'انجمن ترقی اردو ہند' علی گڑھ کی طرف سے شائع ہوا جو کتابی صورت میں تھا۔

سجاد ظہیر نے ماضی کے ادبی ورثے کو جانچنے پرکھنے کے لیے جو ادبی معیار قائم کیے وہ انہیں کی تحریروں میں اس طرح ہیں۔

> 'شاعر کے عقائد، اس کا فلسفہ، اس کا نظریہ حیات اپنے زمانے اور اپنی قوم کے عقائد، علم اور فلسفے سے مربوط ہوتا ہے۔ پھر اس پر اپنے مخصوص طبقے اور گروہ کی چھاپ بھی ہوتی ہے۔ اس کے لیے یہ تو ممکن ہے کہ اپنے عہد کے بہترین اور بلند ترین خیالات، احساسات و حقائق اور زندگی کے تعلقات اور رشتوں کا سچا اور موثر ترین اظہار کرے لیکن اس کے تخیل کی سب سے اونچی پرواز بھی اس حد سے باہر نہیں ہو سکتی۔'[2]

اسی سلسلے میں آگے لکھتے ہیں:

> 'چنانچہ بہتر ہے کہ ہم جب دورِ وسطیٰ کے کسی مفکر خاص طور سے کسی شاعر کی

فکر کا تجزیہ کریں تو اس کے یہاں تصوف، اصطلاحات اور صوفیانہ طرزِ خیال
کو ہی دیکھ کر اس پر زندگی سے فرار کے نظریے کے پیرو یا رجعتی ہونے کا حکم
نہ لگا دیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم بالتفصیل اس کے کلام کا مطالعہ کریں
اور دیکھیں کہ آیا اس کا مجموعی تاثر منفی یا فراری ہے۔ یا شاعر نے اپنے
زمانے کے حقائق اور اس کے حسن و قبح کو اس طرح دیکھا اور سمجھا ہے، جس
سے ہمارے موجودہ شعور میں اضافہ ہوتا ہے اور ہماری تہذیب دماغ کے
ذریعے سے زندگی میں ہماری دلچسپی کو بڑھاتا ہے اور ہماری روح کو
جہدِ حیات میں حصہ لینے کے لیے زیادہ متوازن اور مستعد کرتا ہے۔'[3]

سجاد ظہیر کا یہ نقطہ نظر ان کی وسیع النظری اور ترقی پسندی کی بہترین عکاسی کرتا ہے اور ان کے اشتراکی اور مارکسی نقطہ نظر کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ ظ۔ انصاری نے حافظ شیرازی پر فراریت اور عیش کوشی کا الزام عائد کرتے ہوئے تحریر کیا:

'حافظ کی غزلوں میں وہ لذت پرمبنی بے ثباتی عالم، داخلیت، فرار اور زندگی
کی تاریکیوں کو جام عیش میں ڈبو دینے کا جذبہ رچا ہوا ہے جو خود حافظ کی
زندگی میں رچ بس گیا تھا اور جو اس وقت تک ملک کے کسی شاعر کے
یہاں اتنا حسین و دلکش بن کر نہیں آیا تھا۔'[4]

سجاد ظہیر اس بات سے اختلاف کرتے ہیں وہ حافظ کی شاعری کو فراریت پسند، لذت پرست اور داخلیت سے بھرپور شاعری ماننے پر ہرگز تیار نہیں بلکہ ان کا خیال ہے:

'فرسودہ اور جدید رجعتی عقائد، سوچنے اور سمجھنے کے طریقوں، عادتوں اور
رجحانات کو ترک کیے بغیر ہم میں وہ نئی سمجھداری اور حقیقت کے مشاہدے
کی صلاحیت نہیں آسکتی جو فراریت، داخلیت اور لذت پرستی کا الزام لگا کر
اپنے تہذیبی ورثے کے اس انمول رتن کو ماضی کی بہت سی ان چیزوں کے
ساتھ جو آج ہمارے لیے بے مایہ اور مضرت رساں ہیں، کوڑے کے ڈھیر
پر پھینک دینے میں ظ۔ انصاری نے غلطی کی ہے۔'[5]

سجاد ظہیر کا خیال ہے کہ ظ۔انصاری نے حافظ کا کلام سمجھنے میں دو اہم غلطیاں کی ہیں، اول تو یہ کہ انہوں نے حافظ کے کلام کا رس نچوڑنے میں جو راہ اختیار کی وہ غیر ادبی اور غیر علمی ہے۔ دوسرے یہ کہ تاریخ کے علمی، سائنسی اور طبیعاتی نظریے کو حافظ کے زمانے کے عصری تقاضوں اور ان سے پیدا ہونے والے نظریوں اور فن پر غلط طریقے سے منطبق کیا ہے اور سماجی و مادی حالات اور فنی تخلیق کے درمیان جو رشتہ ہے اسے غلط اور میکانکی طریقے سے سمجھا ہے۔ ظ۔انصاری نے حافظ پر یہ الزام تراشا کہ انہوں نے علم و فلسفے کی راہ ترک کر دینے کی ترغیب دی ہے اور اس طرح اس نے حصولِ علم سے انکار کر کے منفی رویے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن سجاد ظہیر نے اس نقطہ نظر کو غلط ثابت کیا اور کہا:

'حافظ کو علم و خرد، نیز حکمت پر اعتراض نہیں بلکہ وہ اپنے عہد کے خاص قسم کے علماء اور ان کی عقل اور ان کی حکمت کو ناکارہ گمراہ کن سمجھتا ہے'۔[6]

سجاد ظہیر نے جن مخصوص قسم کے علما کا جو حوالہ دیا ہے اس سے ان کی مراد وہی ہے جو انہیں کے لفظوں میں اس طرح ہیں۔

'سید علی ہجویری داتا گنج بخش نے ''کشف المحجوب'' میں کی ہے۔ یعنی جو کوئی صرف عبارت ہی کو یاد کرنے میں مشغول رہے اور اس کے معنی کو یاد نہ کرے اس کو عالم کہتے ہیں اور اس ہی وجہ سے لوگ اس گروہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں'۔[7]

سجاد ظہیر نے حافظ کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ حافظ کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حافظ نے اپنے عہد کے خاص علما اور ان کی عقل و حکمت کو ناکارہ اور گمراہ کن بتایا ہے۔ حافظ نے تمام علم یا تمام علما پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے ان لوگوں کو اپنا نشانہ بنایا تھا جو دین و فقہ کا مقدس لبادہ اوڑھ کر اور عبادت و ریاضت کی نقاب چہروں پر ڈال کر شکم پروری، خود پرستی، خود بینی میں غرق تھے اور علم و حکمت، تقدس و پاکیزگی کے ڈھونگ کو عوام الناس کو دھوکہ دینے اور لوٹنے کا ایک وسیلہ بنالیا تھا۔ ان تمام باتوں کو سجاد ظہیر نے حافظ کے کلام سے مثالیں دے کر اور تاریخی شواہد کے ذریعے سے ثابت کیا کہ حافظ کا غالب رجحان داخلیت اور

عیش پرستی کی جانب ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں ظ۔ انصاری نے ان اصطلاحوں میں استعمال کیا ہے۔

کلامِ حافظ میں اس قسم کے دنیادار علما کے سلسلے میں انہوں نے حافظ کا یہ شعر پیش کیا ہے:

ریال حلال شمارند و جام و بادہ حرام
زہے طریقت و ملت زہے شریعت و کیش

اپنے عہد کے علما اور دانشوروں پر حافظ کی نکتہ چینی ایک یہ بھی تھی جسے سجاد ظہیر نے یوں تحریر کیا ہے:

'یہ علماء عام طور پر جو کچھ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں وہ لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے اور سچائی کو چھپانے کے لیے ہوتا ہے' لیکن اپنے بارے میں حافظ کا دعویٰ ہے۔

رقم مغلط بر دفتر دانش نہ کینم
سر حق، بر ورق شعبدہ، ملحق نہ کنیم [8]

حافظ نے ریاکار علماء اور دانشوروں کو اپنے سے صرف اس لیے علیحدہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی ریاکاری، دھوکے بازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے یہ لوگ 'بے لوث زندگی' گزارنے والوں کی نجی زندگی میں اپنے زہد و تقویٰ کے جھوٹے مظاہرے کر کے لوگوں کو لوٹتے اور ان پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔

شیخم بہ طنز گفت 'حرام است کے مے مخور'
گفتم 'مگوکہ گوش بہ ہر خر نمی کنم'

سجاد ظہیر کا خیال ہے:

'یہ لوگ دھوکے باز اس وجہ سے ہیں کہ خود وہ تمام باتیں چھپ چھپ کر کرتے ہیں جن سے وہ عام لوگوں کو منع کرتے ہیں'۔ [9]

لیکن حافظ خود اتنے صاف گو ہیں کہ وہ صرف اپنی مے نوشی نہیں چھپاتے بلکہ زاہدوں کی طرح لوگوں کو وعظ و تلقین کرتے ہیں۔

ایں تقویم بس است کہ چوں زاہدان شہر
ناز و کرشمہ برسر منبر نمی کینم

حافظ کے کلام کے بارے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے جسے سجاد ظہیر وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ حافظ نے ان علماء اور دانشوروں کا پردہ فاش کرتے ہوئے یہ بات ظاہر کردی ہے کہ یہ لوگ اہلِ اقتدار اور اہلِ دولت و ثروت سے اس لیے بھی سمجھوتہ کرتے تھے کہ انہیں وظیفہ اور دیگر مالی سہولتیں دستیاب تھیں لہٰذا حکمراں اور جاگیردار سرمایہ دار طبقہ جو ظلم و ستم کرتا، عوام کا مختلف طریقوں سے استحصال کرتا اس میں یہ کسی قسم کا دخل نہ دیتے۔ ان کی ظلم و زیادتیوں کو خاموشی سے دیکھتے اور انہیں صبر کی تلقین کرتے اور کہتے یہ مصائب منجانب اللہ ہے۔ تمہیں صبر کا بدل آخرت میں ملے گا۔ ان کے اس رویئے سے ظالموں اور حاکموں کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں اور یہ ریاکار اپنی جیبیں بھرتے رہے۔ ان کی ان جعل سازیوں کا پردہ حافظ نے بے دردی سے چاک کیا ہے۔

اس طرح حافظ نے اپنے عہد کے حکمرانوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ ان ریاکار علما و دانشوروں کی زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے اور سنجیدگی کے ساتھ اپنے ردِ عمل کا اظہار منطقی اور علمی انداز میں کیا ہے۔ جس کے بارے میں پروفیسر عتیق احمد فرماتے ہیں۔

'سجاد ظہیر نے اپنی نظریاتی اساس اور بصیرت افروزانہ انداز میں قارئین ادب کے سامنے رکھ کر بتا دیا کہ قدیم ادب میں بھی سب کچھ ردی کے ڈھیر پر پھینکے جانے یا تضیعِ اوقات کی بنا پر سوختنی نہیں ہے بلکہ کچھ حقائق اس دور کے ایسے بھی تھے اور کچھ عوامل اور عناصر ان حقائق کے پس پشت محرکات کی صورت میں بھی ایسے تھے کہ آج بھی ذرا سی بدلی ہوئی پیچیدہ شکل میں فعال اور روز افزوں ترقی پذیر ہیں ان عناصر اور عوامل میں مذہبی شخصیتیں، صوفی اور زاہد اور اہلِ اقتدار کے زرخرید مخبر سب ہی ہمیشہ سرفہرست رہے ہیں۔ گویا حافظ کا یہ رویہ ہم ان کی روشن خیالی کی دلیل سمجھ سکتے ہیں اور یوں وہ اپنے عہد کے ایسے عناصر پر توجہ دینے والے باشعور اور عوام دوست فنکار کے طور پر ابھرتے ہیں جو ہمارے عہد کے بہت سے

ترقی پسند شعرا اور بالخصوص جوش کے فنکارانہ رویئے سے مماثلت کی بنا پر
ان کی شاعری کو بھی ہمارے بعض احساسات ونظریات اور جذبات کا
نمائندہ بنا دیتا ہے۔‘[10]

حافظ کی شاعری پر بعض ترقی پسندوں میں خصوصاً ظ۔انصاری نے یہ الزام عائد کیا تھا کہ حافظ زندگی میں عشق و عاشقی اور دیگر رنگ رلیوں مثلاً شراب، کباب، رنگ و نور کی محفلوں کی طرف اپنی شاعری میں لوگ کو ترغیب دیتے ہیں، جو زندگی سے فرار اور صرف تصوراتی دنیا کی دلکشی میں کھو جانے کی ترغیب دیتی ہے لہٰذا وہ مثبت طرزِ فکر کے بجائے منفی طرزِ فکر کے شاعر ہیں۔

سجاد ظہیر اس الزام کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے حافظ کے کلام کی اس خصوصیت پر یعنی 'عیش کوشی'، 'لذت کوشی' پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور بڑے عالمانہ انداز میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے مجہول اخلاق پرستی، ارتقائے تہذیب کا فلسفہ اور عمل، فلسفہ عشق اور عشقیہ شاعری کے حیات 'فروز پہلوؤں کے ساتھ ان ریاکار اور دھوکے باز انسانوں کا ذکر بھی کیا ہے اور داخلیت پسندی کے الزامات کا جواب بھی دیا ہے۔

سرکاری اور درباری مذہبی علما اور دانشوروں کے بارے میں حافظ کا رویہ تنقیدی ہی نہیں بلکہ تمسخرانہ ہے جو اپنے فائدے اور غرض کی خاطر سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرتے۔ اس رویے کی سجاد ظہیر نے کئی جگہ بہترین مثالیں دی ہیں۔

صوفی شہر بیں کہ چوں لقمہ شبہ می خورد
بال و دمش دراز باد، ایں حیواں خوش علف

پروفیسر عتیق احمد صاحب اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

’ریاکار دھوکے باز اور مذہبی احکامات (بالخصوص اوامر اور نہی) کو اپنے سفید مطلب اور دوسروں کے لیے احکامِ الٰہی سے سرتابی ثابت کرنے والے ان مولویوں کے خلاف اوّلاً تو حافظ شیرازی شمشیر برہنہ ہیں لیکن ان پہلوؤں پر سجاد ظہیر کی توجہ ہمیں 'انگارے' (مجموعہ افسانہ جات) کی یاد دلاتا ہے۔ پروفیسر احمد علی، سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر

صاحبان نے عوام کے دلوں اور دماغوں کو ان ریاکاروں کے کالے کرتوتوں سے آشنا کرانے کا کام اپنے مشن کی ابتدا بنائی تھی۔ گویا اس طرح سے جو بات بیسویں صدی کے آغاز میں قدامت پسندی، توہمات اور جھوٹے نمائشی رسم ورواج کو جنم دینے والی قوتوں کے ایک بڑے فعال اور با اثر طبقے (مُلا اور مولوی صاحبان کے اثرات ہمارے معاشروں پر بالراست انداز میں بڑے گہرے رہے ہیں اور آج بھی ہیں ان کی پول کھولنے کے لیے ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے جو لائحہ عمل بنایا تھا عین ساڑھے چھ سو برس پہلے کے سماج میں اس دور کا روشن خیال، حقیقت آشنا، اور غریبوں کے اصلاح احوال کا درد رکھنے والا دانشور بھی اسی انداز میں فکر وعمل کی قندیلیں روشن کر رہا تھا تاکہ جس حد تک بھی ہو سکے اس خود غرض طبقے کی پھیلائی ہوئی تاریکی عوام کے راستوں سے چھٹے اور وہ بھی اپنی راہیں بنانے کے قابل ہو سکیں۔[11]

سجاد ظہیر نے حافظ کے نظریے کو ان کی شاعری کی کیفیت اور اہمیت وافادیت سے اجاگر کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہے۔ حافظ پر لگائے گئے الزامات کی تردید اور ان کے دفاع کی کوشش نہیں کی بلکہ حافظ کے کلام کو ان کے عہد کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور مذہبی اعتقادات کے پس منظر میں دیکھا اور پرکھا ہے اور حافظ کے دور کے شاعروں کے مقابلے ان کے یہاں جو سماجی شعور زیادہ بہتر انداز میں نظر آیا اس کی تفصیل سے بحث کی۔

حافظ کے کلام کی خوبیوں کا جائزہ لیتے وقت اس کی کمیوں اور خامیوں پر بھی سجاد ظہیر کی نظر رہی ہے۔ لیکن ان کی ذاتی اور شخصی خامیوں کو گرفت کرتے ہوئے انہوں نے اس کا تجزیہ ان کے سماجی اور تاریخی تناظر میں کیا ہے۔

سجاد ظہیر نے جس دیانتداری سے کلام حافظ کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے وہ ان کے جرأت قلم اور بے باک طرز اظہار کا بہترین ثبوت ہے۔ جہاں انہوں نے حافظ کے کلام کو ان کے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات اور تہذیبی اقدار کے پس منظر میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ وہیں ان کی

خامیوں کو بے باکی سے بیان کر دیا ہے۔ چونکہ سجاد ظہیر ایک مارکسی نقاد تھے جن کا ایمان ہی مارکسی جدلیت پر تھا اور تاریخی جدلیت پر انہیں پورا عبور حاصل تھا لہٰذا انہوں نے کلامِ حافظ میں کہیں کہیں پر جو انفعالیت کی کیفیت اور غمِ روزگار سے وقتی طور پر فرار کی منفی کوشش جگہ پا گئی تھی اس کو ان کے عہد کا عکاس بتایا ہے۔ حافظ کا عہد ایک انتشاری عہد تھا۔ جہاں افراد بکھرے ہوئے تھے اور اپنے اپنے مسائل میں الجھے ہوئے۔ پھر بھی ایسے ماحول میں حافظ نے جو کوشش کی وہ اپنے دور اور اپنے عہد کے تقاضوں کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔

اس سلسلے میں عتیق احمد کا خیال ہے:

'اور یہ حقیقت بھی لائقِ اعتراف ہے کہ سجاد ظہیر جیسے معہد (کمیٹڈ) مارکسی نقاد نے جس بصیرت، انصاف پسندی اور نقادانہ شعور کے ساتھ حافظ شیرازی کے شعری اثاثے کو کھنگال کر ان کی ذہنی اور شاعرانہ بصیرت کے گرد صدیوں سے پھیلے ہوئے خس و خاشاک کے انبار سے نکال کر اردو ادب کے قارئین سے روشناس کرایا ہے وہ بھی اپنی جگہ اردو تنقید کا ایک لازوال کارنامہ ہے'۔[۱۲]

ذکرِ حافظ کے سلسلے میں شارب ردولوی صاحب کا خیال ہے:

'عملی تنقید کے سلسلے میں ان کی سب سے اہم تصنیف ''ذکرِ حافظ'' ہے جسے اردو میں مارکسی تنقید کا اہم صحیفہ کہا جا سکتا ہے۔ ''ذکرِ حافظ''، حافظ کے کلام کا ایک مطالعہ ہے لیکن اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس سے قدیم شعرا اور خصوصیت سے غزل کے بارے میں ترقی پسند نظریات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ذکرِ حافظ مارکسی نظریاتِ نقد کی عملی تصویر ہے'۔[۱۳]

'ذکرِ حافظ' میں اپنی خلوت گاہِ شوق سے پردہ اٹھایا۔ 'روشنائی' میں اپنی یادداشتیں جمع کیں جو بہت سے نئے پرانے چہروں کا البم ہے۔

ظ۔ انصاری غزل کے خلاف تمہارا مضمون رضیہ نے مجھے بھیجا تو تم جانو جیل میں ہر چیز بڑے غور سے پڑھی جاتی ہے۔ مجھے غصہ آ گیا یہ کہ کفر پھیلایا کرتے ہو؟ غزل کی بہتات سے خیر ہم کو بھی

اُبکائی آتی ہے، لیکن حافظ کے متعلق ایسے سرسری رائے؟ لاحول ولا قوۃ.....'

حافظ کی از سرِ نو دریافت پر میں نے یا میرے مضمون نے اُکسایا ہو یا نہ اُکسایا ہو یہ ان کے درد جدائی کی شدت اور زخموں کی ٹیس ہے جو نعرہ مستانہ میں بدل گئی ہے۔ آدمی کا سانس گہرا اور نگاہ بلند ہو تو فریاد میں لے اور لے میں ایک نشاط بھر جاتا ہے'ذکرِ حافظ' میں وہی فریاد لذتِ نشاط بن گئی ہے۔ حافظ تو وہ اپنے بچپن اور جوانی میں پڑھ چکے تھے۔ پھر یہ کیا کہ سالہا سال گزر جانے پر مغربی پاکستان کی سفاک جیلوں میں پابہ زنجیر گھمائے جانے کے بعد راتوں کے سناٹے میں حافظ نے ان سے رازدارانہ باتیں کیں'۔ [۱۴]

انہوں نے کہا کہ اچھی غزل کو صرف غزل کے دائرے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بہترین نظم غزل سے بہتر بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک صنف کو دوسری صنف کے لیے گردن زدنی قرار دیا جائے۔

'عہدِ حاضر میں ایسی عظیم یا اچھی شاعری جس میں آج کل مکمل ذہنی اور روحانی تسکین ہو غزل کے سانچے میں محدود نہیں کی جا سکتی۔ لیکن بعض لوگ جب ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ گزشتہ چھ سو سال میں فارسی اور اردو غزل کے جو بہترین نمونے ہیں وہ لازمی طور پر عظیم شاعری نہیں ہو سکتے اور یہ کہ غزل ایک صنف کی حیثیت سے بیشتر جاگیری دور کے انحطاط اور افراتفری اور انتشار کی عکاسی کرتی ہے۔ تب میرے خیال میں ہم سخت غلطی کرتے ہیں'۔ [۱۵]

یہ غلطیاں اس وقت سرزد ہوتی ہیں جب مادی اور سماجی حالات اور فنی تخلیق کے رشتے کو غلط سمجھا جائے۔ سجاد ظہیر اس رشتے کو میکانکی طریقوں سے دیکھنے اور پرکھنے کے سخت مخالف تھے۔ وہ اس نظریے کو ترقی پسندوں کی تنگ نظری اور تعصب خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی بھی فنکار کو یا فنی تخلیق کو اس کے ماحول اور اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے حالات کے درمیان ہی

سمجھنا چاہیے۔

ان کا کہنا تھا کہ تضاد ہر فنکار کے یہاں نظر آتا ہے۔ لیکن اگر اس تضاد کو بنیاد بنا کر ان تمام چیزوں سے ہم قطع نظر کرلیں تو اس میں نقصان ہمارا ہوگا۔ اس لیے کہ فنکار کے یہاں اگر صحت مند رجحانات موجود ہیں تو کہیں کسی جگہ روایتی خیالات جگہ پا جاتے ہیں لہٰذا اس کے صحت مند نظریوں کو رجعی پہلوؤں سے الگ کر کے دیکھا جائے تو صحیح ہوگا۔ دوسرے کسی بھی شاعر یا فنکار کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اس کے کلام کے مجموعی تاثر کو اور اس کے عہد کے عقائد و نظریات کو گرفت میں رکھنا چاہیے۔ مجموعی تاثر اس کے کلام کے تفصیلی مطالعے سے ملتا ہے، اس کے مفصل حالات سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ شاعر یا فنکار نے اپنے عہد اور اس کے حالات کو کس نظریے سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ اس کی تخلیقات میں زندگی کا کس طرح کا تصور نمایاں ہوا ہے۔ تبھی ہم اس تخلیق کار اور تخلیق کے بارے میں کچھ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ 'ذکرِ حافظ' کے بارے میں وہ ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

'اس کتاب میں، میں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ خامیاں نہ ہوں جو مجھے خود اکثر نقادوں کی تحریروں میں نظر آتی ہیں اول تو یہ کہ تنقید میں ادب کی چاشنی ہو جسے پڑھ کر لوگوں کو حظ آئے وہ محض تشریح نہ ہو بلکہ بجائے خود ایک تحریر لطیف بھی ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں زیرِ نظر شاعر کا محض "سماجی پس منظر" نہ ہو۔ جیسے فلاں شاعر جاگیری دور کے انحطاط کی پیداوار تھا۔ ('یہ پیداوار' بھی کیسا بھونڈا الفاظ ہے۔ جبکہ اسے ادبی تخلیق کے سلسلے میں استعمال کیا جائے)! تیسرے یہ بات دکھائی جائے کہ اس کے کلام میں خوبی یا تاثر یا خرابی اور بے کیفی اور سپاٹ پن، کیوں ہے۔ اس میں حسن و لطافت کے کون سے پہلو ہیں وغیرہ۔ چوتھے یہ کہ ماضی کے ادب عالیہ کا جائزہ لیتے وقت محض چند عام فقروں کا گھسے بندھے جملوں کا استعمال کر کے بات ختم نہ کی جائے مثلاً یہ کہ اس میں انسان دوستی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ دکھایا جائے ٹھوس طریقے سے کہ اس کے کلام کا وہ کون

سا حصہ ہے اور کون سی باتیں ہیں جن کے ذریعے اس شاعر نے انسان کی انسانیت، اس کی تہذیبِ نفس اور اس کے انبساط میں اضافہ کیا ہے اور جو اب بھی ہمیشہ کے لیے قابلِ قدر ہے اور ہمیشہ رہے گا'۔[۱۶]

درج بالا سطور کے ذریعے سجاد ظہیر کا تنقیدی نظریہ بخوبی نمایاں ہو جاتا ہے اور 'ذکرِ حافظ' پر ایک مبسوط اور مکمل تنقیدی کتاب کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سجاد ظہیر، 'غلط رجحان'، شاہراہ (دہلی)، فروری۔ مارچ ۱۹۵۱ء

۲۔ ذکرِ حافظ، ص ۳۱

۳۔ ایضاً، ص ۳۹

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً، ص ۳۱

۷۔ سید علی ہجویری، 'کشف المحجوب'، ص ۴۲۹

۸۔ عتیق احمد، سجاد ظہیر، تخلیقی اور تنقیدی جہات، کراچی، ص ۱۷۳

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ڈاکٹر شارب ردولوی، 'سجاد ظہیر کی تنقید نگاری'، ص ۶۷۔ ۶۸

۱۴۔ عتیق احمد، 'بنّے بھائی'، کراچی، ص ۹۶

۱۵۔ ڈاکٹر شارب ردولوی، تنقیدی مطالعے، ص ۶۹

۱۶۔ 'سجاد ظہیر کا خط رضیہ سجاد کے نام۔ مچھ، بلوچستان، ۱۹۵۴ء

سحر انصاری

'پگھلا نیلم' ۔ سجاد ظہیر کا شعری مجموعہ

یادش بخیر، یار عزیز باقر مہدی جب بمبئی سے کراچی آئے تھے تو ان کے ساتھ اس وقت کی تازہ ترین مطبوعات میں سجاد ظہیر کا شعری مجموعہ 'پگھلا نیلم' بھی تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت کو اس وقت کوئی دو تین سال ہوئے تھے اور ادبی حلقوں میں اس امر پر حیرت کا اظہار کیا جارہا تھا کہ سجاد ظہیر نے شاعری کس طرح شروع کردی۔ باقر مہدی یہ چاہتے تھے کہ ان کے ادبی پرچے کے لیے (جو وہ بعد میں جاری نہ کرسکے) 'پگھلا نیلم' پر میں ایک تبصرہ لکھوں۔ اس تبصرے کا تو نہ معلوم کیا ہوا۔ لیکن اس وقت 'پگھلا نیلم' کے جو نوٹس میں نے لیے تھے وہ میرے پاس محفوظ رہ گئے۔

باقر مہدی نے بتایا تھا کہ ہندوستان کے ادبی حلقوں نے سنجیدگی سے سجاد ظہیر کی شاعری پر توجہ دی ہے لیکن ابھی پوری طرح ان کی شاعری کا محاکمہ نہیں ہوسکا ہے۔ سجاد ظہیر کے بعض معاصرین کو جب یہ علم ہوا کہ وہ نظمیں لکھ رہے ہیں تو ان کے کان کھڑے ہوئے، ان کا خیال تھا کہ سجاد ظہیر اپنے مخصوص نظریات اور انداز فکر کے پس منظر کے ساتھ جب شعر کہیں گے تو وہ بجائے خود مارکسی ادب میں ایک منفرد اضافہ ہوگا۔

میں نے جب سجاد ظہیر کے مجموعہ کلام کا مطالعہ کیا تو چند باتیں پہلے ہی مرحلے میں طے ہوگئیں:

(۱) سجاد ظہیر نے اردو شاعری کے مروجہ اوزان اور بحریں استعمال نہیں کی ہیں۔ ایک مترنم آہنگ کو انہوں نے بعض نظموں میں ضرور برقرار رکھا ہے۔ لیکن بیشتر نظمیں خوبصورت اور مربوط نثری

ٹکڑوں پر مشتمل ہیں۔ (۲) معیار کے لحاظ سے اس میں اچھی، بہت اچھی اور گوارا قسم کی نظمیں ہیں۔ (۳) موضوعات اور ہیئت کے لحاظ سے اس شاعری پر انفرادیت کی خاصی چھاپ ہے۔ (۴) بعض انتہائی حقیقت پسندانہ اور روزمرہ کے واقعات و تجربات کو مخصوص شعری ڈکشن کے ساتھ لطیف پیرایہ اظہار دیا گیا ہے۔

سجاد ظہیر کی ان نظموں کو حسبِ معمول ادبی حلقوں نے ایک نئے تجربے کا نام دیا لیکن سجاد ظہیر 'نئے تجربے' والی بات سے مطمئن نہیں تھے انہوں نے 'پگھلا نیلم' کے دیباچے میں اس موضوع پر یہ سطریں بڑے کرب سے لکھی ہیں۔

> 'میرے بعض دوستوں نے میری چند نظموں کو سن کر جب یہ کہا کہ سجاد ظہیر نئی قسم کی شاعری کا تجربہ کر رہے ہیں، تو میرے دل کو اس جملے سے بڑی چوٹ لگی۔ تجربہ! یہ تو ویسی ہی بات ہوئی اگر کسی عاشق سے یہ کہا جائے کہ وہ جذبہ محبت کا تجربہ کر رہا ہے۔
>
> 'شاعری انسانیت کا لطیف ترین جوہر ہے۔ اس کے اظہار کو تجربہ کہنا بڑا ظلم ہے۔'

ان سطروں میں سجاد ظہیر نے بڑی صداقت سے اس امر کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ شاعری کو جذبہ محبت کے مترادف سمجھتے ہیں اور اسے انسانیت کا لطیف ترین جوہر گردانتے ہیں۔ اسی دیباچے میں آگے چل کر انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی ذہنی تعمیر اور شعری نظام کو ایک تسلسل کے ساتھ دیکھا جائے۔ نظموں کو ٹکڑوں اور جداگانہ قطعات کی صورت میں پڑھنا غلط ہے۔ بالفاظ دیگر سجاد ظہیر ہر نظم کو ایک اور شاعر کے پورے شعری نظام کو ایک نامیاتی اکائی سمجھتے تھے۔ جس کو الگ الگ کرنے سے اس کا جوہر مجروح ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے شاعرانہ موقف کی وضاحت وحمایت یوں کی ہے۔

> 'میرے نزدیک اصل سوال یہ ہے کہ ایک فن کار اپنی تخلیق کے لیے اپنے خام مواد کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ جس قدر زیادہ یہ مواد اس مفہوم اور مقصد کو ادا کرنے کے لیے صحیح اور مناسب طور سے استعمال ہوگا جو کہ فن کار

کا مدعا ہے، اس حد تک اس کی تخلیق کامیاب ہوگی۔ اس خام مسالے کی
بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تاج محل کے مینار، گنبد، محراب، سنگِ مرمر
اور اس پر بنی ہوئی نقاشی علیحدہ علیحدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے، وہ اگر ضروری
ہیں تو اسی لیے کہ معمار کے مجموعی اور مکمل تصور کو شکل وصورت ادا کرنے
کے لیے انہیں ایک خاص طریقے سے اور ایک خاص تناسب کے ساتھ
استعمال کیا گیا ہے'۔

'پگھلا نیلم' کی نظمیں بھی ایک خاص تناسب و آہنگ کی حامل ہیں۔ ان میں نثری ٹکڑوں کی پیوندکاری نہیں ہے بلکہ مروجہ شعری آہنگ کی جگہ ایک خاص آہنگ پیدا کیا گیا ہے جو بقول سجاد ظہیر 'اجنبی ہے لیکن دل فریب بھی ہے'۔

مجھے ذاتی طور پر سجاد ظہیر کی جو نظمیں زیادہ پسند آئیں وہ یہ ہیں:

'پرانا باغ'، 'ہونٹوں سے کم'، 'تصویریں'، 'دریا'، 'ماسکو میں تین'، 'نرالی راتیں'، 'تالے'، 'تمہاری آنکھیں'، 'جئیں یا نہ جئیں'، 'رُک جاؤں تو'، 'کبھی کبھی'، 'انتظار'، 'کالا پھول'، 'بلور کے پیالے'، 'کیا تم بیچ سکتے ہو'، 'بناوٹوں کے قلعے'۔

ان نظموں میں سجاد ظہیر کا سارا ذہنی رویہ شعری پیکر میں ڈھل گیا ہے۔ ان نظموں میں آدرش کو پانے کی خواہش بھی ہے، انسانوں کی نفرتوں کو محبتوں میں بدل دینے کی آرزو بھی ہے، گزرتی ساعتوں کو روکنے کی التجا بھی ہے اور سارے اشیا کو رنگ و بو سے اور سب کے دلوں کو امن و مسرت سے معمور کر دینے کی امنگ بھی۔ محبوبہ کے ماہتابی عکس کو سنہری شراب پر دیکھنے کی تمنا بھی ہے اور برسات کی رات میں شاعر کے آنگن کا راستہ بھول جانے والی لجاتی مسکراتی کلی کی شکایت بھی۔ ناکوئی عورتوں اور موم کی پتلیوں کی تصنع سے نفرت بھی ہے اور تیتوف اور لینن سے محبت بھی۔

سجاد ظہیر کا مجموعہ 'پگھلا نیلم' مجھے کئی اعتبار سے اردو میں سرریلزم کے اثرات کی مثال معلوم ہوتا ہے، وہ سرریلزم جس سے پال ایلوا، لوئی اراگاں اور پابلو نرودا متاثر تھے۔ سجاد ظہیر کی علامتیں، ان کے شعری تلازمات، خیال کی موثر تجرید اور تجربے کا اشارہ انگیز اظہار سرریلسٹ شعرا سے بہت مشابہ ہے۔

'ماسکو میں تین' سجاد ظہیر کی شاعرانہ فکر کی اچھی مثال ہے اور اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ گرد وپیش کی دنیا کو اپنے خیال کی لطافت سے کس طرح ہم آہنگ کر کے ایک نئی شعری صورت تراش لیتے تھے:

یہ کیسی عجیب روشنی ہے
اُجلی نیلاہٹ، صاف اور ٹھنڈی
مدھم، ملائم سوتے بچے کے گال!
بڑی سردی ہے
چاروں اور چھتیں، سطحیں،
ہن پتے پیڑوں کی ڈالیں،
کونے کونے،
دودھیا چنبیلی سہروں سے ڈھکے ہیں،
رات بہت ہی بیت گئی ہے،
یہ شہر، انقلاب کا مرکز
ساکت ہے، چپ ہے،
بجلی کے کھمبے سر نہوڑائے
سُونے رستے دیکھ رہے ہیں،
اِدھر اُدھر اکّا، دُکّا،
کہیں کہیں کالے دھبے سفید برف پر
چلتے ہوئے نظر آتے ہیں،
انسان ہیں یہ؛

(ماسکو میں تین)

برف پر چلتے ہوئے انسانوں کے لیے کس قدر انوکھا پیرایہ اظہار اختیار کیا ہے۔ سجاد ظہیر کی نظموں میں رومان کا عنصر بھی شامل ہے۔ لیکن انہوں نے جذبوں کی ترسیل اور شکوے شکایات کے

لیے نیا طرز اختیار کیا ہے۔ ان کی ایک نظم 'تالے' کی یہ سطریں دیکھیے۔ اس سے قبل نظم کے تمہیدی مصرعوں میں محبوبہ سے کبھی نہ ملنے کا عہد کیا گیا تھا اور یہ طے کیا گیا تھا کہ دونوں جئیں گے، دنیا کے سارے کام کریں گے، اور خط لکھ کر ایک دوسرے کی خیریت بھی معلوم کرتے رہیں گے، لیکن دل پر مُہر لگالیں گے۔ اس فیصلے کے بعد کی کیفیت یہ ہے۔

کتنی اندھیاری تھی،
وہ بُری رات
جب من کے کواڑوں پر
بڑے بڑے لوہے کے
تالے ڈالے ہم نے
اور کنجی کو
دُکھ کے بھیانک کالے ساگر میں
پھینک دیا!
وہ تالے تو اب بھی پڑے ہیں،
اور ہم تم
ویسے ہی جیوت ہیں،
جیسے تم نے چاہا تھا
بس ایک بات جھوٹی نکلی
کیوں آتی ہو؟
تم بار بار کیوں آتی ہو؟

(تالے)

آدرش کے حصول کے لیے کتنی قربانیوں اور کتنے ایثار سے کام لینا پڑتا ہے اس کا اظہار ایک نظم 'جئیں یا نہ جئیں' میں بڑی خوبی سے کیا ہے۔ مصرعوں میں ہندی کے الفاظ بھی ہیں اور ہندی ہی کیا سجاد ظہیر نے تو اپنی نظموں میں پوربی کے الفاظ بھی بڑے سلیقے سے برتے ہیں۔ 'جئیں یا نہ جئیں' کی

سطریں دیکھیے۔

شانتی چاہنے سے شانتی نہ ہوگی،
بھوک لگنے سے کیا بھوجن مل جاتا ہے؟
دانہ مٹی میں رُل جائے،
جل، وایو
سوریہ کرن سے کس بل،
پر پڑنا محنت سے لے کر
سینے میں بھرے،
تب کہیں زمان فلکستی کی
جوالا بھڑکتی ہے!

(جئیں یا نہ جئیں)

آنکھوں پر بعض شاعروں نے بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ غزل میں آنکھوں پر بڑے اچھے اشعار مل جاتے ہیں، لیکن سجاد ظہیر نے اس موضوع کو بھی اپنے منفرد انداز میں شاعری کا پیکر عطا کیا ہے اور انہیں زمانے کے ساگر میں ڈولنے والی دو آبنوسی کشتیاں کہہ کر ایک نیا استعارہ وضع کیا ہے۔

تمہاری آنکھیں
تمہاری کالی چمکتی آنکھیں
زمانے کے ساگر میں
دو آبنوسی کشتیاں
جن کی تہہ میں
تارے جڑے ہوئے ہیں
پلکوں کے مستول تھرتھراتے ہیں
ہر گھڑی ہر دم
ہلتی ڈولتی بہتی چلی جا رہی ہیں

مت روکو ان کو
انہیں لمبے دور دراز سفر کرنے دو
دکھ کی تلملاتی لہروں
آنسوؤں کے بھنور میں
پھنسنے دو ان کو
اور انہیں پھر
ہرت نئی، انجانی آشاؤں کے
سنہرے ساحلوں سے
ٹکرانے دو

(تمہاری آنکھیں)

میں نے سجاد ظہیر کی ایک نظم 'کبھی کبھی بے حد ڈر لگتا ہے' پوری کی پوری نقل کر لی تھی۔ آج جب وہ ہم میں نہیں ہیں اس نظم کی معنویت کے کچھ اور گوشے اجاگر ہوئے ہیں۔ اس میں انہوں نے تصورِ مرگ کو بھی ایک خاص زاویے سے پیش کیا ہے اور موت کی بھی دو قسمیں بتائی ہیں۔ میرے خیال میں 'پگھلا نیلم' کی یہ سب سے اچھی نظم ہے۔ انسان کی اندرونی کیفیات اور احساس کی موت کو جسمانی موت سے زیادہ سنگین اور سفاک قرار دیا ہے۔ اس میں سجاد ظہیر ایک سچے آدرش وادی کی طرح شعری تناظر میں سوچتے نظر آتے ہیں۔

کبھی کبھی بے حد ڈر لگتا ہے
کہ دوستی کے سب روپہلے رشتے،
پیار کے سارے سنہرے بندھن،
سوکھی ٹہنیوں کی طرح،
چٹخ کر ٹوٹ نہ جائیں،
آنکھیں کھلی، بند ہوں، دیکھیں،
لیکن باتیں کرنا چھوڑ دیں

ہاتھ کام کریں،
انگلیاں دنیا بھر کے قصے لکھیں،
مگر پھول جیسے بچوں کے،
ڈگمگاتے چھوٹے چھوٹے پیروں کو
سہارا دینا بھول جائیں،
اور سہانی شبنمی راتوں میں
جب روشنیاں گُل ہو جائیں،
تارے موتیا چنبیلی کی طرح مہکیں،
پریت کی ریت
نبھائی نہ جائے،
دلوں میں کٹھورتا گھر کرلے،
من کے چنچل سوتے سوکھ جائیں،
یہی موت ہے!
اس دوسری سے
بہت زیادہ بُری
جس پر سب آنسو بہاتے ہیں
ارتھی اٹھتی ہے،
چتا سلگتی ہے،
قبروں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں
چراغ جلتے ہیں،
لیکن یہ، یہ تو،
تنہائی کے بھیانک مقبرے میں
دائمی قید ہے،

جس کے گول گنبد سے
اپنی چیخوں کی بھی،
بازگشت نہیں آتی
کبھی کبھی بے حد ڈر لگتا ہے!

(کبھی کبھی بے حد ڈر لگتا ہے)

اس نظم سے اور اس طرح کی دوسری نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر کس طرح دل میں احساس کی شمع کو فروزاں رکھنا اور فروزاں دیکھنا چاہتے تھے۔

بے حسی کو وہ تنہائی کے بھیانک مقبرے میں دائمی قید سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں بچوں کے ڈگمگاتے قدم سہاروں سے محروم نہ ہو جائیں۔ سجاد ظہیر کے اکثر مصرعوں میں بچے کی معصومیت کے استعارے آتے ہیں، جو اس امر کے غماز ہیں کہ سجاد ظہیر کس طرح انسانیت کے معصوم پہلوؤں کو جزوِ ذات بنا چکے تھے اور کس طرح وہ خارجی دنیا میں بھی اسی معصومیت کی نشوونما کے خواہاں تھے۔

آخر میں مجھے ایک بات یہ ضرور کہنی ہے کہ اس مجموعے کے مطالعے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سجاد ظہیر پابند نظمیں نہیں لکھ سکتے تھے یا وہ مروّجہ شاعری کو برتنے سے قاصر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سجاد ظہیر غزل اور شاعری کی دیگر اصناف سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہیں عروض اور بحور و اوزان پر قدرت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ 'ذکرِ حافظ' کے مطالعے سے بھی ہو جاتا ہے اور ان اشعار سے بھی جو انہوں نے اسیری کے زمانے میں فیض احمد فیض اور دوسرے ساتھیوں کے طرحی مصرعوں پر کہے تھے۔ 'پگھلا نیلم' ان کے شاعرانہ وجود کا یادگار سفر ہے۔

ماہنامہ 'افکار' کراچی، سجاد ظہیر ایڈیشن، دسمبر ۱۹۷۳ء

تیسرا حصہ

حیاتِ اثر آفریں

ڈاکٹر ملک راج آنند

میرا حقیقی بھائی ــــــ بنے بھائی

سجاد ظہیر کو ہم سب لوگ بنے بھائی کہا کرتے تھے۔ میرے دو بھائی ہیں لیکن اپنی بالغ زندگی کے پچھلے ۴۰ برسوں میں میرے حقیقی بھائی صرف بنے بھائی ہی تھے۔

ہماری محبت کی بنیاد بہت سے مشترک خیالات اور عقیدوں پر تھی۔ چوتھی دہائی کے شروع میں ہم نے لندن میں فیصلہ کیا کہ ہم آزادی کی جدوجہد میں کام کریں گے۔ ہم نے ساتھ مل کر 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کی بنیاد رکھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ادب انسانیت کے حصول کا، خود ارتقا کا ایک وسیلہ ہے۔

ہندوستان واپس آ کر سجاد ظہیر نے ترقی پسندوں کی چھوٹی سی جماعت کو رویندر ناتھ ٹیگور، جواہر لال نہرو اور پریم چند کی حمایت سے انسانی روح کی ایک عظیم تحریک بنا دینے کے لیے انتھک کام کیا۔

خاص طور سے ہندی اردو ادب میں انہوں نے اپنے ساتھ ہمارے ملک کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کو جمع کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ یہ سارے شاعر اور نثر نگار چاہے انجمن ترقی پسند مصنفین سے باقاعدہ منسلک نہ بھی رہے ہوں لیکن ترقی پسند تحریک سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔

سجاد ظہیر کی شرافت، خلوص اور شاعرانہ جاذبیت نے بہت سے لوگوں کو اپنا دوست بنا لیا۔ انہوں نے چوتھی دہائی کے آخری برسوں میں جواہر لال نہرو کے ساتھ الٰہ آباد میں کام کیا تھا اور میں

جانتا ہوں کہ پنڈت جی کے دل میں سجاد ظہیر کے لیے ایک خاص جگہ تھی۔

سجاد ظہیر کی ولی صفت شخصیت کا جادو ایسا تھا (ان کے لیے سجاد ظہیر بہت ہی مناسب نام تھا) کہ اس کے زیر اثر ان کے والد، اودھ چیف کورٹ کے سابق لارڈ چیف جسٹس لوگوں سے کہنے لگے کہ انہیں سر وزیر حسن نہ کہا جائے بلکہ صرف سید وزیر حسن کہا جائے۔ انہوں نے فرقہ پرستوں سے بلکہ قطع تعلق کرلیا اور انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ سجاد ظہیر کے سب بھائی ان سے سیاست میں اختلاف رکھتے تھے اور اپنے اپنے میدانوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے لیکن سجاد ظہیر سے سب محبت کرتے تھے اور ان کی غریبی میں مدد بھی کرتے تھے۔

پاکستان میں ان کے لیے جو آگ روشن کی گئی تھی اس میں سے گزرنا ان کی عظیم ترین آزمائش تھی۔ انہیں 'راولپنڈی سازش کیس' میں ماخوذ کیا گیا اور بلوچستان کی ایک جیل میں وہ برسوں قید رہے یہاں تک کہ عالمی رائے عامہ نے انہیں آزاد کرالیا۔

۱۹۵۶ء میں جواہر لال نہرو کی سرپرستی میں ہم دونوں نے ایشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس منظم کی جس کے لیے انہوں نے سرگرمی سے کام کیا اور پھر اسی طرح ہم دونوں نے ۱۹۷۰ء میں دہلی میں افریشیائی ادیبوں کی چوتھی کانفرنس منظم کی۔ ان کا صلح پسند مزاج بہت سے ضدین کو بھی یکجا کرلیتا تھا۔

ان کی موت سے ہمارے ملک کے ان چند دانش وروں میں سے ایک جاتا رہا جنہوں نے اپنے آپ کو محرومین ارض، سب سے زیادہ غریب اور سب سے زیادہ کچلے ہوئے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔

وہ ہمارے ملک کے سب سے بڑے عظیم سوشلسٹ انسان دوستوں میں تھے۔ مجھے ہر چار طرف ایک خلاء کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اب جب میں ان سے ملوں گا تو وہ مجھے بے ساختہ اپنی نظم نہ سنائیں گے۔ اس لیے کہ اب میں ان سے مل ہی نہ سکوں گا۔

ہفت روزہ 'حیات'، نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

سی۔ راجیشور راؤ

پیارے بنّے بھائی

کامریڈ سجاد ظہیر کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بے حد صدمہ پہنچا، وہ ہماری پارٹی کے سربرآوردہ اور آزمودہ کار لیڈر، ایک پکے وطن دوست، محنت کش عوام کے آدرش کے ایک جانباز اور نڈر مجاہد اور ایک قدآور ادیب تھے۔ وہ اپنی آخری سانسوں تک اپنے نظریات کے وفادار رہے اور ان کے لیے بے پناہ مشکلات اور مصائب کی پرواہ کیے بغیر زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے قید و بند اور روپوش زندگی کی صعوبتیں برداشت کیں اور دارورسن کی ان آزمائشوں سے بھی گزرے جو ایک انقلابی کے حصے میں آتی ہیں لیکن زندگی کے کسی بھی موڑ پر ان کے قدموں میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آئی۔ جب برطانوی حکمرانوں نے ہمارے ملک کو تقسیم کردیا تو وہ کمیونسٹ پارٹی کو منظم اور مستحکم بنانے کے لیے پاکستان چلے گئے۔ اس وقت وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پاکستان میں کونسا مستقبل ان کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری چنے گئے۔ انہوں نے روپوشی کے انتہائی کٹھن حالات میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انہیں ہمارے برصغیر کے شہرۂ آفاق اردو شاعر فیض احمد فیض اور کچھ فوجی افسروں کے ساتھ راولپنڈی سازش مقدمے میں پھانس لیا گیا۔ پاکستانی جیل کی کال کوٹھریوں میں کئی برس کاٹنے کے بعد رہا ہو کر وہ ہندوستان لوٹ آئے اور پھر ایک مرتبہ پارٹی سرگرمیوں میں جٹ گئے۔ ان کی زندگی کا یہی ایک واقعہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ ان کی شخصیت کیسے جاندار انقلابی خمیر سے گوندھی گئی تھی۔

ہند پاک عوام کا دوست:

انہوں نے پاکستان کے عوام کو کبھی نہیں بھلایا، وہ دونوں ملکوں ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے حقیقی مفادات کو عزیز رکھتے تھے اور زندگی بھر دونوں کے تعلقات کو سدھارنے کے لیے بساط بھر جدوجہد کرتے رہے۔

انہوں نے بنگلہ دیش کے عوام کی سرفروشانہ جدوجہد کی اٹل تائید کی۔

ان کی شخصیت کئی خوبیوں کا گلدستہ تھی۔ ان کی دیانتداری، راست بازی، سادگی، تحمل اور بردباری، محبت اور شفقت نے انہیں اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں ہردلعزیز بنا دیا تھا اور ہر کوئی انہیں محبت اور عقیدت سے بنّے بھائی پکارا کرتا تھا۔

میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۳۷ء کے دوران گنٹور (آندھرا پردیش) میں ہوئی تھی جہاں وہ سیاست کے ایک گرمائی اسکول کے لیے ٹیچر کی حیثیت سے آئے تھے۔ انہوں نے اسکول میں اپنے ولولہ انگیز لیکچروں اور خلیق برتاؤ سے ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اس کے بعد سے میں ہمیشہ ان کا پرستار بنا رہا اور ایک چھوٹے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتا رہا، زندگی میں اتنی طویل رفاقت کے باوجود ہمارا کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔

یہ تھے کامریڈ سجاد ظہیر جو ہمیں غمزدہ بنا کر ہم سے بچھڑ گئے ان کی موت ہماری پارٹی، ہمارے ملک اور ہمارے عوام کا ایک زبردست نقصان ہے۔ ہم ان کی عظیم یاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور ان کے انقلابی ورثے کو جو انہوں نے چھوڑا ہے آگے بڑھانے کا عہد کرتے ہیں۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے میں ایک یادگار واقعے کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ بنّے بھائی کی رفیقہء حیات کامریڈ رضیہ نے بڑی بہادری کے ساتھ اس صدمے کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے اور کامریڈ فاروقی سے کہا کہ 'یہ زندگی کا ایک حصہ ہے اور ہمیں اس کو ایسا ہی سمجھ کر قبول کرنا چاہیے'۔

کامریڈ سجاد ظہیر کی تدفین کے موقعے پر انہوں نے مجھ سے کہا کہ 'میں پارٹی میں شریک ہوں گی اور اس کے جھنڈے کو اونچا رکھوں گی'۔ میں ان کی جرأت اور عزم، ہماری پارٹی سے ان کی محبت کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔

یوں تو انہوں نے ایک زمانے سے اپنی رکنیت کی تجدید نہیں کرائی، پھر بھی وہ کمیونسٹ تحریک

سے کسی وقت بھی الگ نہیں رہیں۔ وہ ہمیشہ ہماری پارٹی کے ساتھ رہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے کامریڈ سجاد ظہیر کے ورثے کو آگے بڑھانے کے لیے ہماری پارٹی کا باضابطہ رکن بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ بہر حال کمیونسٹ پارٹی ایک انقلابی خاندان ہے جس میں نسل، مذہب، زبان اور ذات پات کی بنیاد پر کسی سرقبیلی فرق اور امتیاز کو کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، ۲۳ ستمبر ۱۹۷۳ء

بھیشم ساہنی

انسان دوستی کا پیکر

جب انسان نہیں رہ جاتا تبھی اس کی شخصیت کا جوہر ہماری نظروں کے سامنے ابھرنا شروع ہوتا ہے۔ جب تک وہ زندہ رہتا ہے تب تک اسے بس اپنا ہمکار یا ساتھی سمجھتے رہتے ہیں، اسے اپنی روزمرہ سرگرمیوں کے سیاق میں دیکھتے ہیں۔ اس پیمانے سے اسے پرکھتے ہیں کہ ہم سے کس حد تک اتفاق یا اختلاف کرتا ہے۔ لیکن جب وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تب نہ صرف اس کی کمی کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس کی پوری شخصیت پر نظر پڑتی ہے اور یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے لیے اور ہمارے کام کے لیے اس کے کام کا کیا مطلب تھا۔ اس کی ساری زندگی بیک نظر سامنے آجاتی ہے، تب ہم اس کا وہ روپ دیکھتے ہیں جو وہ دراصل تھا اور پھر یا تو ہم اسے غیر اہم قرار دے کر رد کر دیتے ہیں اور طاقِ نسیاں پر رکھ دیتے ہیں یا پھر وہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا اٹھتا ہے اور ہم اس کی یاد کو تا عمر سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔

بنے بھائی بھی اپنی شخصیت کا یہی روپ چھوڑ گئے ہیں کہ آج ان کو یاد کر کے فخر و خوشی کا احساس ہوتا ہے کہ ہم انہیں جانتے تھے۔ ان کی شریف طبیعت، ان کا ہمدردانہ رویہ ان کی منکسر مزاجی یاد آتی ہے۔ جب غصہ کرنے کی معقول وجہیں تھیں تب بھی وہ شائستگی اور وقار کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ کبھی کبھی یہ دھوکا ہوتا کہ وہ کمزور آدمی ہیں الجھے مسئلے طے نہیں کر پاتے، دوسروں کا اتنا لحاظ کرتے ہیں کہ صاف اور کھری کھری بات نہیں کرتے۔

لیکن اس شرافتِ نفس کی تہہ میں ایک بہت ہی مضبوط اور پُر عزم شخصیت تھی۔ اپنے عزیز ترین مقصد کی خدمت میں وہ محکم اور ثابت قدم تھے۔ ۴۰ سال سے زیادہ کے عرصے میں ہر طرح کے سرد وگرم کے باوجود ان کے استحکام واستقلال میں سرمو فرق نہیں آیا۔ ترقی پسند تحریک میں آنے والے بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی بڑے خوشحال گھرانے کے تھے اور انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ اس طرح کے بہت سے لوگ ڈگمگائے، بھٹکے اور تحریک سے الگ ہو گئے اور اپنی زندگی بنانے میں لگ گئے لیکن بنّے بھائی کبھی نہ ڈگمگائے نہ پچھتائے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اعلیٰ عہدے حاصل کر سکتے تھے۔ محل کھڑے کر سکتے تھے۔ ان کے لیے یہ سب بہت آسان ہوتا، لیکن انہوں نے اس مقصد کی خدمت کرنا پسند کیا جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا۔ میرے خیال میں یہ ان کے کردار کی ممتاز ترین خوبی تھی۔

وہ پکے کمیونسٹ تھے اور ان کے عقائد کے بارے میں کوئی چیز میکانیکی نہ تھی۔ ان کی وسیع النظری ان کا صحیح معنوں میں سیکولر اندازِ فکر، ان کی گہری انسان دوستی، سب ان کے کردار کا لازمی جزو تھیں۔ ان کی چالیس سال کی زندگی میں ایک موقع بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جب انہوں نے اپنے اصولوں کے معاملے میں سمجھوتہ کیا ہو۔

مجھے ان سے ملنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا شرف بہت بعد کو حاصل ہوا۔ البتہ ان کا ذکر بہت پہلے سے سنتا آیا تھا۔ ان کا نام سب سے پہلے میں نے دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں راولپنڈی میں سنا۔ میرے ایک دوست نے سجاد ظہیر کا ذکر کیا جو سابق چیف جسٹس سر وزیر حسن کے بیٹے تھے اور جو کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہو گئے تھے اور پھر ان کے بارے میں کبھی کوئی خبر سننے میں آجاتی، کہیں ذکر آجاتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ ٹیگور، پریم چند اور دوسرے بہت سے ادیبوں سے ملے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جواہر لال نہرو کے ساتھ بھی کام کر چکے ہیں اور پھر کچھ دنوں بعد میں نے ان کی ایک تصویر دیکھی، سڑک پر کمیونسٹ اخبار بیچتے ہوئے۔ اور یوں رفتہ رفتہ ذہن میں ایک ایسے انسان کی تصویر بنتی گئی جس کے نمونے پر اپنے آپ کو ڈھالنے کو جی چاہنے لگا۔ اور پھر یہ تصویر اور بھی زیادہ متاثر کن ہو گئی جب یہ خبر ملی کہ سجاد ظہیر پاکستان گئے ہیں اور وہاں پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل

سیکریٹری چنے گئے اور انہیں راولپنڈی سازش کیس میں ماخوذ کرلیا گیا ہے، جیل میں ہیں جہاں پر طرح طرح کی سختیاں کی جارہی ہیں وہ صعوبتیں اور مظالم انہوں نے کس جانبازانہ عزم اور پامردی سے برداشت کیے اس کی شہادت ان خطوں سے ملتی ہے جو انہوں نے جیل سے اپنی بیوی کو لکھے ہیں۔

میرا خیال ہے میں سجاد ظہیر سے پہلی بار ۱۹۵۵ء میں ادیبوں کے ایک جلسے میں دہلی میں ملا۔ اس جلسے میں ایلیا اہرنبرگ تقریر کرنے والے تھے جو ہندوستان آئے ہوئے تھے اور مجھے یاد ہے کہ میں سجاد ظہیر کو بھی اتنے ہی غور اور اشتیاق سے دیکھ رہا تھا جتنے کہ ایلیا اہرنبرگ کو۔ بنے بھائی کے بال بہت سفید ہوگئے تھے لیکن اس وقت وہ ڈیل ڈول کے اتنے بھرکم نہیں ہوئے تھے جتنے بعد کو ہوگئے اور انہوں نے ایک کارڈ پر اپنا نام اردو میں لکھ کر اپنے کوٹ پر لگا رکھا تھا جیسے ان لوگوں سے اپنے آپ کو متعارف کروا رہے ہوں جو انہیں نہ جانتے ہوں اور جلد ہی وہ پھر کلچرل محاذ پر سرگرم ہوگئے۔ پھر تو میں نے ان کو بارہا تقریریں کرتے سنا، ان سے ملا، ان کی لکھی ہوئی رپورٹیں پڑھیں۔ تہذیبی کارکنوں میں وہ واحد شخص تھے جو ہندوستان کے ہر علاقے کی صورتِ حال سے اچھی طرح واقف رہتے تھے اور مختلف زبانوں اور علاقوں کے ادیبوں کی کثیر تعداد کو ذاتی طور پر جانتے تھے انہوں نے ہندوستان کا کونا کونا چھان مارا تھا اور ہر جگہ ترقی پسند ادیبوں شاعروں اور مفکروں سے ملے تھے۔ یہ بجائے خود کم اہم کارنامہ نہیں تھا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ تہذیبی سرگرمیوں کی اس ہماہمی میں وہ اپنی نگارشات کے لیے بہت کم وقت نکال پاتے تھے اور ادیب کی حیثیت سے انہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ آج ہمارے پاس ان کے لکھے ہوئے سینکڑوں اعلانات، بیانات اور رپورٹیں ہیں لیکن ان کی کہانیوں، ناولوں، ادبی تنقیدی مضامین کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

میں افرو ایشیائی ادیبوں کی چوتھی کانفرنس کے دوران میں ان سے بہت قریب آیا جو دہلی میں ۱۹۷۰ء میں ہوئی تھی۔ وہ اس تحریک کے اصل بانیوں میں سے تھے۔ دہلی میں ۱۹۵۶ء میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس جسے جواہر لال نہرو کی سرپرستی بھی حاصل ہوئی بڑی حد تک بنے بھائی کی پیش قدمی پر ہوئی تھی۔ بعد میں اسی خیال کو وسعت دے کر ۱۹۵۸ء میں تاشقند میں افرو ایشیائی ادیبوں

کی پہلی کانفرنس کی گئی۔ بنے بھائی اس تحریک سے قریبی طور پر وابستہ رہے۔

جب میں ان سے قریب آیا تو ان کی عمر کافی ہو چکی تھی۔ وہ بہت کچھ دیکھ چکے تھے لیکن اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس وقت بھی مستقبل کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں دہلی میں افرو ایشیائی ادیبوں کی چوتھی کانفرنس کے فوراً ہی بعد میں انہیں ایک میٹنگ سے گھر پہنچانے جا رہا تھا۔ ہم دونوں تھکے ہوئے تھے۔ کام کی زیادتی تھی۔ بہت ساری غلط فہمیاں ہوتی رہی تھیں اور گھنٹوں دوستوں میں بے معنی بحث ہوتی رہی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ بنے بھائی ان سب سے عاجز آ چکے ہوں گے اور اب وہ آرام کرنے کی فکر میں ہوں گے کہ وہ اچانک بول اٹھے 'میرا کبھی کبھی بے حد جی چاہتا ہے کہ ادیبوں کی ایک عالمی کانفرنس کی جائے جس میں سارے براعظموں کے ترقی پسند ادیب جمع ہوں۔'

اور اب میں سوچتا ہوں تو مجھے یہ لگتا ہے کہ بنے بھائی کا انتقال ایک ایسی کانفرنس کے دوران میں ہوا جو ان کی آرزوؤں کے بہت قریب تھی اس لیے کہ اس کانفرنس میں دنیا کے ۷۷ ملکوں کے ادیب شریک تھے جن میں پچپن ایشیائی افریقی ممالک کے ادیب بھی تھے۔

آخر دم تک ان کی شرافت نفس اور اخلاق میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس لیے کہ ان کا اخلاق جاگیردارانہ خاندان کا ورثہ نہیں تھا بلکہ یہ ان کے مطمح نظر کا نتیجہ تھا جو ترقی پسند، متوازن حقیقتوں سے ہم آہنگ تھا جس سے ان میں بڑی دردمندی پیدا ہوئی تھی۔ دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں انسانیت آئی تھی۔ اپنے دوستوں اور رفیقوں پر اعتماد کرنا اور ان سے محبت کرنا آیا تھا اور یہ مطمح نظر کوئی تجریدی چیز نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے خیالات وعقائد کے مطابق بسر کی اور ایسے ایسے کام کیے جنھیں کرنے کی جرأت وہمت کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے۔ ہمارا ملک طرح طرح کی اونچ نیچ سے گزرا اور بہت سے بڑے اچھے اچھے ساتھی برے دنوں کے بوجھ تلے ٹوٹ گئے لیکن بنے بھائی کا عقیدہ و اعتماد آخر تک محکم اور غیر متزلزل رہا۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

رضیہ سجاد ظہیر

انتظار ختم ہوا، انتظار باقی ہے

اس تحریر کا جو پس منظر ہے اس کے دیکھتے ہوئے ہوسکتا ہے یہ کہیں کہیں سے بے ربط معلوم ہو۔ لکڑی کے ان ٹکڑوں کی طرح جو دیکھنے میں بے ربط ہوتے ہیں، مگر جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک معنی رکھتا ہے، سب کو سلیقے سے جوڑا جائے تو ایک خاکہ بن جاتا ہے۔ مجھے اپنے قارئین سے یہ معافی تو مانگنی ہے کہ میں کچھ متفرق باتیں کہہ رہی ہوں، مگر مجھے ان کی ذہانت پر یہ بھروسہ ہے کہ وہ ان کو یکجا کر کے ایک خاکہ بنا سکیں گے۔

میں نے اپنے رفیق اور شوہر سجاد ظہیر کے ساتھ ۳۵ سال گزارے اور یہ کہنے کے ساتھ میں سوچتی ہوں کہ ہماری زندگی میں لفظ 'ساتھ' کے کیا معنی تھے۔ ہماری شادی ۱۰ دسمبر ۱۹۳۸ء کو ہوئی، ۱۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ گرفتار ہوئے، دو سال قید رہے، ۱۹۴۸ء کے اپریل میں پاکستان گئے۔ ۱۹۵۵ء کی جولائی میں واپس آئے۔ ۱۹۴۷ء سے پارٹی کا اخبار نکالنے دہلی آ گئے، میں بچیوں کی تعلیم کی وجہ سے لکھنؤ میں رہی۔ ۱۹۶۵ء میں، میں بھی دہلی آ گئی، تب سے ہم دونوں یہیں رہے۔ اس طرح ہم تقریباً دس سال تو ایک دوسرے سے بالکل الگ رہے، آٹھ سال کبھی کبھار ملتے تھے، تقریباً آدھی مشترکہ زندگی الگ الگ رہ کر خطوں پر بسر ہوئی پھر بھی ہمیں ایک ایسی رفاقت نصیب رہی جو کم میاں بیوی کو ملتی ہے۔ وہ تو اب ہمیشہ کو مجھ سے بچھڑ گئے۔ میں بھی پا بہ رکاب ہوں لیکن چونکہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ بہت سے سال ہمارے ملک میں ایسے ہوں گے کہ حساس و باشعور

میاں بیوی کو قربانیوں کی راہ اپنانی ہوگی اس لیے اگر ہماری زندگی سے انہیں کچھ بھی ہمت مل سکے تو میں سمجھوں گی ہمارا کیا، وصول ہوا۔

توازن اور علم:

آج اپنے ملک بھر سے، دنیا کے گوشے گوشے سے مجھے تار اور خطوط مل رہے ہیں، جن میں ان کی عظمت کا اعتراف ہے۔ ان کو یہ ناپسند تھا کہ میاں بیوی سب کے سامنے ایک دوسرے کی تعریف کریں۔ لیکن ان میں کچھ خواص ایسے تھے جو میرے خیال میں گھریلو زندگی اور انسانی رشتوں کو تقویت اور پائندگی بخشتے ہیں۔ ان ہی مقاصد کو سامنے رکھ کر میں ان صفات کے متعلق بات کروں گی جن سے ان کی عظیم شخصیت مرکب تھی۔ مثلاً اچھے کھانے کے حد درجہ شوقین ہوتے ہوئے بھی مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے معمولی یا بدمزہ کھانے پر کبھی نکتہ چینی کی ہو۔ اگر سامنے کھانا کم ہوتا تھا تو ضرور پوچھتے تھے کہ اوروں کے لیے ہے یا نہیں، دوسرے کی بات حیرت انگیز تحمل کے ساتھ سنتے تھے۔ اپنے خیالات انہوں نے مجھ تک پر کبھی لادنے کی کوشش نہیں کی، کسی عورت کے کردار کو برا کہتے میں نے ان کو نہیں سنا۔ ان سے مل کر لوگوں کی خود اعتمادی بڑھ جاتی تھی۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں انہیں ذرا ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ احسان فراموشوں کو انہوں نے ہمیشہ معاف کیا! ان کا دماغ جدید ترین مغربی رجحانات سے متاثر ہوتا تھا دل ہمیشہ مشرقی علم وفن و حسن سے مسحور ہوتا تھا۔ یہ میل نہایت متوازن تھا کیونکہ اس کی بنیادیں علم پر قائم تھیں۔ جو شخص مشرق و مغرب کے فنون کی تاریخ اور ان کے ہر موڑ اور رجحان کا منطقی علم رکھتا ہو صرف وہی ایسا رویہ اختیار کرسکتا ہے۔ کیا ان کے نوجوان عقیدت مندوں کو یہ اندازہ ہے کہ ان کی طبیعت کی خاکستری اور مزاج کا علم کس درجے مضبوط حکیمانہ تہیں رکھتا تھا کہ علم عظمت کے لیے کتنا ضروری ہے۔

البتہ یہ سوچنا غلط ہوگا کہ ان کو غصہ کبھی آتا ہی نہ تھا۔ اگر ہمارے گھر میں کام کرنے والی لڑکی سے کوئی پیالی ٹوٹ جاتی، ہمارا کتے کا پلا ان کا کرتا پھاڑ دیتا، ان کے لکھتے وقت پھاٹک پر کوئی فقیر زور زور سے چلانے لگتا، ان کے آرام کرنے کے وقت کوئی صاحب بغیر اطلاع خبر کے آدھمکتے اور پھر گھنٹہ دو گھنٹہ جم جاتے، کوئی تھرڈ کلاس طالب علم ان سے سفارش کو آجاتا، کوئی مظلوم مگر بے وقوف

مسلمان ان سے کہتا کہ ساری ہندو قوم بے ایمان ہے، کوئی میز حامیز حا دوست نشے میں دُھت ان کو بُرا بھلا کہتا یا بکواس کرکے دماغ چاٹتا تو ان کو غصہ نہیں آتا تھا لیکن جب کوئی اپنی سیاسی قلابازی کو قوم کے لیے مفید ثابت کرنے کی کوشش کرتا، اپنی ذاتی منفعت کو اصول بنا بنا کر پیش کرتا، نئے سرے سے کام کرنے کے بجائے پرانی لکیر پیٹ پیٹ کر ترقی پسند ادب کی صفوں میں انتشار کی سازش کرتا، شخصی آزادی کے نام پر سوشلزم کو گالیاں دیتا۔ ایک گہری خاموشی جس میں ریاکاری پر حقارت اور حماقت پر افسوس کی کیفیت ہوتی تھی اور پھر یہ خاموشی الفاظ بن کر قلم سے نکلتی اور اکثر حرف آخر بن جاتی۔ انہیں جوش ملیح آبادی کی ایک رباعی کے یہ دو مصرعے بہت پسند تھے۔

یا احمق بے پناہ یا مردِ حکیم
یہ دو ہی خوشی سے جی سکتے ہیں

اور اس میں کیا شک ہے کہ وہ جب تک جیے خوب جیے، خوشی سے جیے، مطمئن جیے۔ انہوں نے زندگی کی ہر خوبصورت چیز سے پیار کیا، جستجوئے مسلسل کی، اپنے ضمیر کے خلاف کبھی کچھ نہیں کیا۔ کسی سے حسد، کسی سے دشمنی نہیں کی، انہیں وہ قلب مطمئنہ حاصل تھا جو ذہنی مسرت کی بنیاد اور روحانی عظمت کا سرچشمہ ہے۔ 'جدید ادب' میں مایوسی کا ایک خاص عنصر دیکھ کر وہ اکثر حیران ہو جاتے تھے کیونکہ انہوں نے خود زندگی اور نیکی کی قوت پر اعتماد کبھی نہیں کھویا۔ شاید ایسے ہی اعتماد کو مذہبی لوگ جبل المتین کہتے ہیں!

جہاں تک میں جانتی سمجھتی ہوں ان کی زندگی میں صرف ایک ہی غم تھا کہ جم کر ادبی تخلیق کرنے کی مہلت نہ ملی۔ یورپ سے واپس آنے کے بعد کانگریس کے اور پارٹی کے لیے اور ساتھ ہی انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے لیے وہ ہندوستان بھر میں چکر لگاتے رہتے تھے، پھر قیام پاکستان کا دور آیا اور قید و بند آزادی کے بعد یہ گردش، قومی کے ساتھ ساتھ، بین الاقوامی وسعت بھی اختیار کر گئی۔ فرائضِ منصبی نے ہمیشہ تخلیق کا راستہ روکے رکھا۔ میری بات کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے 'روشنائی' اور 'ذکرِ حافظ' قید خانے میں لکھیں جب زبردستی پابہ زنجیر ہو کر بیٹھنا پڑا۔ میں کبھی کبھی ان سے کہتی تھی کہ اندرا بی بی سے کہوں گی تمہیں کم از کم دو سال کو قید کروا دیں تو شاید کوئی نئی کتاب ہو جائے۔ مسکرا دیتے تھے!

جمہوری دریا کی ایک موج:

ان کی وفات کے بعد میرے پاس جو بے شمار خطوط آئے ان میں دو باتیں بہت سے لوگوں نے لکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ 'سجاد ظہیر صاحب کے انتقال سے اردو کو بڑا سخت نقصان پہنچا'۔

یہ بات سچ ہے مگر یہ نہ صرف آدھی سچائی ہے بلکہ یہ کہ اس کا تجزیہ بھی کیا جانا چاہیے۔ میرے خیال میں ہم اردو دانوں کے لیے یہ سوچنا ضروری ہے کہ صرف سوشلسٹ نظام ہی ہماری مظلوم زبان کو اس کا جائز حق دلوا سکتا ہے اس لیے ہمیں اپنی زبان کے لیے جدوجہد کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ ان قوتوں کا بھی ساتھ دینا چاہیے جو صحیح معنوں میں جمہوری ہیں۔ اردو کے لیے سجاد ظہیر صاحب کی خاص اہمیت اس لیے تھی کہ وہ اسی جمہوری دریا کی موج تھے۔ الما آتا سے ان کے جو کاغذات آئے ہیں ان آخری تحریروں میں اردو کے ساتھ ساتھ سندھی اور پنجابی زبانوں کے متعلق بھی نوٹ موجود ہیں۔ یہ غور طلب امر ہے کہ ہندوستان کی ساری زبانوں کے لوگ ان کے کہے سے کیوں متفق ہو جاتے تھے، ان کا فیصلہ کیوں قبول کر لیتے تھے۔ ان کے اٹھ جانے سے صرف اردو کا نقصان نہیں ہوا، سب زبانوں کا ہوا جیسا کہ مجھے متعدد زبانوں کے لوگوں نے لکھا ہے۔ ایسا اثر صرف اس شخص کا ہو سکتا ہے جس کی بے تعصبی پر لوگوں کو بھروسہ ہو، جس کے کسی اقدام، کسی کلام کی تہہ میں ذاتی منفعت نہ چھپی ہو۔ یہ المناک سانحہ ایک موقعہ مہیا کرتا ہے کہ اردو کے عام چاہنے والے اپنے رہنماؤں کا جائزہ لیں اور اردو زبان کے سلسلے میں سجاد ظہیر کو سب سے بڑا خراجِ عقیدت یہ ہوگا کہ ان کی کسوٹی پر اور بھی کچھ لوگوں کو کسا جائے!

دوسری بات لوگوں نے اکثر خطوں میں یہ لکھی ہے کہ سجاد ظہیر صاحب کے ساتھ ادب میں ترقی پسندی کا دور ختم ہو گیا! میں یہ پڑھ کر ششدر رہ گئی۔ جن لوگوں نے ایسا لکھا ہے ان کے غم اور صدمے کی شدت کو میں سمجھتی ہوں، ان کے جذبات، محبت و عقیدت میرے لیے تسکین و تسلی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں لیکن کیا ۱۳ ستمبر کو الما آتا میں رُک جانے والے جس دل و دماغ نے اور مسلسل گردش کرنے والے جس جسم نے چالیس سال جو محسوس کیا، سوچا اور ریاض کیا، وہ سب ختم ہو گیا؟ اگر تیرہ سال کی ایک پیڑھی مانی جاتی ہے تو اس عرصے میں جو تین پیڑھیاں پروان چڑھیں کیا ان سب کی عقل اور احساس بھی ختم ہو گیا؟ انسان پر گزرنے والی مصیبتوں کے لیے ان کے دل

میں کرب اور ادب وفن کے لیے ان کی لگن بھی ختم ہوگئی؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ بے شک سجاد ظہیر کا غم شدید ہے لیکن ۔

غم پہ برقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

اب جبکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا بانی موجود نہیں، کیا ہمیں یہ سوچنا زیب دیتا ہے کہ وہ اصول ادب وفن بھی نہیں رہے جن کے لیے وہ جیا تھا؟ بیشتر ادیبوں کے بھی خطوط سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی وہ کیفیت ہے جو بزرگِ خاندان کے اُٹھ جانے سے ہوتی ہے، لیکن ہماری آزمائش کا بھی وقت ہے اور ہمیں اس یقین کے ساتھ اپنے کو منظم کرنا اور آگے بڑھتے رہنا ہے کہ ہم پریم چند، اقبال، ٹیگور، ولاتھول اور سجاد ظہیر کے جانشین ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اب تک ہندوستان میں جو رول ادا کرتی رہی وہ اب اس کو زیادہ شدت، زیادہ ذمے داری اور زیادہ لگن کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ ہمیں انجمن کی ایک کُل ہند کانفرنس کا جلد انتظام کرنا چاہیے۔ زندگی ہمارے ساتھ ہے، مستقبل ہمارا ہے، جو خواب سجاد ظہیر نے دیکھے تھے، انہیں ہم سے کون چھین سکتا ہے؟ اور یہ تو انسان نے ہمیشہ کہا، سجاد ظہیر نے ہمیشہ کہا کہ ۔

زمیں چیں برجبیں ہے آسماں تخریب پر مائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں چٹانیں راہ میں حائل
رفیقانِ سفر میں کوئی بسمل ہے کوئی گھائل

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں۔ میری زندگی میں خاص عنصر، ان کا انتظار تھا۔ قید سے واپس آنے کا انتظار، ہندوستان میں کہیں سے واپس آنے کا انتظار، دنیا کے کسی گوشے سے واپس آنے کا انتظار۔ وہ انتظار تو اب ختم ہوگیا، لیکن مجھے ان کے خوابوں کی تعبیر کا انتظار ہے، اور آخر وقت تک رہے گا۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

علی سردار جعفری

رقصِ شرر

ساری انسانیت اِک تڑپتا ہوا شعلہ ہے
اور افراد چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں کتنے ہی بے باک و بے تاب شعلے
پرورش پا رہے ہیں
اس تڑپتے ہوئے شعلے سے
جتنی چنگاریاں پھوٹی ہیں
اس طرح زندگی کل بہ آغوش چنگاریوں سے
ہر گھڑی
اِک نیا اور مہکتا ہوا ہار اپنے لیے گوندھتی ہے

کچھ تو چنگاریاں ایسی ہیں جو بھڑکتی نہیں ہیں، تڑپتی نہیں ہیں
صرف اُڑتی ہیں اور ناچ کر ایک لمحے میں کھو جاتی ہیں
موت کی سرد آغوش میں جا کے سو جاتی ہیں
لیکن ایسی بھی کتنی چنگاریاں ہیں جو خار و خس پر

لپکتی ہیں اور بجھتے بجھتے بھی دنیا اور انسانیت کو
رنگ اور نور کے ایک طوفان میں غرق کر جاتی ہیں
گرمیٔ بزم صرف رقصِ شرر تک نہیں ہے

سجاد ظہیر ایک ایسی ہی چنگاری تھے جو اب ہم میں نہیں رہے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دفن ہیں جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اور خواجہ غلام السیدین جیسے ممتاز اہل علم اور وطن دوست ابدی نیند سو رہے ہیں۔

میں سجاد ظہیر سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء کے دوران دہلی میں ملا تھا، جہاں بائیں بازو کی قوتوں نے ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک جلسہ عام منعقد کیا تھا۔ ہم دونوں وہاں تقریریں کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں اسٹوڈنٹ تحریک کی نمائندگی کر رہا تھا اور وہ کانگریس پارٹی کی، یا ہو سکتا ہے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی جو، ان دنوں غیر قانونی تھی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی کی حیثیت سے اور اردو افسانوں کے سنسنی خیز مجموعے 'انگارے' کے ایک مصنف کی حیثیت سے سجاد ظہیر مشہور ہو چکے تھے۔ برطانوی حکومت نے رجعت پرستوں اور قدامت پرستوں کے دباؤ میں آ کر 'انگارے' کو ضبط کر لیا تھا پھر بھی افسانوں کا یہ مجموعہ ہمارے ادب کا ایک موڑ بن گیا۔ سجاد ظہیر نے بھی ایک ہونہار شاعر کی حیثیت سے میرا نام سن رکھا تھا جسے ریڈیکل خیالات رکھنے کے جرم میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ ہم میں فوراً دوستی ہو گئی جو ۳۷ برس، ان کی زندگی کے آخری دن تک قائم رہی۔

مجھ پر ان کا پہلا تاثر بہت ہی خوشگوار تھا، وہ پُر خلوص، مجلسی اور نرم گفتار نوجوان نظر آئے ان کے ہاتھ بہت ہی خوبصورت اور حساس لگے۔ قلم یا چمچہ، پیالی یا کتاب اٹھانے میں ان ہاتھوں کی دھیمی حرکت سے ان میں ایک خاص کشش پیدا ہو جاتی تھی برسوں بعد ممتاز گجراتی شاعر اوما شنکر جوشی نے مجھ سے ان ہاتھوں کی خوبصورتی کی تعریف کی۔ انہوں نے کہا کہ جب وہ سجاد ظہیر سے پہلی بار ملے تو جی چاہا کہ ان کے ہاتھوں کو بس دیکھتے ہی رہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں 'بنّے بھائی' کہنا کب شروع کیا۔ وہ مجھ سے آٹھ سال بڑے تھے۔

پہلی ملاقات کے دو سال بعد ہم پھر یکجا ہوئے میں نے ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے دہلی یونیورسٹی چھوڑ دی۔ بنے بھائی اس زمانے میں لکھنؤ اور الہ آباد میں رہتے تھے اور ڈاکٹر کنور محمد اشرف اور ڈاکٹر زیڈ اے احمد کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں کام کرتے تھے جو بنے بھائی سے خاص طور سے لگاؤ رکھتے تھے۔ بنے بھائی کے سارے بڑے بھائی خوب پیسہ کما رہے تھے، لیکن بنے بھائی نے سیاسی اور تہذیبی کام کو ترجیح دی اور انہیں سرگرمیوں کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ ان دنوں کمیونسٹوں کو نئے زمانے کے اولیا سمجھا جاتا تھا جنہیں اپنی مفلسی پر ناز تھا۔

اس زمانے میں ہم نے تین چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کیں۔ سجاد ظہیر کا مختصر ناول 'لندن کی ایک رات'، مجاز کی نظموں کا مجموعہ 'آہنگ' اور میرے افسانوں کا مجموعہ 'منزل' (بعد کو میں نے افسانے لکھنا ترک کر دیا اور پوری طرح شاعری کا ہو رہا)۔

ان کتابوں سے مسلح ہو کر ہم ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۳۸ء میں کلکتہ پہنچے جہاں کرشن چندر بھی اپنی پہلی کتاب لے کر آئے تھے۔ ہم شائستہ بنگالی ادیب سدھیندر ناتھ دت کے بڑے سے گھر میں ٹھہرتے تھے جنہوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی وہیں ہماری ملاقات ایک بہت ہی اچھے مگر عالی مذاق شاعر بشنو ڈے اور نوجوان باغی بدھ دیو بوس سے ہوئی۔ ہمیں اصل مسرت اس کی تھی کہ اسی سفر میں ہم جیمنی رائے اور ان کی تصویروں سے روشناس ہوئے جو ہمارے لیے 'دریافت' سے کم نہ تھا۔ ان کی تصویروں کی قدرے مبالغہ آمیز خوبصورت بنگالی آنکھوں نے جن میں لوک کلا کی جھلک ملتی تھی، سچ مچ ہماری روح کو بیدار کر دیا۔

کانفرنس کا افتتاح گرودیو ٹیگور کرنے والے تھے جنہوں نے کسی غلط فہمی کے تحت اپنا افتتاحی خطبہ بنگالی میں لکھا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر ملک راج کو اور مجھے یہ کام سپرد کیا گیا کہ ہم ٹیگور سے ملاقات کریں اور یہ درخواست کریں کہ وہ اپنا خطبہ انگریزی میں لکھیں۔ جب ہم ان کی قدم بوسی کے لیے شانتی نکیتن گئے تو گرودیو نے کہا کہ انہیں نہ تو نیا خطبہ لکھنے کی فرصت ہے اور نہ جو وہ لکھ چکے ہیں اسے انگریزی میں ترجمہ کرنے کا وقت، البتہ انہوں نے چند بنگالی ادیبوں کے نام بتائے جو یہ

کام کر سکتے تھے۔ ان میں پروفیسر ہیرن مکرجی کا بھی نام تھا اور پھر اچانک انہوں نے ایک نوجوان بنگالی ادیب کا نام لیا اور جھنجلائی ہوئی آواز میں کہا کہ 'خدا کے لیے اس سے میرا خطبہ انگریزی میں ترجمہ کرنے کو نہ کہنا۔ جانتے ہو تم لوگ، وہ ۲۲ سال کا ہے اور چالیس کتابوں کا مصنف ہے'۔ ہم نے انہیں انکساری کے ساتھ بتایا کہ اردو کے جو ادیب اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہیں وہ صرف ایک ایک کتاب کے مصنف ہیں تو وہ مسکرا پڑے۔

کلکتہ کانفرنس ایک بڑا خوشگوار تجربہ تھی۔ بنے بھائی وہاں رضیہ کے ساتھ اپنی شادی کے فوراً ہی بعد آئے تھے۔ رضیہ ایک نوجوان دبلی پتلی لڑکی تھیں جنہیں دیکھ کر حافظ کا شعر یاد آتا تھا۔

آں سیہ چردہ کہ شیرینئ عالم بااوست

چشم میگوں، لب خندہ دل خرم بااوست

ترقی پسند تحریک میں یہ رضیہ کا پہلا ورود تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ نوجوان دلہن سے رضیہ آپا بن گئیں، اس بنے بھائی کی رفیقہ نے اپنے گرد ہندوستان کے کونے کونے سے ممتاز ادیب اور ہونہار نوجوان جمع کر لیے تھے۔ جن لوگوں نے اس تحریک کی سرپرستی کی ان میں گرودیو ٹیگور، علامہ اقبال، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، ولاتھول اور منشی پریم چند جیسی ہستیاں تھیں۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ پہلے بنے بھائی گرفتار کیے گئے۔ پھر شروع دسمبر ۱۹۴۰ء میں، میں بھی گرفتار کر لیا گیا اور مجھے لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ جیل میں رکھا گیا، جہاں میں بنے بھائی کے بڑے بھائی ڈاکٹر حسین ظہیر اور کانگریسی لیڈر چندر بھان گپتا کے ساتھ تھا۔ بنے بھائی سینٹرل جیل میں بند تھے۔ دونوں جیلوں کے بیچ میں بس ایک دیوار حائل تھی۔

جس دن میں وہاں پہنچا اسی دن ایک ہمدرد وارڈر نے ایک چھوٹا سا پرزہ لا کر دیا جو بنے بھائی نے مجھے بھیجا تھا اور قید خانے میں میرا خیر مقدم کیا تھا۔ اب تحریروں کی آمد و رفت شروع ہو گئی جو عام طور سے ادب اور شاعری کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار ایک تحریر جیلر نے پکڑ لی۔ اس نے کیٹس کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ یہ کسی بہت بڑی سازش کے لیے شناخت کا نام ہے۔ جب میں نے کتاب کھول کر اسے دکھائی اور اسے کیٹس کا ایک سانیٹ پڑھ کر سنایا تب اس احمق نے میری جان چھوڑی۔ پتہ نہیں وہ سانیٹ اس کی کچھ سمجھ میں بھی آیا تھا یا نہیں۔

بنے بھائی کے لیے اور ہم سب کے لیے خوشی کا ایک عظیم لمحہ جیل خانے سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۴۱ء کے اواخر میں آیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن نے ترقی پسند شعرا کا ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ اپنی قسم کا پہلا مشاعرہ تھا جسے 'نو وارد شعرا کا مشاعرہ' کہا گیا جس میں مجاز، فیض، مخدوم، جاں نثار، اختر، جذبی اور مجھے شرکت کے لیے مدعو کیا گیا اور لکھنؤ کے اساتذہ حاضرین میں تھے۔ یہ پروگرام بے انتہا کامیاب ہوا۔ ترقی پسند ادب بالغ ہو گیا تھا۔

اگلے سال ۱۹۴۲ء میں کامریڈ پی۔ سی۔ جوشی نے، جو اس وقت ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے، مجھے پارٹی کے اردو ہفتہ وار 'قومی جنگ' کے ادارتی عملے میں کام کرنے کے لیے بمبئی آنے کی دعوت دی۔ میں ۲۱ جون ۱۹۴۲ء کو بمبئی پہنچا۔ چند دنوں میں بنے بھائی بھی بمبئی پہنچ گئے اور ہم دونوں نے پارٹی کے پہلے اردو رسالے کا پہلا شمارہ نکالا۔ یہ ہمارے ساتھ رہنے اور کام کرنے کی سب سے طویل مدت کا آغاز تھا، کچھ دنوں بعد ڈاکٹر اشرف بھی آ گئے، پھر سبط حسن آئے اور پھر کیفی اعظمی، علی اشرف، محمد مہدی، ظ۔ انصاری، کلیم اللہ اور بہت سے دوسرے لوگ بھی آ گئے۔

ہم پارٹی کمیون میں رہتے اور کھاتے تھے جس کا نام پتہ نہیں کیوں راج بھون تھا۔ ہماری ماہانہ اُجرت چالیس روپے تھے (بنے بھائی ایک الگ گھر میں والکیشور روڈ پر رہتے تھے) ہم مضامین لکھتے، کاپیاں جڑواتے، انہیں پریس لے جاتے اور جب اخبار چھپ چکتا تو پوری ادارتی ٹیم اخبار فروش بن جاتی اور سڑکوں پر جا کر چیخ چیخ کر اخبار بیچتی۔ اس سے عوام پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

پارٹی کمیون کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی۔ مہاتما گاندھی نے بھی اس کے وجود سے دلچسپی ظاہر کی۔ جن ادیبوں کا پارٹی سے باضابطہ تعلق نہیں بھی تھا وہ بھی آتے اور ہمارے ساتھ چند دن رہتے اور کمیونسٹ رفاقت کا خوشگوار تجربہ ساتھ لے کر واپس جاتے۔ فیض فوج میں بھرتی ہو گئے تھے، پھر بھی وہ ایک دن کے لیے آئے۔ مجاز ہمارے ساتھ چند مہینے رہے اور انہوں نے اخبار میں کام بھی کیا۔ ان کی اُجرت صرف چائے اور کھانا تھی۔ اس سے زیادہ کا انہوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ جوش ملیح آبادی اور سمترا نندن پنت کبھی کبھار آ جاتے تھے۔ وہ پی۔ سی۔ جوشی کے دوست تھے۔ جوش نے پارٹی کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کا سنہرا دور تھا جو ساری زبانوں پر محیط تھی اور اس نے ادب کا بہت بڑا اور بہت اچھا ذخیرہ پیش کیا۔ ہندوستان میں اتنی زبردست تہذیبی تحریک اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھی۔ ہماری تحریکِ آزادی سے اس کی گہری وابستگی تھی۔ 'ترقی پسند' کا لفظ باعثِ افتخار بن گیا۔

بنے بھائی کی شخصیت اور ایک بانظریہ تحریک کے بارے میں ان کے تصور کے گرد اردو کے چھوٹے بڑے تقریباً سارے ادیب جمع ہو گئے۔ وہ لوگ بھی جو ہم سے متفق نہیں تھے، جیسے جگر مرادآبادی، ہمارا بہت احترام کرتے تھے اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا کہ 'قومی جنگ' ادارت کے نقطۂ نظر سے اردو زبان کا بہترین اخبار ہے، لیکن ہر چیز کی بقاء کے لیے مخالفت ضروری ہے۔ کمیونسٹ دشمن نوجوان ادیبوں کی بھی ایک جماعت تھی جو ہمیں ناپسند کرتی تھی اور تجربہ پرستوں کا ایک گروہ تھا جو فن و ادب کو کسی بھی نظریئے سے آلودہ کرنے کے خلاف تھے۔ ان کی اپنی تنظیم تھی جس کا مرکز لاہور میں تھا۔

سجاد ظہیر کا گھر، بیکری بھون، ہماری ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہیں ترقی پسند ادیبوں کے ہفتہ وار جلسے ہوتے، نئی نظمیں، کہانیاں اور مضامین پڑھے جاتے، ان پر بحث مباحثہ ہوتا، تنقید ہوتی جس کا خلاصہ اردو رسالوں میں چھپتا اس سے اردو کی تخلیقی تحریر پر بہت گہرا اثر پڑا۔

کچھ عجیب اتفاق تھا کہ ان دنوں اردو کے بہت سے صفِ اول کے ادیب بمبئی اور پونا میں آ گئے تھے، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، مجاز، مہندر ناتھ، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، سبط حسن، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی اور دوسرے لوگ، یہ سب تو ترقی پسند تھے لیکن جو ہم سے اختلاف بھی رکھتے تھے، جیسے میراجی اور اختر الایمان، وہ بھی ہمارے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پطرس بخاری اور جگر مرادآبادی جیسے ادبی عمائدین جب بمبئی آتے تو کوشش کر کے ہمارے جلسوں اور مباحثوں میں شریک ہوتے۔ اس وقت ہندوستانی اسٹیج پر 'انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن' چھایا ہوا تھا اور ادبی دنیا میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دور دورہ تھا۔

بنے بھائی انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکریٹری تھے اور سلطانہ ان کی پی۔اے تھیں۔

ہم دن میں پارٹی آفس میں کام کرتے تھے، بنے بھائی 'قومی جنگ' کے ایڈیٹر تھے، اور شام کو

فن وادب پر تبادلہ خیالات کرتے۔ ہم مارکسزم کی روشنی میں کلاسیکی اساتذہ کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کرتے اور اس طرح کے سوالات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے کہ غالب اور میر، تلسی اور کبیر کیسے ہمیں آج بھی کوئے فکر عطا کرتے ہیں۔ ادب کی دائمی قدریں کیا ہیں۔ ہم ریمبو، ملارمے اور بودلیئر کی فنکارانہ خوبیوں پر طویل مباحثے کرتے۔ یہ شاعر فرانسیسی زوال پسندوں کی حیثیت سے مشہور تھے۔ بنے بھائی نے اصل فرانسیسی میں ان کا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے صرف انگریزی ترجمہ پڑھا تھا۔ ہماری بحثوں میں کافکا کا نام اکثر آجاتا تھا۔

مصوری کے بارے میں بنے بھائی مجھ سے بہتر علم اور سمجھ رکھتے تھے۔ انہیں سیزان، گوگاں اور پکاسو کی تخلیقات پسند تھیں اور ریمبو، ملارمے اور بودلیئر کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ فرانسیسی زوال پسندوں کی مذمت کرتے ہوئے انہوں نے ایک مضمون لکھا 'شعر محض'۔ لیکن اس میں کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے لیے اپنی ایک انفرادی اور نجی جمالیاتی دنیا رکھتا ہے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بنے بھائی کے رویئے میں تبدیلی آگئی تھی اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ 'شعر محض' کو اپنے مضامین کے مجموعے میں شامل نہیں کرنا چاہتے۔

مجھ میں اور بنے بھائی میں اقبال شناسی پر ہمیشہ دوستانہ جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ اقبال کی شاعری نے مجھ پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ انہوں نے فیض اور مخدوم جیسے انقلابیوں کو بھی متاثر کیا تھا باوجود اس کے کہ ان میں مسلم قدامت پرستی کی ایک رَو تھی۔ وہ پہلے اردو شاعر تھے جنہوں نے ۱۹۱۹ء میں روسی انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا۔ ابتداء میں بنے بھائی اس تضاد کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے جو لینن نے تالستائی میں اور گورکی نے پشکن میں دیکھا تھا۔ لیکن یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بعد کو انہوں نے اقبال کے بارے میں اپنی رائے بدل دی۔ بنے بھائی سے میری آخری ملاقات اس سال مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں ہوئی تھی جب انہوں نے دہلی یونیورسٹی میں اقبال پر سیمینار کا افتتاح کیا اور میں نے اقبال پر ایک مقالہ پڑھا۔ یہ سیمینار اقبال کے صد سالہ جنم دن کی تیاری کے سلسلے میں ہوا تھا جو ہندوستان، پاکستان اور سوویت یونین ۱۹۷۶ء میں منائیں گے۔

ملک کی تقسیم کے بعد بنے بھائی ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے تاکہ وہاں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم

کریں۔ شروع میں وہ روپوش رہے اور پھر چند سال بعد انہیں فیض اور پاکستان کے چند فوجی افسروں کے ساتھ 'راولپنڈی سازش کیس' میں ملوث کرلیا گیا۔ سزا کے بعد انہیں بلوچستان کی ایک جیل میں رکھا گیا۔ انہوں نے پاکستان کی جیلوں میں پانچ سال کاٹے۔ سرکاری وکیل نے ان کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا لیکن اس سے ڈرنے کے بجائے فیض نے جیل میں اپنی بہترین نظمیں اور غزلیں کہیں اور سجاد ظہیر نے اپنے ادبی تاثرات اور یادوں کی کتاب 'روشنائی' لکھی اور ایران کے عظیم غزل گو شاعر حافظ پر ایک کتاب لکھی۔ ان کٹھن دنوں میں، اپنے گھر سے، بیوی بچوں سے دور انہیں صرف ان کے عقائد کی پختگی نے ہمت و حوصلہ عطا کیا۔

رضیہ آپا لکھنؤ میں اپنی پیاری بیٹیوں کی پرورش کرنے کی جدوجہد اکیلی کرتی رہیں۔ انہوں نے ان کٹھن دنوں میں بے مثال ہمت کا ثبوت دیا۔ جب بنے بھائی پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں جیل گئے تو رضیہ آپا نے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے کر اردو ادب میں ایم۔اے کیا اور جب بنے بھائی پاکستان کی جیلوں میں قید رہے اور موت کے سائے تلے پاکستان کی جیلوں میں قید رہے تو رضیہ آپا اعلیٰ درجے کی افسانہ نگار بن گئیں۔

سجاد ظہیر اور فیض پاکستان میں قید ہی تھے جب مجھے دسمبر ۱۹۵۴ء میں ماسکو میں سوویت ادیبوں کی دوسری کانگریس میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ جب میں نے ایوان چہل ستون میں تقریر کی اور ہندوستانی ادیبوں کی طرف سے تحفے کے طور پر فیض کی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ اور سجاد ظہیر کا نام پیش کیا تو کانگریس کے تمام شرکت کنندگان نے کھڑے ہوکر دیر تک تالیاں بجائیں۔ یہ ہندوستانی اور پاکستانی دانشوروں کو، جن کے رہنما سجاد ظہیر اور فیض تھے۔ سوویت ادیبوں کا خراج عقیدت تھا۔ ہم سب کے لیے فخر سے سربلند کرنے کا ایک لمحہ تھا۔

ہندوستان کی تحریک اور ساری دنیا کے دانشوروں کی مہم کے دوہرے دباؤ کے زیر اثر بنے بھائی کو ۱۹۵۵ء میں رہا کیا گیا اور وہ ہندوستان واپس آ گئے پہلے وہ لکھنؤ میں رہے اور پھر دہلی میں سکونت پذیر ہو گئے جہاں وہ کمیونسٹ پارٹی کے کلچرل لیڈر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

ہندوستان آنے کے سال بھر کے اندر اندر انہوں نے ڈاکٹر ملک راج آنند کے ساتھ مل کر نئی دہلی میں ایشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس منظم کی جو بالآخر افریشیائی ادیبوں کی زبردست تحریک بن

گئی۔ جو ترقی پذیر ملکوں کے سامراج دشمن تخلیقی ادب کے لیے ایک پر قوت فورم، انسان کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کی تحریک ہے۔

اپنی زندگی کے آخری دس برسوں میں انہوں نے کچھ نظمیں لکھیں اور ان کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ 'پگھلا نیلم' یہ متنازعہ کتاب ہے بعض لوگ شاعری کی تعریف کے بارے میں اپنے قدامت پسندانہ رویے کی وجہ سے اسے اچھی شاعری نہیں مانتے، لیکن اس میں سجاد ظہیر کے نازک جذبات اور ان کی حساسیت پوری طرح نظر آتی ہے۔ ان میں سے بعض نظموں کے ترجمے روسی زبان میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

بنّے بھائی نے صرف چار کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، لیکن ان کا اصلی تخلیقی کارنامہ ہے ان سینکڑوں نئے ادیبوں کی صورت میں برصغیر کی بہترین تخلیقی صلاحیت کا اجاگر کرنا جسے انہوں نے اور ان کی تحریک نے سوئے فکر اور بلندی تخیل عطا کی۔

ان کی شخصیت بہت ہی دلکش تھی اور ان میں بڑی نفاست تھی۔ انہوں نے ہندوستانی اور مغربی تہذیبوں کے بہترین حصوں کو اپنے آپ میں سمو لیا تھا۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ انہیں وہ لوگ بھی پسند کرتے تھے جو ان کے سیاسی خیالات سے اختلاف رکھتے تھے۔

وہ خود زندگی کی ساری اچھی چیزوں کا شوق رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ چیزیں ساری انسانیت کو حاصل ہوں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی ساری زندگی رضاکارانہ مفلسی میں، انسانیت کے مقصد کے لیے وقف کر دی۔ لینن کے الفاظ ان پر پوری طرح صادق آتے ہیں:

> 'انسان کی عزیز ترین ملکیت ہے زندگی، اور یہ چونکہ اسے بس ایک ہی بار ملتی ہے اس لیے اس کو اس طرح جینا چاہیے کہ وہ کسی بزدلانہ اور حقیر ماضی کی شرمندگی سے جھلسے نہیں، اس طرح جینا چاہیے کہ اسے ان برسوں کی اذیت نہ ہو جو بے مقصد گزرے، اس طرح جینا چاہیے کہ مرتے وقت وہ کہہ سکے کہ 'میری ساری زندگی اور ساری توانائی دنیا کے اہم ترین مقصد نوعِ انسانی کی آزادی میں صرف ہوئیں'۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

کیفی اعظمی

قومی جنگ

پارٹی کی تنظیم اور مزدور طبقے کو منظم اور متحرک کرنے کے لیے پارٹی اخبار کی جو اہمیت لینن نے بتائی ہے اس کا بنے بھائی کو انتہائی شدید احساس تھا۔ جب جب پارٹی کا اردو اخبار نکلا اس میں ہمیشہ سب سے بڑا حصہ بنے بھائی کا رہا ہے۔ پارٹی کے لیے لکھنے والوں کی ایک ٹیم تیار کرنا، اخبار کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنانا انہیں کا حصہ تھا۔ ہمارا 'قومی جنگ' بنے بھائی جس کے ایڈیٹر تھے اس وقت اتنا مقبول ہفتہ وار تھا کہ میں نے مولانا حسرت موہانی کو کہتے سنا:

'یا تو کبھی'' ہمدرد'' ایسا تھا، یا'' الہلال'' یا اب'' قومی جنگ'' کو اتنی مقبولیت حاصل ہے'۔

جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طالب علم 'قومی جنگ' کی پالیسی سے متفق نہیں تھے لیکن لڑکوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ 'قومی جنگ' پڑھیں اور دیکھیں کہ اس ہفتہ وار نے اردو صحافت کی زبان اور معیار کو کہاں پہنچایا ہے۔

میں کانپور میں رہتا تھا زندگی میں بھی بے انتہا زاجیت تھی اور تصورات میں بھی۔ اسی زمانے میں دو تین شمارے مجھے 'قومی جنگ' کے ملے۔ میں نے پرچہ دیکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب استالین، گراڈ کی لڑائی ہو رہی تھی۔ میں نے ایک چھوٹی سی نظم کہی اور ایک مختصر سے خط کے ساتھ اسے 'قومی جنگ' کو بھیج دیا۔ مجھے کوئی امید نہیں تھی کہ پارٹی کے اخبار میں میری نظم چھپ سکے گی لیکن کچھ دنوں بعد جب 'قومی جنگ' کا شمارہ ملا تو میں نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ نظم چھپی ہوئی ہے بلکہ انہوں نے

میرا خط بھی چھاپ دیا ہے، پارٹی اخبار میں اپنی نظم دیکھ کر وہ دن میرے لیے اتنی خوشی کا دن تھا کہ دوبارہ ایسی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔

اسی زمانے میں بنّے بھائی لکھنؤ آئے اور وہاں سے مجھے بمبئی لے آئے، پارٹی میں میری حیثیت اس وقت بالکل کچی مٹی کی تھی۔ وہ بھی ان گھڑ۔ بنّے بھائی مجھے لائے اور آج میں جو کچھ ہوں انھیں کا بنایا ہوا ہوں۔ ہمارے تعلقات بالکل دوستانہ اور رفیقانہ تھے لیکن میرے لیے بنّے بھائی کی حیثیت دوست یا رفیق کی نہیں تھی۔ میرے والد کو مرے ہوئے کافی دن ہو چکے ہیں، لیکن اس سے پہلے یتیمی کا اتنا شدید احساس کبھی نہیں ہوا جتنا اس دن ہوا جس دن میں نے یہ منحوس خبر پڑھی کہ بنّے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔

فروری میں جب مجھ پر فالج کا حملہ ہوا اور میں اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اس وقت موت سے لڑنے کی جو قوت پیدا ہوئی وہ بنّے بھائی کے کچھ خطوں سے پیدا ہوئی۔ اس وقت وہ اتنے پریشان تھے اور اس قدر تڑپ تڑپ کے مجھے خط لکھ رہے تھے کہ مجھے بار بار وہ تاریخی واقعہ یاد آتا کہ جب ہمایوں بیمار تھا تو بابر کی کیا کیفیت تھی۔

بنّے بھائی کے کارنامے بیان کرنے کی نہ مجھ میں صلاحیت ہے اور نہ کسی چھوٹے سے مضمون میں اس کی گنجائش ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اردو ادب میں اس کی دوسری کوئی مثال کم سے کم میری نظر میں نہیں ہے۔

میرا تعلق ترقی پسند مصنفین سے بھی ہمیشہ رہا ہے اور مختلف ٹریڈ یونینوں سے بھی اس لیے میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ادیبوں کی تنظیم سب سے مشکل کام ہے۔ بنّے بھائی نے جس کامیابی سے اس کام کو انجام دیا وہ ہم سب کے لیے ایک مینار ہدایت ہے۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر جی۔ادھیکاری

سُبک رو اور شیریں گفتار انقلابی

میرے لیے اب تک اس تلخ حقیقت کو قبول کرنا بہت مشکل ہے کہ اب ایسا کبھی نہ ہوگا کہ بنے بھائی اپنی مہربان شخصیت اور مسکراتے ہوئے چہرے سمیت اجے بھون میں داخل ہوں اور دور ہی سے مجھے مخاطب کریں، 'ادھیکاری بھائی کسی دن ہم لوگوں کے ہاں آؤ، بیٹھیں گے، اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے'۔ یہ تھے بنے بھائی اپنی نمایاں اور ممتاز خصوصیتوں اور کارناموں کے علاوہ وہ اپنے ساتھیوں اور ہمکاروں کے لیے بہت ہی مہربان اور بڑے اچھے دوست بھی تھے۔ اتنی نرمی سے باتیں کرنے والے اور دوسروں کی باتوں کو سننے اور سمجھنے والے کہ ان کی دوستی ایک بے مثال چیز اور انہیں کی ذات سے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔

بنے بھائی کا تعلق، ان نوجوان ہندوستانی وطن دوستوں کے گروہ سے تھا جنھوں نے چوتھی دہائی کے شروع میں انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی اور پردیس ہی میں کیمونسٹ تحریک سے متاثر ہوئے اور وطن واپس آ کر ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ڈاکٹر کے۔ایم۔اشرف، ڈاکٹر زیڈ۔اے۔احمد، ہاجرہ بیگم اور کامریڈ ہیرن مکرجی ان کے ہم عصروں میں تھے۔ بنے بھائی کی سیاسی سرگرمیاں آکسفورڈ میں شروع ہوئیں جہاں طالب علم کی حیثیت سے انہوں نے وہاں کے ہندوستانی طالب علموں میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے قومی انقلابی پروگرام کو مقبول بنانے کے لیے ایک رسالہ نکالا 'بھارت'۔ چوتھی دہائی کے وسط میں ہندوستان آنے کے بعد وہ فوراً ہی

پارٹی میں شامل ہو گئے اور یو پی کے ساتھیوں کے ساتھ، جو سختی اور ظلم کے ایک دور کے بعد مزدوروں اور کسانوں کی تحریک کو دوبارہ سرگرم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ بھی فعال کام میں لگ گئے۔
۱۹۳۶ء میں جب میں دکن میں بیجاپور میں قید تھا تو میں نے سنا کہ کانپور اور الٰہ آباد میں مزدوروں کے جلوس، ایک گیت کی لے پر مارچ کرتے ہیں۔

مزدوروں نے ملکوں ملکوں جھنڈا لال اٹھایا ہے

جو بھوکا تھا جو ننگا تھا، اب غصہ اس کو آیا ہے

بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ یہ گیت بنے بھائی نے لکھا ہے۔ وہ پارٹی کے عملی کارکنوں کی صفوں میں شامل ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۶ء ہی میں انہوں نے ملک راج آنند اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ اس زمانے کی ان باغیانہ تحریروں پر رجعت پرستوں نے تو بڑی ناک بھوں چڑھائی لیکن ان تحریروں سے بائیں بازو کے ان لوگوں میں بڑا جوش اور حوصلہ پیدا ہو گیا جو سماجی ترقی کے لیے لڑ رہے تھے۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں، اس نیم قانونیت سے فائدہ اٹھا کر جو کانگریسی وزارتوں نے بہم پہنچائی تھی، جب ہم نے بمبئی سے 'نیشنل فرنٹ' نکالنا شروع کیا تو سجاد ظہیر اس کے دقیع اور اہم قلمی معاونوں میں تھے اس سال جب مرحوم محمود الظفر اور ان کی بیوی رشید جہاں نے دہرہ دون میں ایک ۱۵ روزہ کیمپ کی حیثیت سے مرکزی پارٹی اسکول کا اہتمام کیا تو اس اسکول میں سجاد ہمارے اہم لیکچروں میں سے تھے۔ پھر اسی زمانے میں دوسرے کمیونسٹوں کے ساتھ سجاد بھی کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں کام کرتے تھے یہاں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی سیاسی پالیسی میں بائیں بازو کی طرف جھکاؤ پیدا کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے دنکر مہتا اور سولی باٹلی والا کے ساتھ مل کر ایک متبادل سیاسی قرارداد پیش کی۔ سجاد کانگریس میں بھی کام کرتے تھے اور چوتھی دہائی کے اواخر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ جب دوسری جنگِ عظیم چھڑی تو سجاد پارٹی کی جنگ مخالف لائن کی سرگرم حمایت کر رہے تھے اور انڈین نیشنل کانگریس کے رام گڑھ اجلاس (مارچ ۱۹۴۰ء) کے فوراً ہی بعد دوسرے کمیونسٹوں اور بائیں بازو والوں کے ساتھ انہیں بھی جیل میں بند کر دیا گیا۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں جیل سے چھوٹنے کے فوراً ہی بعد وہ بمبئی میں پارٹی ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئے

اور انہوں نے پارٹی کے اردو ترجمان 'قومی جنگ' کی ادارت سنبھالی۔ ان دنوں بنّے بھائی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تھے اور اس کے سارے اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے مسلم سوال پر بہت سے پمفلٹ بھی لکھے اور پارٹی کے تنظیمی کام میں بھی مدد کی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم دونوں کو پنجاب میں پارٹی کے ایک مشکل تنظیمی مسئلے کو سلجھانا پڑا تھا تو سجاد نے کتنی مدد کی تھی اور تلخی اور غصے کو دور کرنے میں اور اتحاد بنائے رکھنے میں ان کا اثر کتنا کارگر ثابت ہوا تھا۔

فروری ۱۹۴۸ء میں کلکتہ میں ہماری دوسری پارٹی کانگریس میں، جو متحدہ ہندوستان کی آخری کانگریس تھی، پاکستان میں ایک علیحدہ کمیونسٹ پارٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سجاد ظہیر مرکزی کمیٹی کے ممبر چنے گئے تھے اور ان سے کہا گیا کہ وہ پاکستان جائیں اور وہاں کمیونسٹ پارٹی کو منظم کرنے کا کام سنبھالیں۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اور اس وقت شاید ہی کسی کو اندازہ رہا ہو کہ یہ کام کتنا مشکل ہو جائے گا، لیکن سجاد نے اس کام کو ہمت اور جوش کے ساتھ قبول کرلیا۔

دوسری پارٹی کانگریس کے بعد ۱۹۴۹ء میں ہندوستان میں پارٹی پر سختیاں اور مظالم شروع ہوئے اور پھر اسے نیم قانونی حالات میں کام کرنا پڑا۔ پاکستان میں حالات اس سے بھی خراب تھے۔ سجاد نے پاکستان کے علاقے کی کمیونسٹ پارٹی کو از سر نو منظم کیا اور پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری چنے گئے جسے شروع ہی سے سخت روپوشی کے حالات میں خفیہ کام کرنا پڑا۔ اس زمانے میں برطانوی اور امریکی سامراجیت ایک طرف تو سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں کے خلاف سرد جنگ کی اشتعال انگیزیوں کی پالیسی پر اور دوسری طرف ان نو آزاد ملکوں کے خلاف جو اپنی آزادی کو مستحکم بنانے کے لیے کوشاں تھے، دباؤ اور بلیک میل کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔

پاکستانی کمیونسٹ پارٹی سجاد ظہیر کی رہنمائی میں ایک آزاد اور خود مختار پاکستان کے لیے سامراجیو! ایشیا چھوڑ دو، مہم اور کوریا کے ساتھ سالمیت کے لیے مہم چلا رہی تھی۔ فیض احمد فیض 'پاکستان ٹائمز' میں ان کے حق میں لکھ رہے تھے۔ وہ پاکستان میں امن تحریک کے لیڈر تھے اور عالمی امن کونسل کے ممبر تھے۔ پاکستان کے ادیب اپنی نظموں، کہانیوں اور مضامین کے ذریعے حکمرانوں کی امریکہ نواز پالیسیوں پر حملے کر رہے تھے جن کے اقدامات پاکستان کے عوام کی مرضی

اور ان کے مفاد کے خلاف تھے۔ لیاقت علی خان کو اس سب میں سازش کی بو آئی اور نام نہاد 'راولپنڈی سازش کیس' کھڑا کیا جس میں سجاد ظہیر، فیض، سبط حسن کو ماخوذ کیا گیا اور اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ انہوں نے میجر جنرل اکبر خاں اور دوسرے اعلیٰ فوجی افسروں کے ساتھ مل کر پاکستان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی تھی۔

ایک دہشت پسندانہ مقدمے کا سماں باندھا گیا۔ اس کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان نے پبلک تائید حاصل کرنے کے لیے کچھ خطوط پڑھ کر سنائے جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ انہیں ان کے بعض دوستوں نے لکھے ہیں اور یہ مطالبہ کیا ہے کہ ملزموں کو بغیر کسی مقدمے یا تفتیش کے گولی ماردی جائے۔ مقدمے کی کارروائی کو خفیہ رکھ کر اور بیرونی طاقتوں کی چالوں کی طرف ڈھکے چھپے اشارے کر کے یہ کوشش کی گئی کہ پاکستان کے پریس کے جنونی حلقوں کو ملزموں کے خلاف برافروختہ کر دیا جائے لیکن اصلی صورت حال ایک اپیل نے بالکل صحیح صحیح بے نقاب کر دی۔ یہ اپیل ہندوستانی ادیبوں اور فنکاروں نے جاری کی تھی اور اس میں مطالبہ کیا تھا کہ ملزموں کو اپنی صفائی پیش کرنے اور اپنی رہائی حاصل کرنے کے لیے پوری سہولتیں دی جائیں۔

'گرفتاریاں، سامراجی سازشوں کے پس منظر میں ہوئی ہیں۔ لیاقت حکومت کے ذریعے سامراجیت پاکستانی فوجوں کو کوریا بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پاکستان کی سرزمین پر اہم جنگی اڈے قائم کرنے کے لیے گفت وشنید ہو رہی تھی۔ پاکستان کی مسلح افواج میں ان سوالوں پر اور کشمیر کے سوال پر اختلاف پیدا ہوئے تھے جن کو بہانہ بنا کر ان افسروں پر ایک 'سازش کیس' چلا دیا جو حکمراں طبقے کی پالیسیوں کی مخالفت کرتے تھے اور کیس اس طرح تیار کیا گیا کہ اس میں حزب مخالف کے عناصر کو، خاص طور سے پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی ماخوذ کر لیا جائے'۔

اس اپیل پر بائیں بازو کے ایسے ممتاز ادیبوں اور فنکاروں نے دستخط کیے جیسے کہ ڈاکٹر ملک راج آنند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، آر۔ کے۔ کرنجیا، رومیش تھاپر، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ضیا سرحدی، میکش، جیراج اور نرگس وغیرہ، ظہیر، فیض اور سبط حسن کی رہائی کے لیے ہندوستانی مہم کے دوران میں ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا:

'مجھے یقین ہے کہ سجاد ظہیر کو اگر اپنی صفائی کا موقع دیا جائے تو وہ اپنے اوپر

الزام عائد کرنے والوں کی تردید اسی طرح کریں گے جیسے کہ برلن میں رائش تاغ کی آتش زدگی کے مقدمے کے ہیرو نے عام شرم وحیا کے ان تباہ کاروں، گورنگ اور اس کے پٹھوؤں کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔ وہ ترقی اور خوشی کی اس زبردست اساس، اس عظیم الشان نظم کو تباہ نہیں کر سکتے جس کی ایک علامت سجاد ظہیر ہیں۔

اور ایسا ہی ہوا۔ ہندوستان میں اور ساری دنیا میں امن وترقی کی قوتوں نے ان کی رہائی کے لیے جو مہم چلائی تھی اس کے دباؤ کے تحت اور خود پاکستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کے زیر اثر سجاد ظہیر اور دوسرے لوگ بالآخر رہا کیے گئے۔ ظہیر ہندوستان واپس آ گئے، اپنے بیوی بچوں سے ملے اور پھر سے ہندوستان کی پارٹی میں مزدوروں کے محاذ پر اور کلچرل محاذ پر کام کرنے لگے۔ وہ بہت ہی سخت آزمائش سے گزرے تھے، لیکن پھر بھی ویسے کے ویسے ہی دوست نواز، شیریں گفتار اور سبک رو، لیکن اپنے کام میں اور پارٹی سے وفاداری میں بلا کے ثابت قدم اور محکم بنے بھائی تھے۔

اپنی زندگی کی آخری دو دہائیوں میں بنے بھائی پہلے پارٹی کے اردو ہفتہ وار کے انچارج رہے اور پھر ترقی پسند ادیبوں کے محاذ پر اور پارٹی کے کلچرل محاذ پر کام کرتے رہے، یہاں اور دوسرے ملکوں میں کانفرنسوں میں شرکت کرتے، مضامین لکھتے۔

آخری بار ان سے جی بھر کر دوستانہ بات چیت کا موقع مجھے ۱۹۷۰ء میں ملا تھا۔ شملے میں ان سے ملاقات ہو گئی جہاں وہ اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کے ساتھ چھٹیاں منانے گئے تھے۔

پارٹی کے لیے، مزدور طبقے کے لیے، ملک کے لیے ان کے انتھک اور بے لوث کام کی خوشگوار روشنی، ترقی پسند اور صحت مند طبقے کے لیے ان کی جدوجہد ہمارے راستے کو روشن رکھے گی۔ اور ان کی دوستی کی چھوٹ ہمارے دلوں کو برماتی رہے گی اور ہمارے کام میں ہم کو ہمت وحوصلہ عطا کرے گی۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

ہرش دیو مالویہ

بنّے بھائی۔ کچھ بیتی یادیں

بات ۱۹۳۶ء کی ہے۔ اس سے ایک سال پہلے الہ آباد میں کمیونسٹ پارٹی کا پہلا گروپ بنا تھا اور میں ضلع کمیٹی کا سکریٹری تھا۔ تب ہم کانگریس میں تھے اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی الہ آباد شاخ کے بھی ہم لوگ کرتا دھرتا تھے ہم نے تب ہی سنا کہ چند ولایت کے پڑھے اصحاب الہ آباد آنے والے ہیں اور ان میں سے کچھ کو اس وقت کے کانگریسی صدر جواہرلال نہرو آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ذمے دار عہدوں پر لانے والے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اقتصادی ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری ہو کر آئے اور مرحوم ڈاکٹر کنور محمد اشرف اقلیت ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری ہو کر آئے۔ بنّے بھائی بھی اسی وقت الہ آباد آئے اور اپنے والد سر سید وزیر حسن کے ساتھ اسٹینلی روڈ اور کیننگ روڈ کے چوراہے کے کونے کے ایک بڑے عالیشان مکان میں رہنے لگے۔

یہ تینوں صاحبان جلد ہی کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر ہو گئے۔ بنّے بھائی تو شاید اس پارٹی کی نیشنل ایگزیکٹو کے بھی رکن تھے بہرحال الہ آباد میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں یہ سب حصہ لیتے تھے۔ اسی زمانے میں ہم لوگوں نے سوراج بھون میں ایک ہفتے کے لیے سوشلسٹ لیکچر سلسلے کا بھی اہتمام کیا جس میں پہلی تقریر جواہرلال نہرو نے کی۔ بنّے بھائی، احمد، اشرف نے بھی تقریریں کیں۔

ہم الٰہ آباد کمیونسٹوں کا جس کمیونسٹ لیڈر سے رابطہ تھا وہ تھے مرحوم کامریڈ رودرت بھاردواج۔ وہ پولیٹ بیورو کے رکن تھے اور سینٹرل کمیٹی کی طرف سے یو۔ پی پارٹی کے انچارج۔ کامریڈ بھاردواج نے ہم لوگوں سے پوشیدہ طور پر کہہ دیا کہ بنّے، احمد، اشرف کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں تو ہیں پر کمیونسٹ پارٹی کے ہمدرد ہیں اور ان سے دوستانہ تعلقات رکھو۔

اس وقت جواہر لال نہرو الٰہ آباد شہر کانگریس کمیٹی کے بھی صدر تھے۔ انہوں نے شہر کانگریس کمیٹی کے تین سیکریٹریوں میں ایک سیکریٹری سجاد ظہیر کو بنایا۔ اس حیثیت سے بنّے روز ہی شام کو ضرور شہر کانگریس کے دفتر آتے تھے اور ان سے روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔ پھر کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں تو ملنا ہوتا ہی تھا۔

شہر کانگریس کے دفتر سے اٹھ کر تقریباً روز ہی میں اور بنّے بھائی، چوک کے پاس لوک ناتھ نام کے ایک ٹھیٹ ہندوستانی محلے میں پان کھانے جاتے تھے۔ ویسے بنّے پان کے شوقین نہیں تھے پر دوستوں سے دوستی اور دوستوں کے مزاج کا خیال رکھنا ان کے مزاج کا خاصہ تھا جس سے وہ ہر کسی کا دل موہ لیتے تھے۔ بنّے سندر تو تھے ہی پھر ان کی چال ڈھال، ان کی شائستگی، ان کی سادگی ہر بات دل پر اثر کرتی تھی۔ لوگ گھیر لیتے کہ یہ کون ہے اور جب پتہ لگتا کہ سر سید وزیر حسن جیسے نامی گرامی بڑے آدمی کا بیٹا ولایت پاس کر کانگریس میں شامل ہو گیا ہے تو وہ بڑے ہی خوش ہوتے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگوں سے بنّے بھائی کی دوستی بڑھتی ہی گئی اور ہم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ویسے میں اور تب کی الٰہ آباد کمیونسٹ پارٹی کے میرے ساتھی رمیش چندر سہنا آپس میں بات کرتے کہ 'یار بنّے، ڈاکٹر احمد وغیرہ کی باتیں اور رویہ تو کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا ہے نہیں، آخر یہ لوگ ہیں کیا۔ ہم لوگوں کی یہ رائے بنتی گئی کہ ہو نہ ہو یہ کمیونسٹ ہیں، مگر اس وقت ٹھیک اس بات کا پتہ نہیں لگا۔

مگر کچھ عرصے بعد بات صاف ہو گئی۔ ٹھیک یاد تو نہیں کہ کب پر الٰہ آباد کمیونسٹ پارٹی کی ضلع کمیٹی کی میٹنگ میں بنّے شامل ہونے لگے۔ پھر وہ اتر پردیش کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری ہو گئے۔ اتر پردیش پارٹی کی صوبائی کمیٹی نے ایک سیکریٹریٹ بنایا جس کے ارکان میں بنّے بھائی کے علاوہ میں اور کامریڈ بھاردواج شامل تھے تب کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی قرار دی جا چکی تھی اور کام کرنا

پُرخطر تھا۔ پارٹی کا ٹیکنیکل اپریٹس میرے سپرد تھا۔

اب بنے بھائی کے ساتھ میری رفاقت میں اضافہ ہو گیا۔ اکثر پارٹی سیکریٹریٹ کی میٹنگ ان کے گھر پر ہوتی تھی جو سر سید وزیر حسن کا شاندار بنگلہ تھا۔ ہم گلی کوچے کے رہنے والے نچلے متوسط طبقے کے لوگ اس بڑی کوٹھی میں جاتے ہوئے گھبراتے تھے کہ کوئی ٹوک نہ دے۔ پر ایسا کبھی نہ ہوا۔ اسی کوٹھی کے باہر وارنڈے سے ہی اوپری منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ جہاں ایک بڑے کمرے میں بنے بھائی کی اسٹڈی تھی۔ کمرے بھر میں کتابیں بکھری پڑی رہتی تھیں وہیں ہم بیٹھتے، باتیں کرتے اور میٹنگ ہوتی۔ ایک دو بار دوسرے مقامات پر بھی میٹنگیں رکھی گئیں مگر بعد میں بنے بھائی کا کمرہ ہی سب سے محفوظ مانا گیا۔ آخر پولیس اور خفیہ والے کیسے یہ اندازہ کر سکتے تھے کہ غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی کی بیٹھکیں سر سید وزیر حسن کے گھر ہو سکتی ہیں اور وہاں پولیس کے چھاپے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

بنے بھائی کے کمرے میں یا تو صوبائی سیکریٹریٹ یا پھر کبھی کبھی الہ آباد ضلع کمیٹی کی میٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔ الہ آباد ضلع کمیٹی کی میٹنگیں تو کہیں بھی ہو جاتی تھیں، مگر صوبائی سیکریٹریٹ کی میٹنگیں ہمیشہ بنے بھائی کے کمرے میں ہی ہوتی تھیں اور جب کامریڈ بھاردواج میٹنگ میں شریک ہوتے تو یہ کافی دیر تک چلتی۔ میٹنگ اگر دس اور ساڑھے دس بجے شروع ہوتی تو پھر دو بجے تک چلنا تو معمولی بات تھی۔ تقریباً دس اور ساڑھے دس بجے بنے بھائی پر نیند کا حملہ ہوتا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اگر وہ اونگھنے لگتے تو کامریڈ بھاردواج فوراً ان کے منہ میں اپنی من پسند سگریٹ پلیرس نیوی کٹ لگا دیتے نیند کا حملہ دور ہوتے ہی بنے بھائی پوری طرح چوکس ہو جاتے پھر بارہ بجتے، ایک بجتا، بحث چلتی۔ بھاردواج دھواں دھار تقریر کرتے سگریٹ ختم ہو جاتیں تو نوکر بیڑیاں لا کر دیتا وہ بھی پھونک ڈالی جاتیں، پر میٹنگ چلتی رہتی۔ میری مشکل یہ ہوتی کہ میں دیکھتا کہ بنے کے ہاتھ میں سگریٹ خاتمے پر آ چکی ہے، مگر وہ پھینک نہیں رہے ہیں۔ میں ڈر جاتا کہ بنے کی انگلیاں جل جائیں گی۔ اس لیے میں ہاتھ بڑھاتا کہ انگلیوں سے سگریٹ کھینچ کر ایش ٹرے میں ڈال دوں فوراً بنے بھائی کہتے 'تھینکس' اور پھر سب کا قہقہہ فضا میں گونج جاتا۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹر زیڈ اے۔ احمد بھی سیکریٹریٹ کے ممبر ہو گئے اور اب میٹنگیں کبھی کبھی ان

کے گھر پر بھی ہونے لگیں۔ سیکریٹریٹ میں، میں ہی سب سے چھوٹا تھا۔ اس وقت میری عمر کوئی ۲۰ سال تھی۔ بنّے کی باتوں اور ڈھنگ پر مجھے بہت ہی ہنسی آتی تھی۔ ان کا انداز بحث میں بولنے کا ڈھنگ، سب ہی بڑا پیارا اور نرالا، میں اپنی ہنسی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ ایک دن بھاردواج پوچھ بیٹھے کیوں ہنستے ہو۔ میں نے کہا کہ اگر ایک بات ہو تو بتاؤں۔ اس سے پہلے بھاردواج کئی بار بنّے کو کہہ چکے تھے کہ نوٹ بک رکھا کرو۔ کامریڈ بھاردواج کامریڈوں کے کام میں ڈسپلن لانے کے لیے پاکٹ نوٹ بک رکھنے پر بہت زور دیا کرتے تھے۔ اس دن بھاردواج نے گھوم کر بنّے سے کہا 'تمہاری نوٹ بک کہاں ہے تم نوٹ بک نہیں رکھا کرتے'۔ ویسے تو بنّے بھائی کسی بات کا جواب دینے کے لیے چند لمحے توقف کرتے تھے مگر اس دن فوراً بول پڑے۔ 'میرے پاس بڑی نوٹ بک ہے' اور جیب سے نوٹ بک نکال کر سامنے رکھ دی۔ ہم سب خوب ہنسے۔

بنّے بھائی اچھے کھاتے پیتے خاندان کے تھے۔ میں کسان مورچے پر کام کرتا تھا۔ گاؤں گاؤں سرگشتی کرتا۔ اگر یکہ نہ ملے تو پیدل چلنا، راستے میں چنے چبانا، کبھی ندی کبھی نالے پار کرنا اور پھر رات میں کسی بھی گاؤں میں قیام کرنا۔ میں سوچتا تھا کہ اس سے بنّے بھائی کو تکلیف ہوگی، اس لیے ایک دن میں نے ان سے کہا 'ظہیر صاحب، آپ لندن پلٹ اور پھر سرسید کے بیٹے آپ کو اس مورچے پر تکلیف ہوگی' مگر وہ نہ مانے اور میرے ساتھ کئی مرتبہ گاؤں میں گئے۔ ان کی وہی مستی اور بھولاپن سدا رہا، اتنے 'بڑے خاندان' کے ساتھی کا گاؤں جانا کافی متاثر کن تھا۔

ایک مرتبہ ہم لوگوں نے الہ آباد کی ہنڈیا تحصیل کے ایک گاؤں میں، شاید ۱۹۳۸ء میں چار دنوں کے ایک اسٹڈی سرکل کا انتظام کیا۔ اس کے لیے کسان سبھا کے ورکر آئے تھے اسٹڈی سرکل کی تفصیلات طے کرنے کا ذمہ میرا اور بنّے بھائی کا تھا۔ کھانے کے لیے غلے کی فراہمی سے لے کر روشنی کے لیے پیٹرومیکس کے انتظام تک سب ہی چیزوں کے انتظام کی ذمے داری ہمارے سر تھی۔ اس سلسلے میں ایک دن پوچھ بیٹھے یہ ہری کین لالٹین کیا ہوتی ہے۔ میں نے کہا بنّے میاں انڈیا میں ریولوشن (انقلاب) لانا ہے تو ہری کین کا جاننا بہت ضروری ہے۔ اس پر خوب ہنسے اور کہنے لگے چلو چار دن گاؤں میں رہیں گے تو بہت کچھ جان لیں گے۔ وہ چاروں دن اس گاؤں میں ہی رہے۔

سوشلزم کے بنیادی اصولوں پر انہوں نے لیکچر دیا جسے کسانوں نے بہت پسند کیا اس کی وجہ سے وہ سب میں ہردلعزیز بن گئے۔

۱۹۳۷۔۱۹۳۸ء میں اتر پردیش میں کانگریس منسٹری تھی۔ سیکریٹریٹ کی میٹنگ لکھنؤ میں بھی ہونے لگی۔ سیدھا گھر خدا کا۔ ہماری میٹنگیں بنے بھائی کے کمرے میں وزیر منزل میں یا پھر کبھی کبھی شہر کے قلب میں بنے بھائی کے بڑے بھائی علی ظہیر کی کوٹھی پر ہوتیں۔ اسی زمانے میں نیتا جی سبھاش چندر بوس اور پٹابھی ستیار میا کا چناؤ مقابلہ ہوا تھا جس کی وجہ سے سارا ملک ہل گیا تھا۔ سبھاش نے پٹابھی کو گہری پٹخنی دی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے صوبائی کمیٹی کی میٹنگ علی منزل میں چل رہی تھی کہ اچانک کمرے میں بنے کے بڑے بھائی ڈاکٹر حسین ظہیر سبھاش بابو کی جیت کی خوشخبری لے کر آئے، ہم لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بنے تو تھوڑی دیر کھڑے ہوکر ناچ بھی دیئے اور ان کی ضد پر میٹنگ کو تھوڑی دیر روک کر جیت کی خوشی منائی گئی۔

دوسری جنگ شروع ہونے کے شاید ایک سال پہلے بنے بھائی کی شادی ہوگئی وہ الہ آباد کا پہلا گھر چھوڑ کر دوسرے گھر میں چلے گئے تھے۔ میں ان دنوں ان کے پاس کئی بار جایا کرتا تھا۔ کوئی وقت نہ تھا، کبھی صبح کبھی رات کبھی دوپہر میں پہنچ جاتا۔ بنے کا کمرہ بنگلے کے بائیں بازو میں تھا، ہم سیدھا وہیں پہنچ کر دروازہ کھٹ کھٹاتے۔ ایک دن کوئی ضروری کام تھا، میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے ایک میٹھی زنانی آواز نے پھٹکار سنائی 'صاحب آپ لوگوں کے آنے جانے کا کوئی وقت ہوتا ہے کہ یوں ہی وقت بلاوقت آجاتے ہیں'۔ میں سمجھ گیا، مسز سجاد ظہیر ہیں۔ بات کھری تھی مگر میں الٹے پاؤں سائیکل اٹھا کر چلا آیا۔ میں نے بنے سے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا کچھ دنوں بعد میں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت پکڑا گیا۔ تب مجھے ان کی طرف سے ایک کامریڈ کی معرفت اس دن کی پھٹکار کے سلسلے میں ایک معذرتی اور پیار بھرا پیغام ملا۔

کامریڈ رضیہ، بنے بھائی کو ایک سچی کامریڈ ملیں۔ وہ خود بھی لکھنے والی اور انٹیلکچول تھیں۔ بنے ان سے بڑے خوش رہتے۔ رضیہ کے بارے میں بنے بھائی کے جذبات کیا تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے:

میں کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہوکر جنگ اور آزادی کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے

اقتصادی ڈپارٹمنٹ کا سیکریٹری ہو گیا تھا۔ وہاں سے ۱۹۵۷ء میں ہٹ کر ایک سال کیرالا اور پھر دو سال افرو ایشیائی یکجہتی تنظیم کے ہندوستانی سیکریٹری کی حیثیت سے قاہرہ میں رہا۔ ۱۹۶۰ء میں ہندوستان واپس آ کر 'سوشلسٹ کانگریس مین' کے نام سے پندرہ روزہ اخبار جاری کیا اور کانگریس سوشلسٹ فورم میں کام کرنے لگا۔ اس دوران بنے بھائی پاکستان گئے، جیل میں رہے اور پھر ہندوستان لوٹ آئے۔ میری ان سے ملاقات برسوں بعد قاہرہ سے واپسی پر ہوئی۔ ان کے پرانے انداز، اپنائیت اور پیار بھرا لہجہ، کسی بھی چیز میں تو تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

۱۹۶۴ء میں ہم ساتھ کیوبا گئے۔ فرینکفرٹ سے ہوتے ہوئے اور ہوائی جہاز کی مشکلات کی وجہ سے چار دن پراگ میں رہنے کے بعد ہم کیوبا اور ہوانا گئے اس سفر کے دوران ہمارے دو ہفتے اور ۲۴ گھنٹے کا ساتھ رہا۔ سفر کے دوران ایک دن بنے بھائی کہنے لگے۔ 'بھئی ہرش کیا خوش نصیبی ہے کہ تمہارا ساتھ ہوا۔ کوئی بیوقوف بھی ساتھی ہو سکتا تھا پر تم آ گئے مزا آ گیا۔' اس دوران خوب باتیں ہوئیں۔ بیتے دنوں کی یادوں کا سلسلہ چل پڑا۔ بات بیویوں تک جا پہنچی۔ بنے بھائی رضیہ پر اپنا دل کھول بیٹھے۔ اپنی قسمت کو سراہا۔ رضیہ کتنا سہارا دیتی ہیں یہ بتایا۔ ان کی سمجھداری کی اور ان کی قابلیت کی تعریف کی اور کہا: 'میری بڑی پیاری بیٹیاں ہیں مگر انہیں بنایا ہے رضیہ نے'۔

سات سال پہلے بنے بھائی کی ۶۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ بنے بھائی سے پوچھا گیا تقریر کرنے کے لیے کس کس کو بلایا جائے۔ انہوں نے میرا نام بھی بتایا۔ میں بڑا خوش ہوا۔ بنے بھائی کی ادبی دنیا ہی جس سے سب واقف ہیں مگر ولایت سے لوٹ کر تین سال ہندوستان میں عوام کے بیچ کاٹے اس کی جانکاری لوگوں کو کم ہے اس وقت میں ان کے سب سے زیادہ قریب تھا اس لیے انہوں نے مجھے یاد کیا اس سے مجھے ازحد خوشی ہوئی۔

ہندی میں، میں بھی کبھی ادبی خاکے لکھتا ہوں۔ کچھ مسخرے قسم کے، کچھ طنزیہ انداز لیے ہوئے۔ ۶۵۔۱۹۶۶ء میں، ایک دن بنے کو اپنے یہاں کھانے پر بلایا اور انہیں اپنے کچھ خاکے سنائے۔ وہ خوب ہنسے، بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے ایسا لگتا ہے بڑے لذیذ بڑے اچھے لڈو، پیڑے اور برفیاں کھائی ہیں۔ میں نے کہا بنے میاں تمہارے اتنا کہہ دینے سے مجھے بڑا سنتوش ہوا۔

بنّے نہ رہے۔ ہم میں سے کوئی بھی ایک دن نہ رہے گا۔ جب میں قاہرہ میں تھا تو میری منی بس کا ڈرائیور کہتا تھا: 'استاد مالو یہ کل نفس ذائقۃ الموت' یعنی شری مالو یہ ایک دن سب مر جائیں گے۔ تو سوال یہ ہے کہ جتنے دن زندہ رہتا ہے تو انسان کیا کرتا ہے۔ کم سے کم بنّے بھائی کو یہ اطمینان ہو گا کہ انہوں نے اپنی زندگی بھر کام کیا۔ دلّی کی ایک تقریب میں مجھ سے کہنے لگے 'بھئی ہرش' یہی کیا کم ہے کہ ہم زندہ ہیں اور اپنا کام انجام دے رہے ہیں'۔

اس دوران بنّے ملک کی بگڑتی ہوئی حالت پر بہت دکھی ہو جاتے تھے۔ پریشانی کے دنوں میں ایک مرتبہ انہوں نے لکھا 'ڈر لگتا ہے کہ پھولوں سے خوشبو نہ غائب ہو جائے'۔ ہم نے بعد میں بنّے بھائی سے کہا 'سجاد ظہیر صاحب، جب تک آپ جیسے انسان پیدا ہوتے رہیں گے، تب تک پھولوں کی خوشبو کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ فکر مت کرنا'۔

بنّے بھائی گئے، مگر یہ بات طے ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی زندگی اس بات کے لیے وقف کر دیتے ہیں کہ پھول مہکیں، چڑیاں چہکیں، بچے ہنسیں اور انسان انسان سے پیار کریں'۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

امرت رائے

مشفق اور مہربان دوست

موت نے جیسے گھر دیکھ لیا ہو، احتشام صاحب کی رحلت کا زخم ابھی ہرا ہی تھا کہ بنے بھائی پر ویسا ہی مہلک دل کا دورہ پڑا اور ایک سال کے اندر ہندوستان کے اور خصوصاً اردو کے ترقی پسند ادب کے دو سب سے مضبوط ستون جاتے رہے، یہ ایک ایسا خلا ہے جو جلدی بھرا نہیں جا سکے گا اور جس کے اثرات دھیرے دھیرے نمایاں ہوں گے۔

بنے بھائی نے اپنی تمام عمر اسی ترقی پسند ادب کی تحریک کے لیے وقف کر دی اور میں تو سمجھتا ہوں یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ ان کا انتقال اپنے گھر کے بستر پر نہیں، پردیس کے ایک شہر میں ہوا جہاں کہ وہ افروایشیائی ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کرنے گئے تھے۔ اب سے کئی برس پہلے ۱۹۶۵ء میں، ایک مرتبہ مجھے ابھی ان کے ساتھ اسی طرح کے ایک سفر میں شریک ہونے کا فیض حاصل ہوا تھا اور ہم لوگ یورپ کے کچھ سوشلسٹ ملکوں میں گھومتے گھومتے اسی الماآتا شہر میں پہنچے تھے جہاں کہ اس بار ان کی موت ہوئی، تب کی بہت سی یادیں میرے دل میں بسی ہیں اور ان سب سے بنے بھائی کی ایک ہی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے جو کہ ایک بہت ہی مخلص اور مہربان دوست کی تصویر ہے۔ بنے بھائی بہت ہی نیک دل مشفق انسان تھے، ان کے مزاج میں قدرے تکلف تو تھا، مگر تصنع نہیں تھا، بہت کھلے ہوئے، بہت منکسر المزاج، ان کے ساتھ گھنٹوں گھنٹوں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے مگر یہ ان کی انکساری ہی تھی جس نے کبھی مجھ کو یہ احساس

نہیں ہونے دیا کہ وہ شخص جس سے میں باتیں کر رہا ہوں، عمر میں اور زندگی کے تجربوں میں اور علم و دانش میں مجھ سے کتنا بڑا ہے، تمام عظیم شخصیتوں کا یہ ایک خاصہ ہے جو بنّے بھائی میں بھی بھرپور ملتا ہے اور پھر وہ جس قدر دوست نواز آدمی تھے، اس میں کوئی عجب کی بات نہیں ہے کہ آج ان کے دوست ہندوستان اور پاکستان کے کونے کونے میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کی جدائی کا سوگ منا رہے ہیں۔

جن لوگوں کا ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں کی تحریک سے کچھ بھی واسطہ رہا ہے ان کو معلوم ہے کہ اس تحریک کی داغ بیل بنّے بھائی اور ملک راج آنند اور ان کے دو ایک ساتھیوں نے ہی اپنی طالبعلمی کے زمانے میں لندن میں ڈالی تھی، پھر کچھ ہی عرصے بعد جب یہ لوگ ہندوستان آئے اور اس تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی تو اس کی صدارت کے لیے منشی پریم چند کو مدعو کرنے کا کام بنّے بھائی کو ہی سونپا گیا کیونکہ شاید یہ انہیں کے کرنے کا تھا، جسے انہوں نے بہت خوبی سے انجام دیا، ان کی جگہ پر شاید دوسرا کوئی آدمی اس کام کو نہ کر سکتا کیونکہ تب تک یہ تحریک اس ملک کے لیے بالکل ہی نئی تھی مگر بنّے بھائی کی بات اور تھی۔ ان کے مزاج میں ایک ایسی نرمی اور گھلاوٹ تھی جو فوراً دوسرے آدمی کا دل جیت لیتی تھی، ایک طرح کا لچیلا پن جو، ان کے عزم کی کمزوری نہیں بلکہ مضبوطی کا شاہد تھا اور یہ نرمی یا گھلاوٹ یا لچیلا پن (جو بھی نام آپ اس کو دینا چاہیں کوئی اوپری رکھ رکھاؤ کی محض پُرتکلف چیز نہیں، ان کے کردار کا جزو تھا، جس کی جڑیں ان کی فراخ دلی اور وسیع النظری میں ملتی ہیں، یہی وجہ تھی کہ ادبی معاملوں میں بھی ان کی نظر بہت صاف تھی جیسا کہ ان کے دو بڑے شاہکاروں یعنی 'روشنائی' اور 'ذکرِ حافظ' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، ترقی پسند ادیبوں کی تحریک جب اس کے کچھ رہنماؤں اور اراکین کی تنگ نظری کے باعث بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گئی تب اسے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کا بے انتہا مشکل کام انہیں نے انجام دیا، ایسی مشکل صورتوں میں وہ صبر و تحمل سے کام لینا بھی جانتے تھے۔ یوں بھی جلد بازی ان کے مزاج میں نہیں تھی، وہ اطمینان سے کام کرنا پسند کرتے تھے جو کبھی کبھی ان کے ساتھیوں کو گراں بھی گزرتا تھا مگر جس خوبی کے ساتھ، جس ثابت قدمی سے انہوں نے اپنی زندگی کا سفر طے کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا یہ طریقۂ کار خام تھا۔

یہ غور کرنے کی بات ہے کہ ان کی اس ثابت قدمی کی بنا کیا ہے، میری سمجھ میں اس کی بناء یہی ہے کہ ان کا نصب العین صاف تھا، وہ نصب العین تھا ایک نئے ہندوستان کی تعمیر۔ انسان دوستی کے اصولوں پر، سماجی انصاف پر مبنی، اپنے اس مقدس نصب العین سے الگ ان کی کوئی زندگی نہ تھی۔ انسان دوستی ہی ان کا ایمان تھا اور وہی ان کی روح، زندگی ان کے نزدیک بہت بڑی نعمت تھی جسے اچھی طرح جینا چاہیے یعنی بھرپور کام کرتے ہوئے اس کی لطافتوں کا بھرپور مزہ اٹھاتے ہوئے ان کی طبیعت کا رنگ مطلق زاہدانہ نہیں تھا، وہ اچھا کھانا پسند کرتے تھے، اچھے کپڑے پسند کرتے تھے، اچھے مکان میں اچھی طرح رہنا پسند کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ سب کو یہی کچھ میسر ہو۔ ان کی کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ بڑی خوبصورت صفات کا ایک آدمی ہم سے جدا ہو گیا، لیکن جس ایک چیز کو میں اس وقت خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے سب سے زیادہ یاد کر رہا ہوں وہ ہے ان کی دوست نوازی۔ دوستی کو وہ ہر چیز سے بالاتر رکھتے تھے۔ بعض اوقات کسی مسئلے کو لے کر ہمارے درمیان اختلاف بھی ہوا ہے مگر اس سے کبھی ہمارے دوستانہ تعلقات میں فرق نہیں آیا۔ دوستی سے بڑی کوئی چیز نہیں جو ایک آدمی دوسرے آدمی کو دے سکتا ہے، مگر اکثر دیتا نہیں، بنے بھائی دوستی دینا جانتے تھے، اسی لیے وہ سب کے بنے بھائی تھے۔ سب کے دُکھ سُکھ میں شریک اور اسی لیے ان کے سب دوست آج ان کے لیے سر دُھن رہے ہیں اور برسوں دُھنتے رہیں گے۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

سبھاش مکھوپادھیائے

......اور بنے بھائی ہم سے بچھڑ گئے

کیا ستم ہے کہ مجھے انجام سے شروع کرنا پڑ رہا ہے۔

الما آتا ہوٹل کے گراونڈ فلور کے ریستوران میں، میں نے ان کو آخری بار دیکھا۔ روز کی طرح بنے بھائی ذرا دیر سے آئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: 'تم فکر نہ کرو، میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ تم پہلے چلو۔' یہ ان کے آخری الفاظ تھے جو انہوں نے مجھ سے کہے۔ اور پہلی اور آخری بار ایسا ہوا کہ انہوں نے اپنا کہا پورا نہ کیا۔

جب کانفرنس شروع ہوگئی تو میں نے گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ اس لیے کہ ہندوستانی وفد کے طرف سے بنے بھائی کو رپورٹ پیش کرنی تھی۔ بنے بھائی نے یہ رپورٹ لکھنے کے بعد ہم میں سے کچھ لوگوں کو سنائی تھی اور ہم سب نے اسے پسند کیا تھا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر عطر سنگھ میرے پاس آئے اور انہوں نے بتایا کہ بنے بھائی کی طبیعت اچھی نہیں ہے، وہ نہیں آئیں گے اور انہوں نے عطر سنگھ سے کہا ہے کہ وہ ان کی طرف سے رپورٹ پڑھ دیں۔

اس وقت بھی مجھے خیال نہیں ہوا کہ کوئی خاص بات ہوگی، اس لیے کہ ابھی دو دن پہلے ایسا ہوا تھا کہ بنے بھائی لنچ کے وقت نہ ملے تو میں ان کے کمرے میں گیا۔ وہ لیٹے ہوئے تھے لیکن انہوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ طبیعت بالکل ٹھیک ہے، ذرا معدے کو آرام دینے کے خیال سے انہوں

نے سوچا ہے کہ لنچ 'گول' کردیں۔

کھانا 'گول' کرنے کی اصطلاح میں ان دنوں اکثر استعمال کیا کرتا تھا جب میں بنّے بھائی کے ساتھ ایک مہینے کے لیے ۱۹۷۱ء میں ویتنام گیا تھا۔

مجھے وہ دن کبھی نہ بھولیں گے جب میں بنّے بھائی کے ساتھ ویت نام میں تھا۔ جن لوگوں نے بنّے بھائی کو دہلی میں دیکھا ہے وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ویت نام میں وہ کس قدر جواں سال لگتے تھے، میں ان سے عمر میں ۱۳ سال چھوٹا ہوں لیکن صبح سے شام تک کے مصروف پروگرام میں، میں ان کا ساتھ نہیں دے پاتا تھا۔ میں کئی بار بیمار پڑ گیا لیکن بنّے بھائی بیمار پڑنا تو کیا کبھی تھکے ہوئے اور سست بھی نہ نظر آئے۔ انہیں دنوں میں جب بیمار پڑتا تو کہہ دیتا کہ 'کھانا سوچتا ہوں ''گول'' کردوں'۔

ویت نام کے دن مجھے اس لیے بھی یاد رہیں گے کہ بنّے بھائی نے مجھے اپنی ابتدائی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ بیرسٹر بھی تھے۔ پھر انہوں نے پاکستانی جیل کا ذکر کیا اور ویت نام سے وہ اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ روز شام کو بیٹھ کر منصوبے بناتے کہ وطن واپس جاکر پارٹی اور عوام کے لیے کیا کیا کام کریں گے۔

بنّے بھائی کو سب سے پہلے میں نے کلکتہ میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کُل ہند کانفرنس میں دور سے دیکھا۔ پھر میں ان سے بمبئی میں پہلی پارٹی کانگریس میں اور ترقی پسند مصنفین اور فنکاروں کی کانفرنس میں ملا۔ وہ اس وقت پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تھے۔

پچھلے پندرہ برس میں، میں ان سے قریب آیا۔ سب سے پہلے بنّے بھائی ہی نے مجھے تاشقند کی افریشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس کے ہندوستانی وفد میں شریک کیا۔ ان ہی کی بدولت میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی برادری سے روشناس ہوا جس سے مجھے ادیب کی حیثیت سے بہت فائدہ پہنچا۔ میں نے دیکھا ہے کہ دوسرے ملکوں کے ادیب ان کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ ان سے جو بھی ملا وہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔

بنّے بھائی اکثر کلکتے میں آتے رہتے تھے اور جب آتے تو بنگالی ادیبوں سے ملتے بزرگ ادیبوں سے بھی اور نوجوان ادیبوں سے بھی جو ادب مخالف خیالات بھی رکھتے تھے ان کی شخصیت

کی کشش، ان کی ایمانداری اور صاف گوئی کی وجہ سے ان کی قدر کرتے تھے۔ ہمیں جب کبھی بھی اپنے ادیبوں کو منظم کرنے میں دشواری ہوتی تو ہم بنے بھائی کو بلاتے اور وہ ہمیشہ ہماری مدد کرتے۔

ماسکو میں افریشیائی ادیبوں کے مستقل بیورو کی میٹنگ کے بعد میں بنے بھائی سے پہلے الما آتا آ گیا تھا۔ اس لیے جس دن وہ آئے اس دن انہیں لینے کے لیے ایئرپورٹ گیا۔ اس سے پہلے میں جون میں ان سے مستقل بیورو کی میٹنگ ہی کے سلسلے میں ماسکو میں ملا تھا۔ اس وقت انہوں نے میڈیکل چیک اپ بھی کرایا تھا اور وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ آپ کی صحت بہت اچھی ہے وہاں سے وہ اپنی بیٹی کے پاس لندن چلے گئے اور مجھے ایک خط لکھا کہ ان کی صحت پہلے سے بھی اچھی ہے اور وہ اپنی 'خودنوشت' لکھ رہے ہیں۔

اب کے جب میں ان سے ملا تو مجھے بھی خوشی ہوئی اس لیے کہ ان کی صحت پہلے سے کہیں اچھی لگ رہی تھی۔ ان کے کمرے میں، لنچ کے دوران میں بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کہا کرتے کہ: 'ہمیں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ادیبوں کی ایک کانفرنس ہندوستان میں کرنی چاہیے'۔ ان دنوں وہ سوویت یونین، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ادیبوں کی مشترکہ میٹنگ کا انتظار بڑی بے چینی سے کر رہے تھے ہمیں ان ہی سے امید تھی کہ وہی اسے کامیاب بنا سکتے ہیں۔ بیمار پڑنے سے پہلے انہوں نے یہ سلسلہ شروع کر دیا تھا جو بعد کو کامیاب ہوا۔ برصغیر ہندوستان کی قوتوں کا اتحاد اور سالمیت انہیں بہت عزیز تھی۔

اگلے دن رات کے کھانے کے بعد ہم لوگ ہوٹل کے دوسرے حصے میں پاکستان کے ایک ڈیلی گیٹ سے ملنے گئے۔ وہ نوجوان ادیب تھے۔ بنے بھائی کو دیکھ کر بالکل دم بخود رہ گئے۔ گھنٹے بھر تک وہ بتاتے رہے کہ نوجوان پاکستانی قومی آزادی اور سوشلزم کے مجاہدین کے بارے میں اور خاص طور سے بنے بھائی کے بارے میں کیسی رائے رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا: 'آپ تو ہمارے ان سورماؤں میں ہیں جو پاکستان کے نوجوانوں کو سب سے زیادہ عزیز ہیں'۔

بنے بھائی ان کی باتیں سن کر خوش تو بہت ہوئے لیکن انہوں نے اس نوجوان ادیب سے کہا کہ 'آپ میری اتنی تعریفیں کر رہے ہیں، لیکن مجھ میں کمزوریاں اور کوتاہیاں بھی ہیں، ان پر بھی نظر رکھیے'۔ یہ سن کر میرے دل میں بنے بھائی کا احترام اور زیادہ ہو گیا۔ پھر اسی رات کو بنے بھائی کے

کمرے میں بڑی دیر تک ہم لوگ ادیبوں کی تحریک کی باتیں کرتے رہے۔ بہت رات ہو گئی تھی، لیکن وہ ذرا بھی تھکے ہوئے نہیں لگ رہے تھے۔

دوسرے دن یہ غضب ہو گیا۔ عطر سنگھ سے جب بنے بھائی کی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی خبر ملی تو بھی میں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ سہ پہر میں ایک سوویت ساتھی نے بتایا کہ بنے بھائی پر دل کا خفیف سا دورہ پڑا تھا اور انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا تھا میں نے اسپتال چلنے کو کہا تو مجھے بتایا گیا کہ ان سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔

اگلے دن مریم سلگانیک نے بتایا کہ دورہ بہت سخت تھا ہم نے ماسکو میں اپنے سفیر کو ٹیلی فون کیا کہ وہ رضیہ آپا کو اطلاع کر دیں اور ان سے کہیں کہ نسیم کو بھیج دیں اس لیے کہ وہ روسی زبان جانتی ہیں۔ ان کے ٹکٹ کا اور ویزے کا انتظام سوویت ادیبوں کی یونین نے کیا۔ بنے بھائی کی دیکھ بھال کے لیے ہم لوگ خود رکنا چاہتے تھے لیکن زبان نہ جاننے کی وجہ سے ہمارا ہونا نہ ہونا بے کار ہوتا۔ ہمارے ساتھ کے نوجوان ترجمانوں نے چوبیس گھنٹے ان کے پاس رہنے کا ذمہ لیا۔ تیسرے دن ہمیں پتہ چلا کہ ان کا درد کم ہو گیا ہے، انہوں نے کھانا کھایا، سوئے اور ترجمانوں سے بات چیت کی۔ ان سے کانفرنس کے بارے میں پوچھا اور ہم لوگوں کو کہلوایا کہ پریشان نہ ہوں۔

لیکن اس کے بعد والے دن ان کی حالت پھر بگڑ گئی۔ ماسکو سے دل کے امراض کے ایک ماہر پروفیسر کو مشورے کے لیے الما آتا لایا گیا۔ قزاقستان کے وزیر صحت خود ان کے علاج کی نگرانی کر رہے تھے جس طرح کی دیکھ بھال اور علاج بنے بھائی کو الما آتا میں ملا اس کا یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہم لوگ بادل ناخواستہ سوویت یونین، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ادیبوں کی میٹنگ کے لیے تاشقند چلے گئے اس لیے کہ ہمیں اپنے الما آتا کے دوستوں پر اعتماد تھا کہ وہ بنے بھائی کے دوا علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے اور اس میٹنگ کی کامیابی کے لیے بنے بھائی نے بیمار پڑنے سے پہلے بڑی محنت کی تھی۔

۱۳ ستمبر کی رات کو سمرقند پہنچنے کے ذرا ہی دیر بعد ہمیں اطلاع ملی کہ بنے بھائی انتقال کر گئے۔ چاروں ملکوں کے ادیب جو اس وقت وہاں موجود تھے، سکتے میں رہ گئے۔ بنے بھائی کی ناوقت

موت پر ہم سب کو ایک ہی سا رنج تھا۔ ہم سب کے دلوں میں ایک ہی سے جذبات تھے ہم نے ہوٹل کی لابی میں جلسہ کیا اور ہم نے دیکھا کہ جو نوجوان ہم لوگوں کے ساتھ ترجمانوں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے وہ زار و قطار رو رہے تھے۔

بنّے بھائی ایک شاندار زندگی جیے اور انہوں نے ایک شاندار موت پائی۔ ایک ایسے ملک میں جو انہیں عزیز تھا، ادیبوں کی کانفرنس کے دوران میں جو انہیں بہت عزیز تھے۔ ہمارے سوویت دوستوں نے ان کو بچانے کی ہر وہ کوشش کی جو انسان کے بس میں ہے۔ میں کہوں گا کہ انہیں اگر کسی چیز نے مارا تو خوشی نے...... یہ دیکھنے کی خوشی کہ ادیبوں کی تحریک کتنی زبردست ہو گئی ہے۔ ایک بھرپور با مقصد زندگی پوری کر لینے کی خوشی۔

مجھے بنّے بھائی کی موت پر رشک آتا ہے۔ یہ ایسا انجام تھا جو ساری زندگی کا جواز بن گیا۔

جب میں ان سے قریب آیا تو ان کی عمر کافی ہو چکی تھی۔ وہ بہت کچھ دیکھ چکے تھے لیکن اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس وقت بھی مستقبل کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں دہلی میں افروایشیائی ادیبوں کی چوتھی کانفرنس کے فوراً ہی بعد میں انہیں ایک میٹنگ سے گھر پہنچانے جا رہا تھا۔ ہم دونوں تھکے ہوئے تھے۔ کام کی زیادتی تھی۔ بہت ساری غلط فہمیاں ہوتی رہی تھیں اور گھنٹوں دوستوں میں بے معنی بحث ہوتی رہی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ بنّے بھائی ان سب سے عاجز آچکے ہوں گے اور اب وہ آرام کرنے کی فکر میں ہوں گے کہ وہ اچانک بول اٹھے۔ 'میرا بھی کبھی بے حد جی چاہتا ہے کہ ادیبوں کی ایک عالمی کانفرنس کی جائے جس میں سارے برِاعظموں کے ترقی پسند ادیب جمع ہوں!'

اور اب میں سوچتا ہوں تو مجھے یہ لگتا ہے کہ بنّے بھائی کا انتقال ایک ایسی کانفرنس کے دوران میں ہوا جو، ان کی آرزوؤں کے بہت قریب تھی اس لیے کہ اس کانفرنس میں دنیا کے ۷۷ ملکوں کے ادیب شریک تھے جن میں پچپن ایشیائی افریقی ممالک کے ادیب بھی تھے۔

آخر دم تک ان کی شرافتِ نفس اور اخلاق میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس لیے کہ ان کا اخلاق جاگیردارانہ خاندان کا ورثہ نہیں تھا بلکہ یہ ان کے مطمحِ نظر کا نتیجہ تھا جو ترقی پسند، متوازن حقیقتوں سے ہم آہنگ تھا جس سے ان میں بڑی دردمندی پیدا ہوئی تھی۔ دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں انسانیت

آئی تھی۔ اپنے دوستوں اور رفیقوں پر اعتماد کرنا اور ان سے محبت کرنا آیا تھا اور یہ مطمح نظر کوئی تجریدی چیز نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اپنے خیالات وعقائد کے مطابق بسر کی اور ایسے ایسے کام کیے جنہیں کرنے کی جرأت وہمت کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے ہمارا ملک طرح طرح کی اونچ نیچ سے گزرا اور بہت سے بڑے اچھے اچھے ساتھی برے دنوں کے بوجھ تلے ٹوٹ گئے لیکن بنّے بھائی کا عقیدہ واعتماد آخر تک محکم اور غیر متزلزل رہا۔

ہفت روزہ 'حیات'، نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

احمد ندیم قاسمی

توانا اور باشعور ادبی تحریک کا رہنما

سید سجاد ظہیر کا نام ایک توانا اور باشعور ادبی تحریک کے رہنما کی حیثیت سے مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ وہ بنیادی طور پر ادیب تھے، مگر ان کا بیشتر وقت سیاست کی نذر ہو گیا اور تخلیقِ ادب کی طرف متوجہ ہونے کا انہیں بہت کم وقت ملا۔ نوجوانی میں وہ ادب کی ترقی پسند تحریک کی تنظیم و تشہیر میں مصروف رہے اور اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی سیاست میں ایسے الجھے کہ تخلیقی ادب کا منصب ادا کرنے سے قاصر رہے۔ سجاد ظہیر نے بھی اپنی حیرت انگیز ادبی صلاحیتوں کی قربانی دے ڈالی۔ یوں تو تاریخِ ادب میں ان کا ذکر ایک ادیب سے زیادہ ایک ادبی رہنما کی حیثیت سے آئے گا یہ حیثیت بھی بہت بڑی ہے، کیونکہ انہوں نے جس تحریک کا آغاز کیا، اس نے نہ صرف یہ کہ گزشتہ ۳۵، ۴۰ برس کے ادب کو بھرپور اور ہمہ جہتی انداز میں متاثر کیا بلکہ آنے والے زمانے کا ادیب اسی ادبی تحریک سے رہنمائی اور انسپریشن حاصل کرے گا۔

'لندن کی ایک رات' سید سجاد ظہیر کا ایک ناولٹ ہے، جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ ناول نویسی اور افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوتے تو اپنا ایک منفرد اسلوب پیدا کرتے مگر افسوس کہ وہ ایسا نہ کر سکے۔ بعد میں انہوں نے چند افسانے بھی لکھے مگر ادبی رہنما کی حیثیت سے جلد ہی ان کا رجحان تنقید کی طرف ہو گیا۔ تنقیدی مضامین میں بھی وہ تحسینِ فن سے زیادہ ایک رہنمایانہ منصب کی تکمیل کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ گزشتہ ۱۵ برس میں انہوں نے چند نظمیں بھی لکھیں

نگران کی حیثیت محض تجرباتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے سید سجاد ظہیر نے اردو ادب میں تجرید کے طوفان سے چونک کر تجرید اور حقیقت کے درمیان کوئی واضح رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش میں یہ نظمیں لکھیں اور تجربے کے جوش میں اوران اوزان و بحور کے ساتھ آزادی برتنے کا تجربہ کیا، مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، خالصتاً ادبی شغف کے لیے ان کے پاس وقت بہت کم تھا۔ سو اس تجربے کو بھی وہ کوئی ٹھوس صورت نہ دے سکے۔ ان کا اصل ادبی کارنامہ 'روشنائی' ہے جو ترقی پسند ادب کی تحریک اور تنظیم کی روداد ہے یہ کام انہی کے کرنے کا تھا کیونکہ ۱۹۳۶ء میں جن نوجوانوں نے اس تحریک کا آغاز کیا ان میں سید سجاد ظہیر پیش پیش تھے اور ان ہی کی جدوجہد سے یہ تحریک مختصر سے عرصے میں ملک گیر ہو گئی تھی۔ 'روشنائی' میں انہوں نے جن حالات و واقعات کو یکجا کیا ہے وہ ہماری تاریخی ادب کا ایک اہم اور ناگزیر حصہ ہیں۔ کوئی دوسرا ادیب اس موضوع پر اتنی ذمے داری سے قلم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ سید سجاد ظہیر کی نثر نہایت سادہ اور سلیس ہوتی ہے، مگر اس سادگی اور سلاست میں بھی ایک پُر اسرار ادبی شان ہوتی ہے۔ زنداں سے انہوں نے اپنی بیگم کے نام جو خطوط لکھے (اور جو کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں) وہ بھی اس خوبصورت سلاست کے عمدہ نمونے ہیں۔

ان کے بارے میں سنا اور پڑھا ہے کہ وہ بہت مہذب اور شائستہ انسان تھے اور دوستوں کے محبوب تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان میں آ بسے مگر کچھ عرصے بعد کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے انہیں 'انڈر گراؤنڈ' ہو جانا پڑا، چنانچہ ان لوگوں سے ان کی ملاقات شاذ ہی ہوتی تھی جو پارٹی کے ممبر نہیں تھے۔ میں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا سب سے بڑا عہدیدار تھا اور ۱۹۵۴ء تک یہ اعزاز میرے پاس رہا مگر میں پارٹی کا رکن نہیں تھا، اس لیے سید صاحب سے میری ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ جب ۱۹۵۵ء میں وہ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں چار سال جیل میں رہ کر رہا ہوئے اور لاہور میں ان کے ایک دوست نے ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا تو وہاں سید سجاد ظہیر سے پہلی اور آخری ملاقات ہو سکی۔ چنانچہ ان کی شخصیت کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنے کا حق نہیں بنتا۔ البتہ ان کی شائستہ مزاجی کا ایک تجربہ یوں ہوا کہ راولپنڈی سازش کیس سے پہلے جب وہ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے اور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سیکریٹری تھا تو بعض نظریاتی مباحث کے سلسلے میں

انہوں نے مجھے ایک مفصل خط بھجوایا جس کا میں نے مفصل جواب عرض کیا۔ ایک بار پھر ان کا انتہائی مفصل خط آیا اور میں نے بھی اتنی ہی تفصیل سے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کی۔ بحث یہ تھی کہ میں حالات و مسائل کو پاکستان کے حوالے سے جانچتا تھا اور یہاں کے لوگوں کے عقائد، تہذیب اور کلچر کے پس منظر کے بغیر کسی بھی 'منظر' کو قبول کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ یہ انداز نظر شاید اس تھیوری کے خلاف تھا جس کے سید صاحب علمبردار تھے، چنانچہ خطوط میں انہوں نے مجھے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی اور ادھر میں کوشاں رہا کہ وہ ایک ایسے ادیب کا نقطۂ نظر سمجھ لیں جس نے تحریکِ پاکستان میں عملاً حصہ لیا ہے اور جو اس مملکت کے تہذیبی جواز پر ایمان رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح بحث کے تلخ ہو جانے کا امکان تھا۔ ویسے بھی وہ دور انتہاپسندی کا تھا، مگر مجال ہے جو اس بحث کے دوران سید صاحب کے لہجے میں تختی یا درشتی کا شائبہ بھی پیدا ہوا ہو۔ وہ تلخ سے تلخ حقائق کا اظہار بھی نہایت سلیقے سے کرتے تھے۔ افسوس کہ یہ خط ایک طرح سے ضائع ہو چکے ہیں، اگر محفوظ ہوتے تو ترقی پسند ادب کی تحریک کے سلسلے میں بعض نظریاتی الجھنوں کے حل میں بہت عمدہ ثابت ہو سکتے تھے۔ مجھے اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ جب ۱۹۵۱ء میں سید سجاد ظہیر گرفتار ہوئے تو خانہ تلاشی میں پولیس کو ان کے نام میرے یہ خطوط بھی دستیاب ہوئے جن پر قبضہ کر لیا گیا اور پھر انہیں انگریزی میں منتقل کر کے پولیس کے حکامِ اعلیٰ کی خدمت میں پیش کیا گیا جو ان کا تجزیاتی مطالعہ کرتے رہے۔ رہے وہ خطوط جو سید صاحب نے میرے نام لکھے تو تلاش بسیار کے باوجود وہ مجھے نہیں مل سکے۔ شبہ ہوتا ہے کہ میری خانہ تلاشیوں کے دوران وہ بھی خفیہ پولیس کے ریکارڈ میں چلے گئے ہوں گے۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

ضیاء الحق

بنّے بھائی ـــــ باغی فنکار

بنّے بھائی کی موت، بلاشبہ قوم کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

وہ نسل، جس نے ملک کی آزادی کے لیے اتنی بے جگری اور سرفروشی سے جہاد کیا اور دار و رسن کی ہر آزمائش سے مسکراتے ہوئے گزری، وہ نسل جس نے اپنے خون سے کشت آزادی کی آبیاری کی اور سوشلسٹ ہندوستان کے بیج بوئے، اب ہم سے رخصت ہوتی جاتی ہے۔ اس نے اپنے دن بھی پورے کر لیے ہیں اور اپنا کام بھی۔ وہ بنیادیں رکھنے کا جلیل القدر کام جن پر موجودہ نسل اور آئندہ نسل ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کر سکتی ہے۔

بنّے بھائی ایک دلنواز اور پہلودار شخصیت تھے۔ وہ فطری طور پر ایک فنکار تھے۔ ایک ایسا فنکار جس نے کبھی بھی اپنے آپ کو اپنی ذات کے خول میں بند کر لینے کا تصور تک نہیں کیا۔ یہ اسی فنکار کی حس اور انسان دوستی تھی جس نے انہیں اس رزم کا خاموش تماشائی بنے نہیں دیا جس کا میدان اس وقت گرم ہو چکا تھا اور وہ سربکف مادرِ وطن کی آزادی کی جدوجہد میں کود پڑے۔ قومی سطح پر سماجی انصاف اور کروڑوں کچلے ہوئے ہم وطنوں کی شخصیت کو منوانے کی جدوجہد میں اور عالمگیر سطح پر مستحکم سامراجی عالمی نظام کے حملوں اور سازشوں کے خلاف اپنے وجود کو برقرار اور اپنی بنیادوں کو استوار بنانے کے لیے نئے سماجی نظام، سوشلسٹ نظام کی جدوجہد میں کود پڑے۔

بنّے بھائی نے عیش و عشرت کی گود میں آنکھیں نہیں کھولیں۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کے

والد سید وزیر حسن اودھ چیف کورٹ کے ایک معمولی وکیل تھے اور اپنے مقدموں کے سلسلے میں سب ڈویژنل عدالتوں کو جانے کے لیے یکّوں میں دور دراز کے سفر کیا کرتے تھے۔ بعد میں وزیر حسن کو اپنی قابلیت اور محنت سے دولت اور خوشحالی ملی۔ یہ بھی سچ ہے کہ تاج برطانیہ نے انہیں 'سر' کا خطاب دیا، لیکن وہ زندگی بھر آزادی کی تحریک کی کھلم کھلا تائید کرتے رہے۔

یقیناً بنّے بھائی کو زندگی کی آسائشیں اپنے والد سے ورثے میں ملی تھیں، اس کے باوجود انہوں نے اپنے سیاسی کردار میں نہ تو کبھی آرام پسند زندگی کے پیچھے دوڑنے کی کوشش کی اور نہ کبھی قید و بند کی صعوبتوں یا اس تنگ دستی اور عسرت سے دامن بچانے کے بہانے ڈھونڈے جو اس زمانے میں ایک ہمہ وقتی سیاسی کارکن اور وہ بھی کمیونسٹ پارٹی کے کارکن کا مقدر تھے۔

انہوں نے اپنی زندگی کے کئی قیمتی سال برطانوی سامراجیوں کی جیلوں میں کاٹے۔ چوتھی دہائی کے دوران ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈکوارٹر پر بمبئی کمیون میں ایک ہمہ وقتی کارکن کی کڑی اور کٹھن زندگی بسر کی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان بھیجے گئے تو وہاں کمیونسٹ پارٹی کو منظم کرتے ہوئے برسوں تک روپوش رہے اور پھر گرفتار کر لیے گئے، ان پر حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور عدالت سے وکیل سرکار نے ان کے لیے موت کی سزا طلب کی۔ وہ برسوں تک سندھ اور بلوچستان کی کال کوٹھریوں میں موت کا انتظار کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی رفیقہ حیات 'رضیہ آپا' کو وہ یادگار خطوط لکھے جو ایک انقلابی کے عزم اور جرأت، آدرش پر غیر متزلزل یقین اور اعتماد سے بھرپور ہیں۔

سجاد ظہیر کا مارکسزم، لینن ازم سے یہ اٹوٹ سمبندھ اور زندگی کی آخری سانسوں تک وابستگی ایسی نہیں تھی جس کو ہم صرف ایک دانشور کی سماج کی لعنتوں کے واحد حل کی دریافت کا نام دے سکیں یہ ایک دانشورانہ دریافت سے زیادہ تمام انسانوں کے لیے حسن اور مسرت سے لبریز زندگی کے لیے ایک فنکار کی تمنا اور لگن تھی۔ انہوں نے عام آدمی کے استحصال اور استیصال کے خلاف بغاوت کی۔ اس ریاکاری اور مکاری کے خلاف بغاوت کی جس کے سہارے اونچے طبقات اور ان کے نظریہ ساز اس درندہ صفت استحصال اور استیصال کی پردہ پوشی کیا کرتے ہیں۔ 'انگارے' محض ان کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس دور کے مُلّاؤں اور مُلّا زدہ سماج کی ریاکاری اور عیاری کے

خلاف ایک فردِ جرم ہے۔ ان کہانیوں میں چھلکتا ہوا طنز آج بھی بے مثال ہے۔ تاہم سجاد ظہیر نے رومین رولاں، ہنری باربوس، رابندر ناتھ ٹیگور اور پریم چند سے شخصی روابط قائم ہونے کے بعد اپنی جوانی کے اس دور کی محاربانہ بت شکنی چھوڑ دی۔ انہی شخصیتوں کے زیرِ اثر انہوں نے ترقی پسند مصنفین منظم کی اور ۱۹۳۶ء کے دوران لکھنؤ میں اس کی پہلی کانفرنس منعقد کی۔ تاریخ ان کے اس عظیم کارنامے کو ہمیشہ اپنے سینے میں محفوظ رکھے گی اور دنیا کا کوئی بھی مورخ جب یہ لکھے گا کہ ہندوستانی ادیبوں اور فنکاروں کی اس عظیم تحریک نے اس نسل کی تمام زبانوں کے تمام دیانتدار اور شریف النفس ادیبوں اور شاعروں کو کشاں کشاں اپنی صفوں میں لایا، ان کے ادب کو نئے اُفق اور ان کی تخلیقات کو منفرد تخلیقی بلندیاں عطا کیں تو اس کو یہ بھی لکھنا پڑے گا کہ اس تحریک کے معمار اور ادیبوں و شاعروں کے اس کاروان کے قافلہ سالار سجاد ظہیر تھے۔ بنے بھائی کا یہی ایک کارنامہ ایسا ہے جو ہندوستانی ادب کی تاریخ میں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

سیاسی میدان میں بنے بھائی کے تابناک ورثے کا یہ صرف ایک پہلو ہے کہ وہ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کے عوام کے درمیان دوستی کے آدرش کے ایک عظیم علمبردار تھے۔ اس وقت بھی جبکہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات انتہائی ناخوشگوار تھے، سجاد ظہیر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کے آدرش کے حق میں ثابت قدمی سے ڈٹے رہے۔ حالیہ عرصے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تہذیبی اور انسانی تعلقات کی بحالی کے لیے ان کی انتھک مگر خاموش کوششیں بھلائی نہیں جاسکتیں۔

ان کی موت سے ملک ایک عظیم، محبِ وطن، ایک سچے انسان دوست، ایک پکے کمیونسٹ اور مکمل فنکار اور ہندوستانی تہذیبی تحریک کے ایک رہنما سے محروم ہوگیا انہوں نے جو ورثہ چھوڑا ہے، وہ حقیقی معنوں میں متنوع اور مالدار ہے۔ اس کی قدر اور حفاظت کی جانی چاہیے اور ان کے رفیقوں اور ساتھیوں کو ان کے دوستوں اور پرستاروں کو، فنکاروں اور تہذیبی کارکنوں کو اسے پروان چڑھانا چاہیے۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، ۲۳ ستمبر ۱۹۷۳ء

پی ایس۔ نیرورکر

وہ ایک آتشِ جاوداں

اب اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ بنے بھائی نہیں رہے۔ اب ان سے دوبدو بھی ملاقات نہ ہوگی اور شاید برسوں تک ان جیسا بھی کوئی کہیں نظر نہ آئے گا۔

مگر بنے بھائی مر کے بھی زندہ ہیں۔ ہمارے ساتھ زندہ ہیں، وقت کے ساتھ زندہ ہیں۔ ہر اس شخص کے ذہن میں زندہ ہیں جوان کو جانتا تھا، جس نے ان سے بات کی تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ حال میں زندہ ہیں بلکہ مستقبل میں بھی۔ میرا مطلب ہے کہ آنے والی نسلوں کے ساتھ بھی زندہ رہیں گے جوانہیں ان کی تحریروں اور ان کے بارے میں لکھی جانے والی تحریروں کے ذریعے جانیں گی اور رفتہ رفتہ اپنے ذہن و دل میں، اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کریں گی۔

میں نے بنے بھائی کا نام ـــــ سجاد ظہیر، سب سے پہلے ۱۹۴۳ء میں سنا تھا جب میں نوجوان تھا اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں نیا نیا شریک ہوا تھا۔ کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس مارواڑی ہال میں ہونے والی تھی اور میں نے کانفرنس کے لیے والنٹیر کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ میرے لیے 'سجاد ظہیر' کا نام ایک طلسم سا تھا اور جب میں نے انہیں روسٹرم پر سے کانفرنس کو خطاب کرتے سنا تو مجھ پر ان کی انتہائی وجیہہ شخصیت اور ان کی نرم گفتار انگریزی اور اردو کی خوبیٔ تقریر کا جادو پوری طرح چل چکا تھا۔ میں نے اس زمانے میں کہانیاں اور مختصر مضامین لکھنے شروع ہی کیے تھے اور مراٹھی ادب میں مجھے کوئی خاص شہرت نہیں حاصل ہوئی تھی۔

میں اس وسیع ہال کے ایک سرے پر رہا اور سجاد ظہیر، جو عمر میں بڑے تھے اور ناموری حاصل کر چکے تھے، دوسرے سرے پر تھے۔ ان سے ملاقات نہیں ہوئی، لیکن جب بھی ہال میں داخل ہوتے تو ہم والنٹیروں کی طرف دیکھ کر بڑی شفقت کے ساتھ مسکراتے۔ اس وقت کیسی آرزو تھی کہ ان سے ملوں اور باتیں کروں اور وہ تعریف میں بس ایک بار میری پیٹھ تھپتھپادیں، اچھے والنٹیر کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوجوان مراٹھی ادیب کی حیثیت سے لیکن اس وقت اس کی نوبت نہیں آئی۔

اس کے بہت دنوں بعد میں سجاد ظہیر سے ذاتی طور پر ملا اور ان سے اچھی طرح واقف ہوا۔ ۱۹۶۶ء۔ ۱۹۶۷ء میں ایک زمانے کے بعد نئی دہلی میں ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کُل ہند کانفرنس ہوئی جس میں ان کو قریب سے دیکھنے، ملنے اور باتیں کرنے کی برسوں پرانی آرزو پوری ہوئی۔

اس کانفرنس کے دوران، ہم ایک دوسرے سے بہت قریب آگئے اور بہت سے تہذیبی، ادبی اور بین الاقوامی محاذوں پر ہمارا ساتھ بڑھتا رہا، اس میں وسعت اور گہرائی آتی گئی۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے مراٹھی شاعر نرائن سوروے پر ایک مضمون 'نیوایج' کے لیے لکھنے کو کہا۔ میں نے مضمون لکھ کر انہیں بھیجا جس میں، میں نے سوروے کی پرولتاری زندگی کی تکلیفوں کا ذکر کیا تھا کہ وہ بمبئی کے فٹ پاتھ پر رہے ہیں۔ مضمون ملتے ہی بنّے بھائی نے مجھے خط لکھا۔ 'میں جلد ہی بمبئی آنے والا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میں سوروے سے ان کے میونسپل ہال میں ملوں۔ مراٹھی کے ترقی پسند ادیبوں کی میٹنگ کا بندوبست سوروے کے گھر پر ہی کرو'۔

مجھے وہ شام یاد ہے جب میں بنّے بھائی کو جونپور سے لے کر بمبئی کے گنجان آباد صنعتی علاقے میں سوروے سے ملنے گیا۔ سوروے کے چھوٹے سے کمرے میں مراٹھی ادیبوں، شاعروں، ناول نگاروں، اخبار نویسوں کی خاصی بڑی اور اہم جماعت جمع تھی جن میں سے زیادہ نوجوان اور باغیانہ مزاج کے لوگ تھے۔ کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دو ایک لکڑی کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جاڑے کے دن تھے اور بنّے بھائی گرم سوٹ پہنے ہوئے تھے لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی اور ادیبوں، شاعروں سے تعارف و ملاقات کے بعد سیدھے جا کے لوہے کے اس پلنگ پر بیٹھ گئے جو آدھے کمرے پر چھایا ہوا تھا اور جس پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی لوگ زمین پر بیٹھ گئے۔ ان

کی مشفق و مہربان شخصیت نے تکلف و احترام کی ان بندشوں کو ختم کر دیا جو غالباً دانشوروں کے ذہن میں رہی ہوں گی۔ بنّے بھائی نے ہمیشہ کی طرح نرم متوازن انداز میں پہلے انگریزی میں اور پھر حاضرین کے اصرار پر اردو میں تقریر کی اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں اور دوسرے ملکوں میں ادب کی ترقی پسند تحریک کے بارے میں بتایا۔

ان میں کٹر اصول پرستی نام کو نہیں تھی، وہ تو اپنی بات کے صحیح ہونے پر بھی اصرار نہ کرتے تھے، لیکن ان کی تقریر ایسی تھی کہ اس کا ایک ایک لفظ قابلِ یقین معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ مراٹھی دانشوروں سے انہیں کبھی کبھار ہی ملنے کا موقع ملتا ہے، لیکن انہوں نے یقین دلایا کہ خیال و عمل میں وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے ہیں اور رہیں گے۔ انہوں نے شاعر سوروے کو ان کی شعری تخلیقات پر خاص طور سے مبارکباد دی اور انہیں پُرقوت ترقی پسند شاعر اور ادیب قرار دیا۔ انہوں نے سوروے کی چند نظموں کا بھی حوالہ دیا جو انہوں نے میرے انگریزی ترجمے میں پڑھی تھیں اور سوروے سے بڑی انکساری کے ساتھ گزارش کی کہ وہ شاعری کی مشعل روشن رکھیں۔

وہ خود ایک عظیم دانشور تھے لیکن ہم لوگوں میں وہ اس طرح گھل مل گئے کہ ان کی عظمت کی طرف ہمارا خیال ہی نہیں رہا۔ ہم کو یہ لگا کہ وہ بھی ہماری ہی طرح نوجوان ہیں، جن میں توانائی اور پھرتی ہے، جو طرح طرح کے خواب دیکھتے رہتے ہیں، بڑے بڑے منصوبے بناتے رہتے ہیں، ان کی بھی آرزوئیں اور خواہشیں ہیں۔ یہ تھے بنّے بھائی ـــ اس شام کو وہ صحیح معنوں میں ہم سب کے بڑے بھائی تھے اور بس۔

۱۹۷۰ء میں افریشیائی ادیبوں کی چوتھی کانفرنس نئی دلّی میں ہوئی۔ ہم لوگ بھیشم ساہنی کے گھر سے دوپہر کو روانہ ہوئے تو بنّے بھائی نے مجھے شہر میں ایک مقام تک ٹیکسی میں لفٹ دی۔ وہاں سے اُتر کر مجھے ایک بس اسٹاپ پر پہنچایا اور بتایا کہ کون سی بس مجھے پہاڑ گنج لے جائے گی اور پھر رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، مجھے ایک پیڑ کے سائے میں لے گئے اور اچانک میرے کوٹ کی جیب میں سو روپے کا ایک نوٹ ٹھونستے ہوئے انہوں نے بڑے ملتجیانہ لہجے میں کہا، 'یہ تو رکھ لو...... مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ میں اس سے زیادہ

نہیں دے سکتا...... تم ہر بار نئی دہلی سے بمبئی تک آتے ہو، اتنی تکلیف اٹھاتے ہو......'

میں دم بخود رہ گیا۔ بنے بھائی کو اس کے لیے اتنی معذرت کرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ بھی اپنے سے چھوٹے کے سامنے، میرے لیے تو وہ خاندان کے بزرگ جیسے تھے، جن کی شفقت، اور رہنمائی اس نوٹ سے کہیں زیادہ وقیع تھی...... لیکن زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا گیا!

مجھے حیرت ہوتی تھی کہ بنے بھائی پر عمر کی زیادتی کا کوئی اثر ہی نہیں حالانکہ ان کی زندگی کتنی پریشانیوں، مصیبتوں، آزمائشوں اور کلفتوں کی زندگی تھی۔ اکثر ان کے سر پر موت کا بدنما سایہ بھی منڈلاتا رہا تھا۔

بنے بھائی کی عمر بہت تھی لیکن وہ مُسن اور معمر نہیں تھے، ہم سب سے وہ اتنے بڑے تھے لیکن ہم سب میں وہ ہمیں میں کے لگتے تھے، وہ آتشِ جاوداں تھے، ایک ایسا سرچشمہ تھے جو مہیب چٹانوں کے نیچے سے گزر کر بھی دوسروں کو سیراب اور تر و تازہ کرتے رہے۔ ہندوستان کے ترقی پسند ادب میں وہ عہد آفریں تھے۔ ان کے ساتھ اس ادبی تحریک کا ایک دور ختم ہو گیا جو خاموش مظلوم انسانوں کے مقصد کے لیے وقف تھا، جس مقصد سے زیادہ کوئی مقصد بنے بھائی کو عزیز نہیں تھا۔

کیوں نہ ہم بنے بھائی کی مصروف جدوجہد و پیکار زندگی کے اسی پہلو پر توجہ کریں اور ان کے خوابوں کی تکمیل کے لیے آگے بڑھیں؟

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

مقیم الدین فاروقی

کمیونسٹ دستے کا فرض شناس سپاہی

۳۵ برس پہلے کی بات ہے۔ بنے بھائی سے کلکتہ میں پہلی دفعہ میری ملاقات ہوئی اور وہ بھی اتفاقیہ۔ میں ابھی طالب علم تھا لیکن سیاسی میدان میں چند برس پہلے ہی آ گیا تھا۔ کلکتہ میں دسمبر ۱۹۳۸ء کی کرسمس میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی کانفرنس تھی۔ اس میں شامل ہونے کے لیے میں بھی گیا تھا۔ مرحوم ڈاکٹر اشرف نے اس کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ ان ہی دنوں کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بھی کانفرنس ہو رہی تھی۔

بنے بھائی اس تحریک کے روح رواں تھے اس کانفرنس کے سلسلے میں وہ بھی کلکتہ گئے تھے۔ بعض لوگ جیسے علی سردار جعفری دونوں ہی کانفرنسوں میں شریک تھے غالباً سردار کے ساتھ میں ڈاکٹر ملک راج آنند سے ملنے کے لیے ڈاکٹر ملک کے میزبان کے گھر گیا۔ ہم بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک نوجوان خوبصورت چہرہ کھادی کے سفید کپڑے اور نہرو جاکٹ پہنے ایک حسین خاتون کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ تھے سجاد ظہیر اور ان کی دلہن رضیہ۔ ان دونوں کی شادی کچھ دن پہلے ہی ہوئی تھی۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ رضیہ آپا کو جب معلوم ہوا کہ دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج میں پڑھتا ہوں تو انہوں نے پوچھا۔

'فاروقی تم سجاد کو جانتے ہو۔'

'جی ہاں، ہم ایک ساتھ ہی پڑھتے ہیں۔'

'وہ میرے چھوٹے بھائی ہیں'۔ رضیہ آپا نے کہا:

اس کے بعد سے رضیہ میرے لیے 'آپا' بن گئیں اور وہ مجھے فاروقی کی بجائے مقیم کہہ کر پکارنے لگیں اور بڑی بہن کی طرح ہمیشہ میرے سلام کے جواب میں 'جیتے رہو!' کہتی ہیں۔

حال ہی میں، میں نے رضیہ آپا سے پوچھا کہ سجاد کہاں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ پاکستان میں وہ ریلوے کے بہت بڑے افسر ہیں۔

پھر بنّے بھائی سے بات چیت ہوئی۔ بہت دھیرے سے بولتے، ہر لفظ کو ناپ تول کر استعمال کرتے۔ گفتگو کے دوران میں ایک دفعہ انہوں نے کہا:

'سنا ہے کہ سینٹ سٹیفن کالج تو ٹوڈیوں (انگریزوں کے پٹھوؤں کے لیے استعمال کرتا تھا) اور انگریز افسروں کے لڑکے لڑکیاں پڑھتے جاتے ہیں'۔

میں نے کہا: 'نہیں، میرا خاندان تو باغی مولویوں اور پیروں کا ہے۔ سینٹ سٹیفن کالج میں اکیلا میں ہی کھادی پہننے والا طالب علم ہوں'۔ ان کو تسلی ہوئی۔

اس کے بعد ہم گہرے دوست اور رفیق بن گئے اور ۳۵ برس کے بعد موت کے ظالم ہاتھ نے اس رشتے کو توڑ دیا۔ لیکن بنّے بھائی کے ساتھ دوستی جن اعلیٰ مقاصد کی بنیاد پر بنی تھی وہ تو لافانی ہیں اور اس لیے یہ روحانی رشتہ بھی لافانی ہے۔

سجاد ظہیر کا نام میں نے اس ملاقات سے پہلے سے سنا ہوا تھا۔ کانگریس میں بائیں بازو کی سیاست نئے روپ میں ابھر رہی تھی۔ سوشلزم کے خیالات بڑے پیمانے پر کانگریس میں گھر کرتے جا رہے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی (کانگریس کے اندر) کا قیام اس کی ایک بڑی علامت تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کی سیاست نے بھی کروٹ لے لی تھی اور ۱۹۳۶ء تک کمیونسٹ بھی کانگریس میں دوبارہ شامل ہو گئے تھے۔ ہم طالب علموں پر ان تمام واقعات کا برابر اثر پڑ رہا تھا۔ سجاد ظہیر قومی تحریک کے اس ابھرتے ہوئے رجحان کے نوجوان علمبرداروں میں سے تھے۔

۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے بعد، اس وقت کے کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے الہ آباد میں (جہاں کانگریس کا صدر دفتر آنند بھون میں تھا) بڑے پیمانے پر کانگریس کا سیکریٹریٹ مقرر کیا تھا اور ہمارے چند بہترین انقلابی دانشوروں کو اس میں

شامل کیا۔ ان میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد (جو بعد میں کمیونسٹ پارٹی کے ممتاز رہنما بن گئے) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اسی سال ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی اور اس کا پہلا اجلاس بھی لکھنؤ میں ہوا تھا۔ ہم جو آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں تھے، اس بات سے بہت متاثر تھے کہ بنّے بھائی جیسے لوگ آرام اور آسائش کی زندگی کو لات مار کر ایک ایسے راستے پر پڑ گئے ہیں جہاں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔

گلوں سے خار بہتر ہیں کہ دامن تھام لیتے ہیں کے مصداق انہیں کانٹوں نے ہم جیسے طالب علموں کا دامن تھام لیا اور ہم بھی اسی راستے پر چلنے لگے۔

۱۹۳۹ء میں دہلی میں بھی کمیونسٹ پارٹی بننے لگی، تین قسم کی انقلابی تحریکوں سے وابستہ چند افراد اس پہلے کمیونسٹ گروپ میں شامل ہوئے۔ بھگت سنگھ کی نوجوان بھارت سبھا سے متاثر، کانگریس میں کرنے والے اور طالب علموں کی تحریک (اسٹوڈنٹس فیڈریشن) سے تعلق رکھنے والے۔ اس پہلے گروپ کو اکٹھا کرنے اور اس کو تعلیم دینے کے کام میں سجاد ظہیر نے ہماری بڑی مدد کی اور ہم کو رہنمائی دی۔ سجاد ظہیر پارٹی کے مرکز کی طرف سے ہمارے انچارج بن گئے اور وہی ہمارے اسٹڈی سرکل لیتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ اسٹڈی سرکل میں جب بنّے بھائی لیکچر دے چکتے تو سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوتا۔ بنّے بھائی بیٹھے بیٹھے کبھی کبھی سو جاتے تھے۔ ہم مذاق میں بنّے بھائی سے کہتے کہ 'یہ گوتم بدھ کے pose میں بیٹھ کر کیا کسی روشنی کے لیے آنکھیں بند کر لی ہیں؟' وہ ہم سے بڑے تھے لیکن ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے کہ ہم آزادی کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ غصہ تو ان کو کبھی آتا نہیں تھا۔ ہمارے پہلے کمیونسٹ گروپ میں بعض مشکل حضرات بھی تھے۔ لیکن وہ اپنی مسکراہٹ اور ہمدردانہ رویئے سے ان مشکل حضرات سے نمٹ لیتے تھے۔ پھر دوسری عالمی لڑائی شروع ہو گئی۔ حالات بدل گئے ہمارے کام کرنے میں دقتیں بھی بڑھ گئیں۔

برطانوی سامراجی حکمرانوں نے قومی آزادی کی تحریک کے ریڈیکل حلقوں کے خلاف جبر و تشدد شروع کر دیا اور خاص طور پر کمیونسٹ بہیمانہ ظلم کا نشانہ بنے اکثر کمیونسٹ یا تو جیل کی کال

کوٹھریوں میں بند کر دیے گئے یا روپوش ہو گئے۔ بنے بھائی بھی ایک زمانے تک قید رہے ہیں 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کے دوران جیل سے رہائی کے بعد ۱۹۴۳ء میں، میں پھر بنے بھائی سے ملا۔ اس وقت جنگ کا کردار بدل گیا تھا اور بین الاقوامی حالات کے دباؤ کے تحت وہ قانونی پابندیاں ہٹالی گئی تھیں جو پارٹی اور اس کی سرگرمیوں پر لگائی گئی تھیں۔ پارٹی کا پہلا آل انڈیا ہیڈ کوارٹر بمبئی میں قائم ہو چکا تھا اور بنے بھائی پارٹی کے مرکزی اردو ترجمان اخبار 'قومی جنگ' کے ادارتی فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کی ادارت میں 'قومی جنگ' نے نہ صرف اپنی سادہ سیاسی زبان، عام فہم طرز تحریر اور سیر حاصل متن و مواد کے ذریعے اردو صحافت کے ان عظیم الشان سامراج دشمن روایات کو جو اس صدی کی اولین دہائیوں میں مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی نے قائم کی تھیں، آگے بڑھایا بلکہ انہیں ایک نئی شکل اور ہیئت بھی عطا کی۔

بنے بھائی نے ان گنت اردو ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کیا اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کچھ ادیب اور شاعر پیشہ ور انقلابیوں کی صف میں بھی شامل ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب اردو ادب عام طور پر ترقی پسندوں اور خاص طور پر کمیونسٹوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ بنے بھائی نے اس عمل میں خاص حصہ ادا کیا۔

اس دور میں ہندو مسلم سوال نے بھی ایک نئی وسعت اختیار کر لی۔ پاکستان کا نعرہ مسلم عوام کے ذہنوں پر چھا گیا۔ یہ قومی آزادی کی تحریک اور اس کی بورژوا لیڈر شپ کی سنگین کوتاہی کا نتیجہ تھا جو ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے میں ناکام ہو چکی تھی، اس پس منظر میں پارٹی نے ہماری مادر وطن کی آزادی کی جدوجہد میں ہندو مسلم عوام کا اتحاد پیدا کرنے کے لیے سامراج کے خلاف کانگریس لیگ اتحاد کا نعرہ دیا اور 'قومی جنگ' نے سامراج کے خلاف ہندو مسلم اتحاد کی اس لائن کو مسلمانوں میں مقبول بنانے میں انتہائی اہم حصہ ادا کیا۔

بدبختی سے ہماری پارٹی اتنی طاقتور نہ تھی کہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کو روک سکے۔ کیمونسٹ پارٹی کے فیصلے کے بعد بنے بھائی کیمونسٹ پارٹی کی مدد کرنے کے لیے وہاں چلے گئے۔ تقسیم کے بعد کے فسادات نے وہاں کی پارٹی کو تتر بتر کر دیا تھا۔ وہ پاکستان گئے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس کا مطلب بیوی اور بچوں سے برسوں جدائی ہے۔ اس کا انجام قید بھی ہے اور موت بھی

لیکن بنے بھائی میں پارٹی اور انقلاب کے لیے قربانی اور ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسی روح سے سرشار تھے جو ناقابلِ تسخیر تھی۔

چنانچہ یہی ہوا۔ وہ فیض احمد فیضؔ اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ رسوائے زمانہ 'راولپنڈی سازش مقدمے' میں پھانس دیئے گئے جس میں سرکاری وکیل نے ان کے لیے موت کی سزا طلب کی۔ مغربی پاکستان کی جیلوں سے انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات کے نام جو خطوط لکھے ہیں، وہ ان کی اس جرأت وعزم کے آئینہ دار ہیں جس کے ساتھ انہوں نے جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اس زمانے میں ہم ہندوستانی کمیونسٹ بنے بھائی کے لیے دن رات بے چین اور فکرمند رہا کرتے تھے۔

جیل سے چھوٹنے کے بعد بنے بھائی چھٹی دہائی کے وسط میں ہندوستان واپس آگئے۔ وہ دہلی آئے اور دہلی پہنچتے ہی سب سے پہلے ہمارے پارٹی دفتر (جامع مسجد) آئے ہم نے ایک دوسرے کو جدائی کے ان ۷ برسوں کے تجربات بتلائے۔ انہوں نے ان تمام ساتھیوں کی خیریت اور حالات پوچھے جن سے وہ شخصی طور پر واقف تھے۔ بنے بھائی پھر پارٹی کے کاموں میں لگ گئے۔ بنے بھائی نے اپنے آپ کو پارٹی کے کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا اور کمیونسٹ دستے کے ایک فرض شناس اور جانباز سپاہی کی طرح آخری وقت تک کام کرتے ہوئے مورچے پر ہی جان دی۔

سجاد ظہیر نے آج سے ۴۵ برس پہلے انگلینڈ میں جہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے تھے ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی شروع کی۔ انہوں نے ۱۹۲۷ء میں کمیونزم کو اپنایا اور مرتے دم تک کمیونزم (مارکسزم، لینن ازم) پر ان کا عقیدہ چٹان کی طرح اٹل رہا۔ ان کی زندگی نئی نسل کے لیے ایک مینارۂ نور بننا چاہیے۔

ہند۔ پاک دوستی، ان کی ایسی تمنا تھی جو آخری سانسوں تک ان کے دل کے ساتھ دھڑکتی رہی۔ چنانچہ آج ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پاکستان میں بھی ان کے دوستوں اور پرستاروں کا بہت بڑا حلقہ ہے۔

بنگلہ دیش کی آزادی کی جدوجہد کے دوران بنے بھائی نے مکمل طور پر بنگلہ دیش کی حمایت میں آواز بلند کی۔

ہمیں امید ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان پائیدار دوستی کے لیے بنّے بھائی کی دلی تمنا بہت جلد پوری ہوگی اور وہ دن بہت جلد آئے گا جب یہ تینوں پڑوسی دوستوں کی طرح مل جل کر ترقی کریں گے، آگے بڑھیں گے اور برصغیر کی تاریخ میں امن کا نیا باب کھل جائے گا۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

ایم۔ ایچ۔ عسکری

ترقی پسند تحریک کا قافلہ سالار

سوویت یونین میں افروایشیائی ادیبوں کی پانچویں کانفرنس کے دوران سجاد ظہیر کی اچانک موت سے مدت عمر کا وہ جہاد یکبارگی ختم ہوگیا جو انہوں نے ادیبوں اور دانشوروں کو ایک سماجی معاشی انقلاب کے مقصد کی خاطر مجتمع و متحد کرنے کے لیے شروع کیا تھا۔ مرحوم سجاد ظہیر کی نظروں میں انقلاب کا جو تصور تھا وہ یہ تھا کہ یہ مذہب یا رنگ اور نسل کی حد بندیوں کو توڑ کر ادیبوں اور دانشوروں کو بھی ایک عالمگیر عوامی تحریک میں اسی پلیٹ فارم پر لے آئے گا جس پر مزدور اور کسان تھے اور ان کے لیے خود اپنے مقسوم کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل کرے گا۔

سجاد ظہیر تقریباً ۳۷ سال ترقی پسند تحریک کے قافلہ سالار رہے اور اپنی انتھک آدرش پرستی کے ساتھ اس کے تکامل کے مختلف ادوار میں اس کی رہنمائی کرتے رہے۔ انہوں نے اسے ایک ایسا فورم بنادیا جس میں برصغیر کے کونے کونے کے ادیب اور شاعر درجنوں زبانوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

اپنے نیم جاگیردارانہ پس منظر اور آکسفورڈ یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ سجاد ظہیر آج شاید لوگوں کو بائیں بازو کے ترقی پسند نظریہ داں کے رول کے لیے موزوں نہ معلوم ہوتے ہوں لیکن برصغیر کی تاریخ کے جس دور سے ان کا تعلق تھا اس میں بہت سے ایسے نوجوان آدرش وادی تھے، جنہوں نے مغربی تعلیم کے ذریعے اپنے آپ کو نسبتاً خوشحالی کے پس منظر سے بے تعلق کرلیا اور سوشلزم کے

نظریے کے رومان کو محسوس کیا جو، ان دنوں ساری دنیا کے نوجوان ادیبوں اور مفکروں کی فکر میں بنیادی تبدیلی لا رہا تھا۔ یہ نوجوان اس بات سے بھی متاثر ہوئے کہ مغرب کے زیادہ تر ادیب جمہوریت اور سماجی انصاف کے آدرشوں کو اپنا رہے تھے۔ انہوں نے فاشزم اور جمہوری لبرل ازم کے تصادم کو بھی دیکھا اور ان میں ہٹلر اور مسولینی جیسے ڈکٹیٹروں کی اقتدار کی ہوس اور ان کے مظالم کے خلاف شدید نفرت بھی پیدا ہوئی۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ہیمنگوے اور کاڈویل جیسے ادیب اپنے عقائد کی بنا پر انٹرنیشنل بریگیڈ میں شامل ہو کر اسپین کی خانہ جنگی میں لڑے بھی اور یہ نوجوان بھی خواب دیکھنے لگے کہ وہ بھی اپنے وطن جا کر استعماری محکومی اور سماجی ناانصافی کے خلاف جدوجہد کریں گے۔

اس طرح کے بہت سے رومانویت پرست جلد یا بدیر، اپنی اصل پر واپس آ گئے اور انہوں نے اپنے طبقے اور خاندان کی خوشحالی اور سلامتی میں پناہ لی لیکن چند ایسے بھی تھے جو آدرش کی خاردار راہوں پر ثابت قدمی سے چلتے رہے اور ہر قسم کی محرومی اور تکلیف برداشت کرتے رہے۔ سجاد ظہیر کا تعلق اسی زمرے سے تھا۔

برِصغیر کے سارے اہم نوجوان ادیب اور دانشور ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب جہاں تک اردو کا تعلق ہے، تخلیقی سرگرمی اپنے عروج پر تھی اور فکر اور انداز بیاں میں بہت سی نئی ہیئتیں سامنے آئیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر ترقی پسند تحریک نہ ہوتی تو یہ نوجوان تخلیقی ادیب کچھ نہ لکھتے۔ زیادہ امکان اس کا تھا کہ ان کا جذبہ تخلیق روایت و تقلید کی بندشوں کو کبھی نہ کبھی توڑتا، لیکن یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ان کو اندر کی طرف نہیں باہر کی طرف دیکھنا سکھایا۔ انہیں اس حقیقت کا احساس دلایا کہ سماج کے دوسرے اداروں کی طرح ادب اور فن کو بھی عام انسان کے ارضی وجود سے مسلسل تعلق رکھنا ہوگا کہ ادب اور فن کو اب صرف ذہنی سرگرمی سمجھنا ممکن نہیں رہ گیا ہے، جس میں لوگ حقیقت سے بے نیاز ہو کر مصروف ہو سکیں۔ حقیقت سے لگاؤ کے اس احساس نے جدید اردو ادب میں ایک وقیع اور نئے بُعد کا اضافہ کیا۔

سجاد ظہیر پر تنقید کرنے والے اکثر یہ کہتے ہیں کہ ادیب کی حیثیت سے ان کی اپنی نگارشات

بہت ہی کم ہیں واقعے کی حد تک یہ تنقید صحیح بھی ہو سکتی ہے لیکن سجاد ظہیر کی اصل تخلیق یہ تھی کہ انہوں نے ادیبوں کو منظم کر کے ایک زبردست تحریک بنا دیا اور برصغیر کے عوام چوتھی اور پانچویں دہائی میں آزادی اور خودمختاری کے لیے جو جدوجہد کر رہے تھے اس کے لیے ایک دانشورانہ بنیاد تیار کر دی۔

جس نظریاتی بنیاد پر انجمن ترقی پسند مصنفین قائم تھی اس کی تشریح و توضیح انتہائی استقلال اور عرق ریزی کرنے کے ساتھ ساتھ سجاد ظہیر نے پوری کوشش کی کہ یہ انجمن جوش و خروش کے ابتدائی اُبال کے بعد ایک کلب کی طرح نہ ہو جائے جہاں بس حاضر جوابی اور ضلع جگت کے نمونے سننے میں آئیں۔ جیسا کہ اکثر ادبی انجمنوں کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔

سجاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کی علاقائی اور کل ہند کانفرنسوں کا جو حال لکھا ہے اس میں اردو ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی اور دوسری زبانوں کے بے شمار ادیبوں کے نام آتے ہیں جو انجمن کی اخلاقی اور دانشورانہ حمایت کے لیے تیار تھے۔ بزرگ ادیبوں اور دانشوروں میں ٹیگور، مولوی عبدالحق، سروجنی نائیڈو اور پریم چند شدید انفرادیت پسندوں میں جگر، جوش، فراق اور حسرت موہانی، نوجوانوں میں فیض، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، اختر حسین رائے پوری اور سبط حسن یہ سب لوگ کسی نہ کسی طرح سے تحریک سے وابستہ تھے۔ سجاد ظہیر ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال سے لاہور میں ملے اور ان سے ترقی پسند تحریک اور ادب میں سوشلسٹ اندازِ فکر کے لیے ہمدردی حاصل کر لی۔ ٹیگور نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس کے لیے ایک پیغام بھیجا اور یہ نصیحت کی کہ "نئے ادیب عام لوگوں میں گھل مل جائیں اور ان کو سمجھیں اور میری طرح گوشہ نشینی کی زندگی نہ بسر کریں"۔

انجمن اور ترقی پسند تحریک کو منظم کرنے کا کام اس لیے اور بھی مشکل ہو گیا کہ حکومت اسے شبے کی نظر سے دیکھنے لگی اور دوسری جنگ عظیم کے شروع میں اس کے سارے اہم کارکن قید کر دیے گئے۔

پاکستان سے سجاد ظہیر کا تعلق بہت مختصر لیکن طوفانی تھا۔ وہ یہاں تقسیم کے تھوڑے دنوں بعد آئے اور آتے ہی کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم میں لگ گئے وہ بڑا پُرآشوب اور غیر یقینی دور تھا۔ سجاد ظہیر اپنا کام پوری طرح سنبھال بھی نہ پائے تھے کہ انہیں 'راولپنڈی سازش

کیس' میں ماخوذ کر دیا گیا، فوجی افسروں کی ایک جماعت اور فیض احمد فیض کے ساتھ ان پر بھی حیدرآباد میں ایک خاص ٹریبونل میں طویل خفیہ مقدمہ چلا۔ جیل سے وہ ۱۹۵۵ء میں رہا ہوئے اور انہیں فوراً ملک بدر کر دیا گیا۔

فیض کے اس زمانے کے خطوط جب وہ سجاد ظہیر کے ساتھ جیل میں تھے۔ ابھی حال میں 'صلیبیں میرے دریچے میں' کے نام سے چھپے ہیں۔ ان میں جگہ جگہ سجاد ظہیر کا ذکر آتا ہے لیکن سب سے دردناک حوالہ ایک اقتباس میں ہے جو سجاد ظہیر کی بیوی رضیہ نے فیض کو لکھا تھا۔ رضیہ نے جون ۱۹۵۱ء میں اپنے خط میں لکھا تھا' ...... کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ آئندہ نسلیں جب تم لوگوں کا ذکر کریں گی تو کبھی انہیں میرا اور ایلس (فیض کی بیوی) کا بھی خیال آئے گا یا نہیں۔ ہم ہمیشہ تمہارے ساتھ ساتھ چلتے رہے، حالانکہ تم لوگ ہم سے ایک قدم آگے تھے۔ کبھی کبھی تم لوگ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے، یہ یقین حاصل کرنے کے لیے کہ ہم اب بھی تمہارے ساتھ ہیں اور ہم جواب میں تمہیں یقین دلانے کے لیے مسکرا دیتے، حالانکہ دل کرب سے چیختے رہتے!' رضیہ سجاد ظہیر کی مشکل ایک طرح سے ختم ہوگئی اور اب تو ان کا دل بھی ایسا سُن ہو کر رہ گیا ہوگا کہ چیخنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ ان کے اس ذاتی غم کو شاید ہی کوئی بانٹ سکے۔

ہفت روزہ 'حیات'، نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

ظفر اللہ پوشنی

جیل کے دن

ابھی چند دن ہوئے مجھے مختلف اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر شدید رنج ہوا کہ سید سجاد ظہیر الما آتا میں انتقال کر گئے۔ مجھے یہ شرف حاصل رہا ہے کہ 'راولپنڈی سازش کیس' میں ایک قیدی کی حیثیت سے میں حیدرآباد (سندھ) کے جیل کی ایک کوٹھری میں ان کے ساتھ ڈیڑھ سال رہا ہوں۔ اسی لیے مجھے یہ لگا کہ مجھے بنے بھائی کے دل و دماغ کی خوبیوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیے۔

سجاد ظہیر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۱ء کے دوران سابق میجر جنرل اکبر خاں کے گھر پر راولپنڈی میں ہوئی تھی ان دنوں وہ روپوش تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سجاد ظہیر نے، جو ان دنوں بڑی بڑی گھنی مونچھیں رکھے ہوئے تھے، ایک مختصر سی تقریر کی جس میں انہوں نے اس امر پر روشنی ڈالی کہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد بھی برِ صغیر ہند و پاک پر مغربی سامراجیت کا غلبہ بدستور قائم ہے۔ انہوں نے بہت نرم لہجے میں، دھیرے دھیرے اور سکون کے ساتھ تقریر کی اور انہیں دیکھ کر مجھ پر جو تاثر قائم ہوا وہ ایک انقلابی خفیہ سیاسی تحریک کے سربراہ سے زیادہ ایک عالم پروفیسر کا تھا۔

سجاد ظہیر سے میری دوسری ملاقات ایک 'بلیک ماریا' میں...... اس بند گاڑی میں ہوئی جس میں قیدیوں کو اِدھر اُدھر منتقل کیا جاتا تھا۔ یہ لاہور سینٹرل جیل کی بات ہے۔ ہم سات فوجی افسروں کو جیل سے 'بلیک ماریا' میں جسٹس سر عبدالرحمٰن کے گھر لے جایا جا رہا تھا تاکہ عدالت میں پیشی کرا کے حوالات میں بند کرنے کے احکامات لے لیے جائیں۔ بند گاڑی کا دروازہ کھلا اور ایک شخص کُرتا پاجامہ پہنے جناح کیپ لگائے اندر آیا اور آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک ہم میں سے کسی نے انہیں

نہیں پہچانا۔ ان کی بڑی بڑی گھنی مونچھیں غائب ہو چکی تھیں اور قید تنہائی کی صعوبتوں سے ان کا وزن بہت کم ہوگیا تھا۔ جب ہمیں جوڈیشل ٹریبونل کے سامنے پیش کیا گیا تو سجاد ظہیر اپنی سیٹ سے اٹھے اور انہوں نے مختصر لیکن شعلہ بار تقریر کی جس پر ہر شخص حیران رہ گیا۔ اب اس نرم پیشہ ورانہ لہجے اور شائستہ شریفانہ انداز کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔ وہ ایک انقلابی کی تقریر تھی۔ انہوں نے جو کچھ اپنی تقریر میں کہا اس سے کہیں زیادہ میں ان کی تقریر کے پُر اعتماد اور مجاہدانہ حملہ آورانہ انداز سے متاثر ہوا اور میرا سابق تاثر میرے ذہن سے ہمیشہ کے لیے محو ہوگیا کہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری میں دَم نہیں ہے۔

بعد کو، حیدرآباد جیل کی کوٹھریوں میں جب ہم ساتھ ساتھ رہے تو میں نے دیکھا کہ سجاد ظہیر بنیادی طور پر مہربان، نیک اور شریف انسان تھے۔ میں جن لوگوں سے زندگی میں ملا ہوں ان میں وہ محبوب ترین شخصیتوں میں سے تھے۔ ہمیشہ خلیق، ہمیشہ فیاض اور ہمیشہ دلکش۔ میں نے کم ان کو کسی پر غصہ ہوتے دیکھا اور صحیح معنوں میں آپے سے باہر ہوتے تو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ شاید یہ ایک طرح کی کمزوری تھی۔ شاید انقلابی رہنما اسی وقت پوری طرح موثر ہو سکتا ہے جب وہ غصہ ور انسان ہو۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ میں بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحبت میں انسان کو انتہائی خوشی کا احساس ہوتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ ان سے گلے لگ کے کہا جائے۔ 'مولانا، آپ بے مثال انسان ہیں، غضب کے انسان ہیں، آپ کا جواب نہیں'۔

یہاں یہ صراحت بے جا نہ ہوگی کہ سجاد ظہیر جس زمانے میں روپوش تھے اس زمانے میں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی میں مولانا، ان کا شناخت کا نام تھا۔ گرفتاری کے بعد یہ نام قید خانے میں بھی ان سے چپکا رہا اور ہم سب فوجی افسران اور غیر فوجی انہیں 'مولانا' ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

مجھے اس پہلو پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے جو ہر شخص جانتا ہے کہ سجاد ظہیر ایسے انسان تھے جو علم و دانش کا ایک اتھاہ خزانہ تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے فلسفہ، سیاست اور ادب میں اردو اور بیرونی زبانوں میں جو کچھ بھی پڑھنے لائق تھا۔ وہ سب پڑھ چکے ہیں۔

سجاد ظہیر کمر پر سے بھاری ڈول کے تھے اور توند والے زیادہ تر لوگوں کی طرح ان میں آہستہ روی اور سست رفتاری تھی۔ جتنی دیر میں وہ کھانا کھاتے تھے اس سے ایک تہائی وقت میں، میں اپنا

کھانا ختم کر چکتا تھا۔ یہ تیزی انہیں اچھی نہیں لگتی تھی۔ طنزیہ انداز میں کہتے' کپتان صاحب، کھانا اس طرح کھانا چاہیے؟ آپ کو تو لگتا ہے کھانے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ بھلے آدمی، کھانے کا مزہ لو۔ یہاں جیل خانے میں جلدی کیا ہے؟ فرصت ہی فرصت ہے۔ جو کھانا سامنے آیا ہے اس کی بے حرمتی نہ کرو!' کھانے کے بعد وہ کوٹھریوں کے بلاک کے صحن میں نپے تلے قدموں سے چہل قدمی کرتے تھے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیا کرتے تھے کہ اس سے ان کا ہاضمہ ٹھیک رہے گا۔

سجاد ظہیر سفید کُرتا اور سفید پاجامہ پہنتے تھے جو ہمیشہ اُجلے اور بے داغ ہوتے تھے۔ جاڑوں میں وہ گرم جواہر جیکٹ پہن لیتے تھے۔ جہاں تک اچھے کھانے کا شوق، اُجلے لباس اور ان کی شائستگی کا تعلق ہے وہ خاصے جاگیردار معلوم ہوتے تھے اور اس پر کسی کو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ ان کا تعلق یوپی کے ایک امیر اور مشہور گھرانے سے تھا۔ آدمی مطالعے یا عقیدے یا ضمیر کے تقاضے کی بنا پر اپنے سیاسی خیالات بدل سکتا ہے، لیکن رہن سہن کی عادتیں ہم سب میں بچپن سے اتنی راسخ ہو چکی ہوتی ہیں کہ انہیں بالکل رد کر دینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

جیل سے چھوٹنے کے بعد میں سجاد ظہیر سے صرف دو بار مل پایا۔ اس زمانے کی پاکستانی حکومت نے بنے بھائی پر یہ بات بالکل واضح کر دی کہ انہیں پاکستان میں آزاد انسان کی حیثیت سے نہیں رہنے دیا جائے گا۔ وہ چاہیں تو ملک سے باہر چلے جائیں یا پھر سیفٹی ایکٹ کے تحت قید خانے واپس پہنچا دیے جائیں اور اپنی مرضی اور خواہش کے بالکل خلاف سجاد ظہیر پاکستان سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہیں رہ گیا۔ میں نے سنا کہ وہ ہندوستان میں تہذیبی محاذ پر کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی تین کمیونسٹ پارٹیوں میں سے سجاد ظہیر پرانی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی ہی میں رہے۔ بہ الفاظ دیگر، وہ تادمِ آخر اپنے عشقِ اول پر قائم رہے۔ کسی کو سجاد ظہیر کی سیاسی رایوں اور اس کے سیاسی اقدامات سے چاہے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، اس بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ ساری زندگی انہوں نے اسی چیز کو اپنا لائحہ عمل بنائے رکھا جسے وہ انتہائی دیانتداری اور صدقِ دل سے اپنے عوام کے لیے اور انسانیت کے لیے سب سے اچھا سمجھتے تھے۔ بہت کم ہیں ایسے لوگ جن کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہو۔

ہفت روزہ 'حیات'، نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

انوار علیم جانوف

آخری ملاقات، آخری باتیں

حالات کچھ ایسے تھے کہ میں وہ شخص بن گیا جس سے سجاد ظہیر نے اپنی زندگی میں آخری بار بات کی۔ یہ اسی سال کے موسم خزاں کے اوائل ۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کی بات ہے، اس اسپتال میں جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری دن اور گھنٹے گزارے۔ ہمیشہ کی طرح وہ مطمئن اور پُر سکون تھے اور بڑے نرم لہجے میں بات کر رہے تھے:

مجھے اس کا بڑا افسوس ہے کہ میں کل الفارابی والے اجلاس میں تقریر نہ کرسکوں گا۔ اس عظیم انسان کے بارے میں چند لفظ کہنے کا میرا بڑا جی چاہتا تھا۔ الفارابی بہت بڑا مفکر تھا جس نے روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کی برابری کا خواب دیکھا تھا، نوع انسانی کی اخوت کا خواب دیکھا تھا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ مجھے بستر سے اٹھنے اور اجلاس میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں حالانکہ آج میں اس دیس میں ہوں جہاں اس نے جنم لیا تھا...... خیر، مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کہ ہماری افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس اتنی اچھی چل رہی ہے۔ تم اپنے پھول ذرا اوپر رکھ دو، اُدھر الماری پر تاکہ میں انہیں دیکھ سکوں...... اور تم اب جاؤ، مجھے پتہ ہے کہ تم اس کانفرنس میں کس قدر مصروف ہو۔

اور یہ سجاد ظہیر کے آخری الفاظ تھے۔ اگلے دن صبح سے ہی وہ بے ہوش ہو گئے اور پھر ہم میں سے کوئی بھی اپنے پیارے سجاد سے نہ مل سکا۔

سب سے پہلے میں ان سے برسوں پہلے ملا تھا اور پہلے ہی دن سے میں نے انہیں زندگی میں اپنا رہبر مان لیا، میرے لیے وہ ایک جہاندیدہ دوست تھے، بڑے بھائی تھے۔ میں سب سے پہلی بار ان سے افریشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس میں ۱۹۵۸ء میں تاشقند میں ملا تھا جب میں نے ادب کی دنیا میں بس قدم رکھا ہی تھا۔ اس کے بعد سے اکثر ملاقات ہوتی رہی اور میں ان سے اور ان کی رفیقۂ حیات رضیہ ظہیر سے اچھی طرح مانوس ہو گیا اپنے بہت سے ہمکاروں کی طرح۔ ان سارے سوویت ادیبوں کی طرح جو انہیں جانتے اور ان سے پیار کرتے تھے۔ ہماری بھی یہ عادت ثانیہ بن گئی کہ زندگی اور ادب کے بارے میں ان کی فیصلوں کو وقیع سمجھیں اور ان کی رائے اور ان کے خیالات کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیں۔

سجاد ظہیر کی زندگی اور جدو جہد کے بارے میں کچھ کہنا میرا کام نہیں ہے، انہوں نے اپنے وطن کے لیے جو انہیں سب سے زیادہ عزیز تھا جو کچھ کیا اس کو پرکھنے کی کوشش کرنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اسے یاد رکھا جائے گا، اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

اور اس چیز کو کبھی نہیں بھلایا جا سکے گا کہ سجاد ظہیر نے ہندوستان اور سوویت یونین کی قوموں کی دوستی کے بلند مقاصد کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، سوویت ادیب ان کی ان خدمات کو ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھیں گے جو انہوں نے ہندوستان اور سوویت یونین کے ادیبوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کے لیے انجام دیں۔ سوویت ادیب سجاد ظہیر کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ اس کمیونسٹ ادیب کو جو عقائد میں ہمارا رفیق تھا، جو وفادار اور مصفا روح رکھنے والا انسان تھا، جو عزم محکم رکھتا تھا، جو کبھی کسی بدی یا ناانصافی کو قبول نہ کر سکتا تھا۔

سجاد ظہیر ہمارے ساتھ زندہ رہیں گے، جیسے کہ ان کی تصنیفات زندہ رہیں گی۔ ہمارے لیے وہ مرے نہیں، وہ ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔

ہفت روزہ 'حیات'، نئی دہلی، ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء

چوتھا حصہ

دفترِ جُنوں

سجاد ظہیر کی چند یادگار تحریریں

سجاد ظہیر

یادیں

۱۹۳۴ء عجب سال تھا۔ میں اس زمانے میں لندن میں اپنی طالب علمی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ طالب علمی کیا تھی؟ وہ زندگی، جس میں کچھ ہی مہینوں بعد میں پوری طرح پڑ جانے والا تھا، ایک طرح سے شروع ہو گئی تھی، قانون جسے پڑھنے کے لیے میں لندن میں ٹھہرا تھا۔ میرے لیے ایک چھوٹی سی چیز ہو کر رہ گیا تھا، بالکل معمولی، غیر ضروری اور اہمیت سے خالی، اصل بات تو یہ تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے یورپ میں خاص طور پر اور عام طریقے پر ساری دنیا میں جو دن بدن تبدیلیاں ہو رہی تھیں، یہ جو معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانہ مٹ رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کے پیدا ہونے کے آثار ہیں، اس کا نقشہ ہر گھڑی رہتا تھا۔ یہ اس لیے نہیں کہ میں کوئی غیر معمولی سمجھ کا نوجوان تھا۔ اس لیے بھی نہیں کہ میرا دل دنیا کے دکھ کو دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ کے بہت سے پڑھے لکھے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، ہندوستانی اور انگریز کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے۔ وہ وقت، وہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا۔

۱۹۳۵ء سے پہلے کے دو سال کا ذرا خیال کیجیے۔ ساری دنیا پر نازل ہونے والی اکنامک کرائسس (معاشی بحران) کا پولیٹیکل اثر جرمنی میں ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہم کو لندن میں اور پیرس میں جرمنی سے بھاگے یا نکالے ہوئے مصیبت زدہ لوگ روز ملتے تھے۔ فاشزم کے ظلم کی درد بھری کہانیاں ہر طرف سنائی دیتیں جرمنی میں آزادی

پسندوں اور کمیونسٹوں کو سرمایہ داروں کے غنڈے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ وہ ہولناک تصویریں جس میں عوام الناس کے ہر دلعزیز لیڈروں کی پیٹھ اور کولہے کوڑوں کے نشانوں سے کالے پڑے ہوئے دکھائی دیتے، وہ خوفناک واقعات جو وقتاً فوقتاً کسی بڑے کمیونسٹ لیڈر کے جلاد کے ہتھوڑے سے سر قلم ہونے کے بارے میں اخباروں میں چھپتے، وہ اندوہناک اندھیرا جو علم و ہنر کی اس چمکدار دنیا سے جس کا نام جرمنی تھا پھیلتا ہوا سارے یورپ پر اپنی ڈراؤنی پرچھائیں ڈال رہا تھا، ان سب نے ہمارے دل اور دماغ کے اندرونی اطمینان اور سکون کو مٹا دیا تھا۔ صرف ایک طاقت اس جدید بربریت کے طوفان کا مقابلہ کر سکتی تھی، اور وہ تھی کارخانوں کے مزدوروں کی منظم طاقت، اس جماعت کی طاقت جو اکٹھا ہو کر کام کرنے سے، مسلسل طبقاتی جدوجہد کا تجربہ حاصل کر کے، ایک ایسا انقلابی جماعتی شعور پیدا کرتی جا رہی تھی جو اسے سماج کو نیچے گھسیٹنے والی سرمایہ داری کو شکست دینے اور مستقبل کی معاشرت کی تعمیر کرنے کا بدرجہ اتم اہل بناتی تھی۔

کیا یہ صرف ہماری امید تھی؟ صرف ایک خواہش؟ ایک اندھیرے میں کھوئے ہوئے مسافر کی تمنا کہ کہیں سے بھی روشنی کی ایک دھندلی کرن تاریکی کی مہلک چادر کو چاک کرے؟

دمتروف کا مقدمہ:

جرمنی ہی میں پہلی بجلی چمکی۔ کیمونسٹوں کو بدنام کرنے کے لیے ہٹلر اور اس کے ساتھیوں گوئیرگ و گوبلس وغیرہ نے سازش کر کے جرمن پارلیمنٹ کی عالیشان عمارت میں خود آگ لگوا دی (مارچ ۱۹۳۳ء) اور چند کیمونسٹ لیڈروں کو یہ کہہ کر گرفتار کروا لیا کہ یہ انہیں کی حرکت ہے ان ملزمین میں دمتروف بھی تھا۔ یہ شخص بلغاریہ کی کیمونسٹ پارٹی کا ایک لیڈر تھا جو، ان دنوں برلن میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ کئی مہینے حراست میں پڑے رہنے کے بعد جب مقدمہ شروع ہوا تو دفعتاً ساری دنیا کی نظریں شہر لائپزگ کے جرمن ہائی کورٹ کے ایک کمرے کی طرف منتقل ہو گئیں۔ دمتروف نے ایسے بیانات دیئے جس کی وجہ سے نہ صرف اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کی بے گناہی ثابت کی، بلکہ جرمن فاشزم کو الٹا مجرم ٹھہرایا اور ساتھ ہی اپنے اس غیر فانی عقیدے کا بھی اظہار کیا کہ جرمنی میں فاشزم ہمیشہ نہیں رہے گا اور ایک نہ ایک دن جرمن مزدور اپنے کندھوں سے

سرمایہ داری کے بوجھ کو ضرور اتار پھینکے گا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب دمتروف اور اس کے دوسرے ساتھیوں کی رہائی کے لیے امریکہ، انگلستان، فرانس وغیرہ میں مزدوروں کے بڑے بڑے مظاہروں کی خبریں آئیں، سرمایہ داروں کے اخبار بھی دمتروف کی بے گناہی کا اعتراف کرتے تھے اور اس کی اس دلیری کی تعریف کرتے تھے کہ ہر طرح کی جسمانی اذیتوں اور سزاؤں کی دھمکیوں کے باوجود وہ کچہری میں حقیقت کا صاف اظہار کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔

اب اہلِ علم میں بھی کچھ ہلچل ہونے لگی۔ جرمنی کے بڑے بڑے مصنفین (ٹامس مان، ٹولر، وغیرہ) بین الاقوامی شہرت رکھنے والے سائنس داں (آئنسٹائن ہابر وغیرہ)، ماہرانِ موسیقی، آرٹسٹ، ڈاکٹر وغیرہ جلاوطن ہو کر بے سروسامانی کی حالت میں تھے ہی اب دمتروف کے مقدمے کے سلسلے میں اور جرمنی جلاوطنوں کی حمایت کے لیے مغربی یورپ اور امریکہ کے اہلِ علم، ادیب، غرض کہ اس طبقے کے بہت سے لوگ جن کا پیشہ لکھنا پڑھنا ہے فاشزم کی مخالف تحریکوں میں کسی نہ کسی طرح سے کھنچے چلے آ رہے تھے۔

یہ احساس عام ہونے لگا کہ فاشزم کی وبا کا اگر تدارک نہ کیا گیا تو وہ جرمنی تک محدود نہ رہے گی بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی پھیل سکتی ہے۔ وہ حالات فاشزم جن کا نتیجہ ہے، ان ممالک میں بھی تیزی سے پیدا ہو رہے تھے۔ جہاں نام نہاد جمہوریت تھی۔ یہاں بھی سرمایہ دار طبقہ جو ابھی تک 'جمہوریت' کا نام لے کر محنت کشوں کا استحصال کرتا آیا تھا اپنے اس بھیس کو اتار پھینک کر، شہری آزادیوں کو کچل کر، مزدوروں کی ہر طرح کی تنظیم کو توڑ کر اور تمام نیابتی اداروں کو خاک میں ملا کر برہنہ آمریت کو اپنا سکتا تھا۔

چنانچہ فرانس میں دن بدن یہ خطرہ بڑھنے لگا۔ جرمنی کی طرح وہاں بھی مسلح فاشسٹ جھنڈ مزدوروں کے جلسوں اور جلوسوں پر حملے کرنے لگے۔ حکومت جانتی تھی کہ ان غیر قانونی کارروائیوں کے پیچھے لوہے اور کوئلے کی کانوں کے مالکوں، فولاد اور بجلی کے کارخانے والوں، بینکوں کے کرتا دھرتاؤں کی روپیوں کی تھیلیاں ہیں، لیکن وہ سرمایہ داروں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ان خلاف قانون مظاہروں کو دیکھتی اور کچھ نہ کرتی۔

فرانس میں:

یکا یک ایک دن خبر آئی کہ رجعت پسندوں نے فرانسیسی پارلیمنٹ پر حملہ کر دیا، پیرس میں ایک جم غفیر نے چیمبر آف ڈیپوٹیز (ایوانِ پارلیمنٹ) کو گھیر لیا۔ وزارت نے خوفزدہ ہو کر استعفیٰ دے دیا اور پہلے سے زیادہ رجعت پسند وزارت بن گئی۔ اس واقعے نے سب کی آنکھیں کھول دیں، لوگ پوچھنے لگے کہ کیا ہٹلر کی طرح اس حریت، مساوات، اخوت کی جنم بھومی میں بھی سرمایہ دارانہ آمریت کا بول بالا ہو گا؟

مزدور جماعت نے اس سوال کا فوراً جواب دیا۔ فرانس میں زبردست عام ہڑتال ہوئی، کمیونسٹ لوگوں نے 'متحدہ محاذ' کا نعرہ بلند کیا (۱۹۳۳ء) اور سوشلسٹ اصلاح پسند لیڈروں کے باوجود مزدور سبھاؤں میں اتحاد و یکجہتی نظر آنے لگی۔ ہر مزدور یہ سمجھنے لگا کہ اگر ان میں ایکا ہو تو ان کی طاقت ایک مشین پر دارومدار رکھنے والی معاشرت میں فیصلہ کن ہو سکتی ہے۔ فرانس کے مزدوروں کی عام ہڑتال نے تمام آزادی پسندوں کے دلوں کو مضبوط کیا اور فرانس میں اس واقعے کے بعد جیسے نئی زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ اب رجعت پسند جماعتیں پسپا ہونے لگیں اور مزدور جماعت کے اتحاد، ڈسپلن اور عملی قوت نے درمیانی طبقوں کو بھی اپنی طرف مائل کرنا شروع کیا۔

آسٹریا میں:

اِدھر یہ ہو رہا تھا، اُدھر آسٹریا میں ایسے واقعات ہوئے جو المناک ہوتے ہوئے بھی انقلابی تابنا کی رکھتے تھے۔ صلح نامہ ورسائی نے آسٹریا کو، کاٹ چھانٹ کر ایک چھوٹی سی ریاست بنا دیا تھا۔ ایک ایسی ریاست جو اپنی معاشی مشکلات کی وجہ سے یورپ کی کسی نہ کسی بڑی سلطنت کے زیرِ اثر ہوئے بغیر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ہٹلر اور مسولینی کے عروج کے بعد فرانسیسی سامراج کا اقتدار وسطی یورپ اور بلقان میں گھٹتا جا رہا تھا آسٹریا پر اب اٹلی اور جرمنی دونوں للچائی نظریں ڈالنے لگے۔ عام اقتصادی بحران وہاں بھی اپنے اثرات پیدا کر رہا تھا۔ وہ جمہوری نظام جو صلح نامہ ورسائی کے بعد آسٹریا میں نافذ کیا گیا تھا (یعنی وہ نظام جو سرمایہ پرستی پر جمہوریت کی نقاب ڈالتا ہے) لڑکھڑا رہا تھا۔ حتیٰ کہ ایک دن اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ آسٹریا کا دستور اساسی منسوخ ہو گیا۔ پارلیمنٹ

ہمیشہ کے لیے برخاست کر دی گئی۔ میونسپلٹیوں کے ہاتھ سے سب طاقت چھین لی گئی اور ایک پستہ قد انسان ڈالفس نے اپنے اکیلے ہاتھوں میں سلطنت کی باگ ڈور لے لی، یعنی یورپ کے ایک اور ملک میں فاشیت قابض ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی، یا کچھ ہی دن بعد دوسری خبر: ویئنا، لنز، گراتز، آسٹریا کے بڑے صنعتی شہروں کے مزدوروں نے غاصب حاکم کے جابرانہ احکام ماننے سے انکار کر دیا، ڈالفس نے مزدوروں کی جماعتوں سے تمام ہتھیار چھین لینے کا حکم دیا، اس پر مزدوروں اور سرکاری فوجوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ مزدور بڑی بہادری سے لڑ رہے ہیں، شہر کے بہت سے حصوں پر وہ قابض ہو گئے۔ پھر دوسری خبریں، حکومت کے پاس بہتر اسلحہ جات ہونے کی وجہ سے مزدور پسپا ہو رہے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب ان کے جیتنے کی امید باقی نہیں وہ بڑی بہادری سے لڑتے جا رہے ہیں۔ آخر میں شکست۔ لیکن فاتح کی خونی کامیابی اور اس کے مظالم کی شدت سے مزدور جماعت کی طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔

ہمیں محسوس ہونے لگا کہ فاشیت کی گو آج جیت ہوئی ہے، لیکن دوسری طرف محنت کشوں کا انقلابی شعور بڑھ رہا ہے! انہیں ناکامیوں کا تجربہ کامیاب انقلاب کو ممکن بنائے گا!

کیا ہوگا؟

دمتروف کا مقدمہ، فرانس کے مزدوروں کی بیداری، آسٹریا کا ناکامیاب مزدور انقلاب، آج ان واقعات کی اہمیت اکثر لوگوں کے لیے کچھ نہیں، لیکن ہمارے لیے بہت تھی۔ یہ تو بالکل ظاہر معلوم ہوتا تھا کہ انسانیت کے لیے بہت دنوں تک امن، سکون، چین کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ بڑی سخت کشاکش، جد و جہد، بین الاقوامی جنگ، انقلاب کے دور کا آغاز ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ کیا آدمیت کبھی بھی اس سیلاب آتش و آہن سے نجات حاصل کر سکے گی؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ ہم نوجوان، جن کی رگوں میں زندگی کا گرم خون گردش کر رہا تھا اپنے کو اس طوفان سے بچا سکیں گے؟ ہماری محبت کی دنیا سڈول، اچھے جسم کی کشش، آنکھیں جنہیں ہم دیکھتے ہی رہ جاتے تھے، باتیں جو ہم چاہتے تھے کہ سنا ہی کریں، دو لپٹے ہوئے سینوں کی باہمی دھڑکن، اس کا کیا ہوگا؟ اور ہمارے خیالوں کی وہ رنگین دنیا، قدامت پرستی کو ٹھوکر لگانے والی، ہر بری چیز سے باغی، حسن

پرست، آسمان سے اس کی نیلاہٹ، پھولوں سے خوشبو، پانی سے روانی، غرض ہر مادہ سے اس کا جوہر کھینچ لینے کے لیے بے چین، وہ اس آگ لگے سنسار میں کتنے دن تک بچے گی؟ کیا یہ ممکن تھا کہ ہم اپنی نجی زندگی کو سماج کے مضطرب، بیاکل جیون سے الگ کرلیں؟

جستجو:

ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کے سلجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعے کو بڑھاتے، آپس میں بحثیں کرکے تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے، اسی نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ہوتا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لامتناہی تحصیلِ علم کی ابتدا تھی!

ایک ادبی گروہ:

ہمارے چھوٹے سے گروہ میں اکثر مصنف بننا چاہتے تھے اور کرتے بھی کیا؟ مزدوری کرنے کی ہم میں اہلیت نہ تھی، کسی قسم کا ہنر ہم نے سیکھا نہ تھا، سامراجی سرکار کی نوکری کے خیال سے گھن آتی تھی، تو پھر باقی کیا رہا؟ کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو۔ ملک راج آنند کا ناول 'اچھوت' چھپ چکا تھا اور 'قلی' چھپنے والا ہی تھا۔ ریجنٹ اسکوائر کی چوتھی منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں وہ (ملک راج آنند) شخص بیٹھا لکھا ہی کرتا، یا پھر اسی کے کمرے میں ہم سب جمع ہوکر باتیں کرتے اور چائے پیتے، یا پھر وہ اپنی کسی معشوقہ سے لڑ جھگڑ کر اپنی کرن کہانی سناتا۔ کبھی اس کی آواز دھیمی پڑ جاتی، بہت اور کبھی وہ زور زور سے ہنستا ہوتا...... ایک شعلہ، روشن، گرم، لرزتا ہوا۔

آکسفورڈ سے کبھی کبھی ڈاکٹر جیوتی گھوش آجاتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا ہم پر بڑا رعب تھا انہوں نے انگریزی ادب میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی جتنی ڈگریاں ممکن تھیں حاصل کرلی تھیں۔

ایک پرانے زمانے کے انگریزی شاعر پر ان کی دو ضخیم کتابیں حال میں ہی چھپی تھیں اور انہوں نے انگلستان میں انگریزی زبان کے ماہروں میں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ یہ ایک ہندوستانی کے لیے کافی بڑی بات تھی۔ باوجود ان باتوں کے ان میں دقیانوسیت نہیں تھی۔ وہ آکسفورڈ میں بنگالی کے لیکچرر تھے اور انہیں بنگالی ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ عام طور پر وہ ادب میں فنی کمزوری کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ہندوستانی ادب کو پرانے تصوفانہ (ویدانتک) بندھوں سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ پرانی ہندوستانی شاعری (ہندی اور بنگالی) کی مخصوص بچار دھارا یعنی مذہبی عقیدت مندی میں غلو کے وہ شدید مخالف تھے۔

بنگھ سے مجھے آنند نے ملایا۔ یہ اس زمانے میں لارنس اور جوائس کے طرزوں کو ملا کر ایک ناول انگریزی میں لکھ رہے تھے۔ بڑی عسرت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ خدا معلوم کس طرح زندہ رہتے تھے۔ انگریزی خوب اچھی جانتے تھے، سوشلسٹ تو شاید تھے لیکن مارکسیت سے بہت اختلاف رکھتے تھے، ہم تو ان کو مثالی (آئیڈیلسٹ) سمجھتے تھے، لیکن وہ خود کہتے تھے کہ وہ اپنے کو کسی سسٹم سے باندھنا نہیں چاہتے۔ بہر حال ان سے بھی خوب بحثیں رہیں۔ ہم سب امید لگائے تھے کہ ان کی کتاب جلد چھپے تا کہ وہ بھی باقاعدہ مصنفین کی صف میں جگہ پائیں۔ کچھ دن بعد ان کا ناول چھپا اور اس کے بعد انہوں نے گوتم بدھ پر ایک موٹی کتاب انگریزی میں شائع کی۔

رالف فاکس:

انگریزوں میں یوں تو ہم بہتوں سے ملتے جلتے رہتے، لیکن ان میں سے ایک شخص قابلِ ذکر ہے 'رالف فاکس' گو ہم سے سن میں آٹھ دس سال بڑا رہا ہوگا۔ لیکن وہ ہم میں اس طرح گھل مل جاتا کہ نسل، عمر، زبان کا امتیاز مٹ جاتا اور یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مشہور اور مستند انگریزی مصنف ہے اور ہم صرف بننے کے آرزومند! ایک دن میں نے اسے شام کے کھانے پر اپنے کمرے میں مدعو کیا تھا، خاص طور پر ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے بارے میں باتیں کرنے کے لیے۔ میرے ایک بنگالی دوست نے کھچڑی اور پلاؤ کی قسم کی ایک درمیانی چیز پکائی تھی۔ فاکس نے بڑے شوق سے کھایا، پھر دیر تک اس نے اپنے ہندوستان آنے کے منصوبوں کا ذکر کیا۔ ادبی بات

چیت کے سلسلے میں اس نے بار بار یہی کہا کہ ہمیں ترقی پسندی کے جوش میں تنگ نظری اور تعصب سے بچنا ضروری ہے۔ ہمارے ایک بنگالی ساتھی نے رابندر ناتھ ٹیگور پر اعتراض کرتے ہوئے ٹیگور کو ہندوستان کے سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ کہہ کر رجعت پسند قرار دیا تھا۔ فاکس اس پر بہت برہم ہوا۔ اس نے کہا کہ اس قسم کی باتیں کرنا اصل میں مارکسیت کا خاکہ اڑانا ہے۔ کسی شاعر یا مصنف کو اتنی آسانی کے ساتھ ایک خاص تخیلی خانے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فاکس اپنی کتاب 'چنگیز خاں' لکھ رہا تھا۔ فاکس کے بھورے بال، نیلی آنکھیں، خاص طور پر اس کی شگفتہ، بے تکلف ہستی کی یاد، دوسری طرف اسپین میں دو برس بعد اس کی موت، ایک آزادی کے سپاہی کی حیثیت سے میدانِ جنگ میں، سرمایہ دارانہ رجعت پسندی سے لڑتے ہوئے، یہ مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ کبھی نہیں۔

انڈین پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن:

ایک دن کئی آدمیوں کے مشورے سے میرے کمرے میں باقاعدہ میٹنگ ہوئی۔ جس میں چھ سات آدمی سے زیادہ نہ تھے اور ہم نے 'انڈین پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن' کو 'آرگنا' کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ پہلے تو کام بہت ڈھیلا رہا لیکن جلد ہی سب کی دلچسپی بڑھنے لگی اور یہ طے ہوا کہ وہ اپنے مقاصد کا مختصر اظہار ایک مینیفسٹو (اعلان) کے ذریعے کرنا چاہیے۔ چار یا پانچ آدمیوں کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ آنند نے پہلا مسودہ تیار کیا، وہ لمبا بہت تھا، پھر یہ کام ڈاکٹر گھوش کے سپرد ہوا، انہوں نے اپنا مسودہ کمیٹی کے سامنے پیش کیا، پھر میرے ذمے یہ کام کیا گیا کہ آنند اور گھوش کے مسودوں میں ترمیمیں کر کے (جن کے بارے میں کئی کئی بار گھنٹوں بحثیں کی گئی تھیں) آخری مسودہ کمیٹی کے سامنے پیش کروں۔ بڑے جھگڑے بکھیڑے اور ایک ایک جملے اور لفظ پر لمبی بحثوں کے بعد آخر کمیٹی نے مسودہ منظور کیا۔ ہم نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی پہلی باقاعدہ میٹنگ منعقد کی۔ اس درمیان میں لندن، آکسفورڈ اور کیمبرج کے ادبی ذوق رکھنے والے ہندوستانیوں میں ہم نے کافی پروپیگنڈا کر لیا تھا۔ لندن کا ایک چینی ریستوران والا ہم پر خاص طور پر مہربان تھا وہ اپنے غریب پرور ریستوران کا ایک پیچھے کا کمرہ ہمیں اپنی میٹنگوں کے لیے مفت دے دیا کرتا تھا۔ اس

چھوٹے سے بے ہوا تہہ خانے کے کمرے میں چالیس پچاس آدمی ٹھس سکتے تھے۔ وہیں ہماری پہلی بار باضابطہ میٹنگ ہوئی۔ ملک راج آنند پریذیڈنٹ چنے گئے اور پھر ہم نے کمیٹی کی طرف سے مینیفسٹو کا مسودہ پیش کیا، جو چند مزید ترمیموں کے بعد ایسوسی ایشن نے منظور کیا۔ ہم تین چار جو ایسوسی ایشن کی ایگزیکٹو میں چنے گئے اس میٹنگ سے بہت مطمئن تھے، لندن میں تیس پینتیس ہندوستانیوں کو اکٹھا کر لینا ہی بڑی بات تھی! دوسرے یہ کہ مینیفسٹو کا مرتب ہو جانا ہمارے اپنے خیالات کو جو ابھی تک منتشر سے تھے، منضبط کرتا تھا۔ ترقی پسند مصنفین کا مقصد کیا ہے، انھیں کس طرح کام کرنا چاہیے۔ ان سوالوں کا جواب ابتدائی شکل میں ہمارے اعلان میں موجود تھا اور یہ بڑی بات تھی۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ابھی تک (۱۹۴۰ء) یہ بحثیں ہمارے رسالوں میں جاری ہیں، جیسا کہ ہونا بھی چاہیے، تو اس اعلان کی جامعیت کی قدر اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

پی۔ڈبلیو۔اے کے جلسے:

اب پی۔ڈبلیو۔اے (جس نام سے ہم اپنی انجمن کو لندن میں پکارتے تھے) کے جلسے مہینے میں ایک یا دو مرتبہ لندن میں ہونے لگے۔ ایک مرتبہ کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی نے رومن لپی کی حمایت میں ہماری انجمن میں تقریر کی۔ ہم لوگ خود بھی رومن لپی کو اپنانے کے قائل تھے، ان کی سائنٹفک تقریر کے بعد تو بالکل ہی اس اصلاح کے موافق ہو گئے۔ تمام ہندوستان میں ایک رسم الخط کا خیال بہت دلکش تھا اور لندن میں تعصب اور جذبات کی وہ آگ جو ہندوستان میں اس مسئلے کے چھیڑنے سے دہک اٹھتی ہے، بالکل نہ تھی۔ ہندی اردو بولنے والے، مدراسی، بنگالی اور گجراتی غرض کہ ہندوستان کے ہر حصے کے نوجوان وہاں موجود تھے اور سب نے ایک رائے ہو کر یہ طے کر لیا کہ ترقی پسند مصنفین کو رومن لپی (رسم الخط) کا پروپیگنڈا کرنا چاہیے۔

ایک جلسے میں ایک بنگالی ممبر نے قاضی نذر الاسلام کی شاعری پر ایک مضمون پڑھا اور اس کی انقلابی اہمیت بتائی۔ یہ مضمون انگریزی میں تھا ہمارا دستور یہ تھا کہ ہر جلسے میں مضمون یا افسانہ پڑھے جانے کے بعد اس پر بحث اور تنقید کرتے تھے۔ بعد کے جلسوں میں ایک بار آنند نے اپنا ایک افسانہ 'دی ٹرورسٹ' سنایا جو بعد کو امریکہ کے رسالے 'ایشیا' میں شائع ہوا۔ پھر میں نے اپنا

اردو کا (۱۹۳۵ء) کا ایک ایکٹ کا ڈرامہ 'بیمار' پڑھا۔ 'انگارے' کی کہانیوں کے بعد یہ میری پہلی تصنیف تھی۔ ہماری انجمن میں اردوداں کم تھے، اس لیے ڈاکٹر تاثیر (جو اس زمانے میں کیمبرج میں پڑھتے تھے) اور سنگھ اور آنند کی تنقید نے مجھے کافی خوش کیا لیکن میرے دل میں چور تھا، بھلا چند افسانے اور ایک چھوٹے سے ڈرامے کو لکھ کر 'مصنف' بن بیٹھنا، یہ بھی کوئی بات تھی! 'انگارے' کی شہرت لندن کے ہندوستانیوں تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے اس کی تو خوشی تھی کہ ادبی میدان میں میری ابتدائی کوشش نے قلاعوذیوں کی داڑھیاں جھلسادی تھیں، اس سے بھی اطمینان تھا کہ عبدالحق کے 'اردو' میں ان افسانوں کو اچھا کہا گیا تھا، لیکن اپنی ادبی قابلیت کے بارے میں مجھے کسی قسم کا مغالطہ نہیں تھا! اس ادبی ہلچل میں، اپنے ضمیر کی سالمیت کو بچانے کے لیے میں نے 'لندن کی ایک رات' لکھنا شروع کردیا۔

یہ تو ہم شروع ہی سے سمجھتے تھے کہ لندن میں رہ کر ہندوستانی ادب پر نہ اثر ڈالا جاسکتا ہے اور نہ کوئی اعلیٰ قسم کا تخلیقی کام ہوسکتا ہے۔ لندن کی انجمن کے قائم ہونے سے جہاں بہت فائدے ہوئے وہاں یہ احساس بھی پکا ہوگیا۔ دس پانچ جلاوطن ہندوستانی سوا اس کے کہ آپس میں مل جل کر طرح طرح کے منصوبے باندھیں اور یورپی کلچر سے اثر قبول کرکے یتیم قسم کا ایک ادب پیدا کریں، زیادہ کچھ نہیں کرسکتے۔ سب سے بڑی بات جو ہم نے اس زمانے میں یورپ میں سیکھی وہ یہی تھی کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک اسی وقت بارآور ہوسکتی ہے جب ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کی ترویج ہو اور جب ہندوستان کے ادیب اس تحریک کی ضرورت کو سمجھ کر اس کے مقاصد کو عملی جامہ پہنائیں۔ لندن کی انجمن کا بہترین کام یہ ہوسکتا ہے کہ وہ مغرب کی ترقی پسند ادبی تحریکوں سے ہمارا رشتہ جوڑے، ہندوستانی ادب کی مغرب میں نمائندگی کرے اور مغربی ادیبوں کی تخلیق اور ان جدید معاشرتی مسائل کی ہندوستان میں ترجمانی کرے جو مغرب میں ادب پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں۔

ورلڈ کانگریس:

ٹھیک اسی وقت فرانس میں چند ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے ہمیں اپنے ارادوں میں بڑی

مددملی۔ میں نے شروع میں ذکر کیا کہ فرانس میں فاشزم کے خلاف متحدہ محاذ کی تحریک ۱۹۳۳ء سے شروع ہو چکی تھی اور درمیانی طبقے بھی مزدوروں کے متحدہ محاذ کے اردگرد کھنچے چلے آرہے تھے۔ مشہور فرانسیسی ادیب ہنری باربس کی لگاتار کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیرس میں جولائی ۱۹۳۵ء میں ایک 'ورلڈ کانگریس آف رائٹرس فار دی ڈیفنس آف کلچر' یا 'بین الاقوامی مصنفین کی کانگریس برائے تحفظ کلچر' ہونا قرار پائی۔ اس کانفرنس کو مدعو کرنے والوں میں میکسم گورکی، رومین رولاں، آندرے مالرو، ٹامس مان، والڈو فرینک جیسی شہرۂ آفاق ہستیاں تھیں، یہ اجتماع جو پیرس کے ایک مشہور ہال 'بال بولئے' میں ہوا دنیائے ادب میں بہت بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب قریب قریب دنیا کی ہر مہذب قوم کے ادیب باہم صلاح و مشورے کے لیے ایک مقام پر جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ تہذیب و تمدن کو رجعت پسندی اور تنزل کی اٹھتی ہوئی لہر سے بچانے کے لیے ان کو انفرادیت کو خیرباد کہہ کر خود اپنی جماعت کو منظم کرنا ضروری ہے۔ صرف یہی ایک مؤثر طریقہ ہے جس کے ذریعے سے وہ ترقی و فلاح کی قوتوں کی مدد کر سکتے ہیں، اپنی تخلیقی صلاحیت کو افزائش و نشو و نما کا پورا پورا موقع دے سکتے ہیں اور اس طرح جماعتی حیثیت سے اپنی ہستی کو ایک انقلاب انگیز عہد میں فنا ہو جانے سے بچا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اتنی بڑی کانفرنس میں مختلف خیال اور عقیدے کے ادیب جمع تھے، لیکن ایک چیز کے بارے میں وہ سب متفق تھے وہ یہ تھی کہ ادیبوں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادیٔ خیال و رائے کے حق کے تحفظ کی کوشش کرنا چاہیے۔ فاشزم یا سامراجی قوتیں جہاں بھی ادیبوں پر جابرانہ پابندیاں عائد کریں یا ان کے خیالات کی بنا پر ان پر مظالم کریں، اس کے خلاف پُرزور احتجاج کرنا چاہیے۔ دوسری چیز جو اس کانفرنس میں سب محسوس کرتے تھے یہ تھی کہ ادیب اپنے حقوق کا بہترین تحفظ اسی حالت میں کر سکتے ہیں جب وہ عوام کی آزادی کے 'متحدہ محاذ' کا جز بن کر، محنت کش طبقوں کی پشت پناہی حاصل کریں۔ فرانس اور چین کے مصنفین کا تجربہ اسی خیال کے ٹھیک ہونے کا ثبوت تھا۔ چین کے بہترین لکھنے والے، شاعر، ناولسٹ، ڈرامہ نگار، ماہر تعلیم و فلسفی وغیرہ ایسے وقت جب کہ چین، جاپانی سامراج کے خلاف، بڑی سخت لڑائی لڑ رہا ہے، اپنی ساری لیاقت کو اپنے ملک کی جنگ آزادی کو کامیاب بنانے میں صرف کر رہے ہیں۔ 'چینی

مصنفین کی انجمن' سامراج دشمن متحدہ محاذ کا ایک اہم حصہ ہے جو چینی عوام کی تمام لطیف ادبی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے چینی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت جاپان کے خلاف جنگ کے اصلی روپ رنگ عوام کے سامنے رکھ کر ان کو نفسیاتی طور سے جنگ آزادی کے لیے تیار کرتی ہے۔ فرانس کے بڑے بڑے ماہرینِ سائنس، فلسفی شاعر، ناول نگار اور دوسرے ادیبوں نے بھی ہنری باربس کی رہنمائی میں اپنا ایک ادارہ فاشیت کے خلاف جدوجہد کے لیے قائم کر لیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان صاحبانِ علم و فضل کی انتھک کوششوں اور ان کے عام اثر ہی کا بڑی حد تک نتیجہ تھا کہ فرانس میں درمیانی طبقے بھی مزدوروں کی متحدہ محاذ کی تحریک میں شامل ہوتے جارہے تھے اور وہ پاپولر فرنٹ یا عوامی محاذ قائم ہوتا جارہا تھا جس کی بالآخر وسط ۱۹۳۶ء میں وزارت بن گئی۔ اس کے علاوہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ ادیبوں کی ایک علیحدہ انجمن تھی جس کا اپنا ایک ماہنامہ بھی تھا۔

اس بین الاقوامی کانفرنس کے اجلاس اور اس کی کمیٹیاں پیرس میں کئی دن تک منعقد ہوتی رہیں۔ کھلے اجلاسوں میں ہزارہا آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا اور ہال جس میں داخلہ ٹکٹ سے تھا، تل رکھنے کی جگہ نہ ہوتی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مزدور جماعت کے لوگ یہاں بکثرت تھے۔ وہ گویا اپنی موجودگی سے ادیبوں اور عوام الناس کے اس نئے سرے سے قائم کیے ہوئے رشتے کا بین ثبوت دے رہے تھے۔ جس کے لیے خاص طور پر یہ کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔ ادیبوں کی جماعت موجودہ سرمایہ دارانہ دور میں عوام سے الگ ہو گئی ہے، وہ ان سے کچھ خائف بھی ہے، اور اس کے دل میں ان کے لیے کچھ حقارت بھی پوشیدہ ہے۔ بہرحال وہ ان سے غیر مانوس ہے۔ جدید ادب کے ایک بڑے حصے کے روحانی طور سے مفلوج ہونے کی وجہ ادیبوں کی زندگی کے سرچشمے یعنی محنت کش طبقوں کی حیات سے دوری ہے۔ سوویت روس کے مصنفین کے وفد کا اس کانفرنس میں بڑا شاندار خیر مقدم ہوا جس کی وجہ یہی تھی کہ اس جدید اشتراکی معاشرت میں مصنف اور اس کی پبلک کے درمیان کا فاصلہ اب باقی نہیں رہ گیا۔ اشتراکی مصنف، عوام کا ہے اور عوام اس کے ہیں۔ ان مصنفوں میں اتحاد اشتراکیہ سوویت کی مختلف قوموں کے نمائندے تھے، جن میں تاتار، ازبک اور تاجک مصنف تھے۔
(تاجکستان کی سوشلسٹ ریاست کشمیر کے شمال میں ہے اور وہاں کے لوگ فارسی بولتے ہیں)

ہماری نمائندگی:

افسوس ہے کہ جہاں اکثر شرقی اقوام کے نمائندے موجود تھے چینی، جاپانی، ایرانی، ترک، عرب، تاتار وغیرہ وہاں اس تاریخی موقع پر ہندوستان کے مصنفین کی نمائندگی کے لیے صرف جناب صوفہ واڈیا صاحب، بمبئی کی ایک پارسی خاتون تھیں، گویا یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستان وہاں موجود نہ تھا کیونکہ ان خاتون کا نہ ہونا ان کے ہونے سے بہتر ہوتا! اور رہ گئے ہم لوگ تو ہم مٹھی بھر نوجوان ہرگز اس مغالطے میں نہیں تھے کہ ہندوستان کے عظیم الشان ادب کی ہم اس اجتماع میں نمائندگی کر سکتے تھے۔ علاوہ بریں ہم کو ہندوستان کی کسی ادبی جماعت کی طرف سے اس طرح کی نمائندگی کا حق بھی نہیں دیا گیا تھا۔

ترقی پسند ادبی تحریک کا عالمی مرکز:

اس کانفرنس کے ہو جانے کے بعد ساری دنیا کی ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک بین الاقوامی مرکز پیرس میں قائم ہو گیا، جس کے کارکن اس کانفرنس کے نمائندوں نے ہی چنے۔ دنیا کی مختلف قوموں میں ترقی پسند ادیبوں کی تحریک اب صرف تخیلی طور سے نہیں بلکہ تنظیمی طور سے بھی ایک رشتے میں منسلک ہونے لگی۔ بین الاقوامی کلچر کی تخلیق میں یہ ایک بڑا قدم لیا گیا تھا۔ ہماری لندن کی ترقی پسند انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ باقاعدہ اس بین الاقوامی ادبی مرکز سے ملحق ہو جائے اور بعد کو جب ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہو جائے تو پھر اس مرکزی ہندوستانی انجمن کی ایک بیرونی شاخ کی حیثیت سے وہ اس الحاق کو قائم رکھے اور مرکزی انجمن کی ہدایات کے مطابق بیرونجات میں ہندوستانی ادب کی نمائندگی کرے۔

لندن میں تعلیمی سلسلہ ختم:

اس درمیان میں، میں قانونی تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے لندن و انگلستان کو خیر باد کہہ کر کچھ دنوں کے لیے پیرس میں مقیم تھا۔ یہاں میں اپنے دوست شوکت اللہ انصاری کے ساتھ رہتا تھا جو اس زمانے میں پیرس میں ڈاکٹری پڑھتے تھے۔ میرا زیادہ تر وقت 'لندن کی ایک رات' لکھنے میں صرف ہوتا۔

میں چاہتا تھا کہ اس ناول کو ختم کرلوں پھر وطن واپس آؤں کیونکہ یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان پہنچ کر شاید فرصت نہ ملے۔

پیرس میں:

موسم سرما کے آخری دن تھے جب میں پیرس آیا۔ کشادہ سڑکوں کی پٹریوں پر لگے ہوئے چار رویہ اور شش رویہ پیڑوں کی پتیاں ہری بھری تھیں۔ دریائے سین اپنی پوری بہار پر تھا اس کے کنارے پرانی کتب فروشوں اور دوسری سیکنڈ ہینڈ چیزوں کی دکانوں پر لوگ کھڑے کتابوں کو الٹتے پلٹتے رہتے، آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے۔ دریا کے داہنے کنارے پر 'نوتر دام' کے مشہور گرجا کے دو بڑے بڑے چوکور مینارے اوپر اٹھے ہوئے دکھائی دیتے اور اس بلندی سے اس پر نصب کیے ہوئے عجیب و غریب بھیانک شکل کے شیاطین کے بُت، نیچے چلتے پھرتی ہوئی انسانوں کی دنیا کا مذاق اُڑاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہاں سے کوئی دو میل کے فاصلے پر اسی کنارے لُوور کے محل کا منظر ہے اور پھر اسی سے ملا ہوا توئی لری کا باغ۔ پیرس کے اس حصے کا چپہ چپہ تاریخی ہے اور دنیا کے بہترین آرٹ کے خزانوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ گرمیوں کی لمبی شام کو لوور کی سیاہ دیواریں، ان کے گرد کے سرسبز درخت اور محل کے دونوں بازوں کے بیچ فصلی پھولوں کے بڑے بڑے خوشنما تختے، جا بجا فرانس کے مشاہیر کے مجسمے یا پھر یونانی دیوتاؤں اور دیویوں کے قد آدم بُت، درمیانی سڑک پر موٹروں کا ایک بہتا ہوا دریا، توئی لری باغ کے بڑے بڑے خوبصورت پیڑ، بینچوں پر نوجوان عاشق اور ان سے لگی بیٹھی ان کی محبوبہ، ایک وسیع حوض اور اس کے بیچ میں والہانہ اُچھلتا ہوا فوارہ، اس کے کنارے بچے کھلونے کی ناؤ چلاتے ہوئے۔ شام کا اندھیرا بڑھتا جاتا ہے، ہم باغ کی ایک بلند سطح سے پچھم کی طرف دیکھتے ہیں، ایک بڑا چوکور میدان جس کے اردگرد کالی کالی کول تار لگی چمکتی ہوئی سڑکیں، بیچ و بیچ ایک پتھر کی ٹھوس گاؤ دم لاٹ، مصری، جس پر قدیم مصری حروف کندہ ہیں، یہ بالکل اس مقام پر نصب کی گئی ہے جہاں انقلاب کے وقت وہ گلوٹین (سولی) تھی جس پر لوئی سیزدھم، اس کی ملکہ ماری انتوانت اور دوسرے سینکڑوں انقلاب دشمن امرا کے سر قلم ہوئے تھے۔ اس کے ہر چہار طرف حوض اور فوارے اور تیز

روشنیوں کا ہجوم، درمیان سے نکلی ہوئی دنیا کی وہ مشہور سڑک شانزاپلیزے، جس کے معنی ہیں خطہ ہائے بہشت، بہت چوڑی اپنے دونوں طرف درختوں کی قطاروں کا ایک جنگل لیے ہوئے اور پھر اس کے آخر میں توئی لری سے صاف نظر آتا ہوا، کوئی دو میل کے فاصلے پر سڑک کی دوسری حد پر آرک وتریومف، یادرفتح، بلند وارفع، کافی رعب دار لیکن خوبصورت بھی، نپولین کا تعمیر کیا ہوا، ٹھیک اسی جگہ، حدِ نظر پر ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی سے فضا رنگین ہے۔ اتنی بہت سی تیز تیز چلتی ہوئی موٹروں کے باوجود بھی یہاں اس وقت کچھ سکون سا ہو جاتا ہے۔ انسانیت اور قدرت کی ہم آہنگی ایک خاموش، دردانگیز مسرت یہاں، ہم زیادہ دیر رُک نہیں سکتے، کیونکہ شام کا اندھیرا بڑھنے پر توئی لری باغ بند ہو جاتا ہے اس کے کنارے سے باغ کا محافظ پوں پوں بھونپو بجاتا ہوا چلا آ رہا ہے اور باغ میں بیٹھے ہوئے عشاق کے جوڑے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بادل نخواستہ باہر نکل رہے ہیں۔

یہ وہ شہر تھا جسے پیرس والے 'ملکہ جہاں' کہتے تھے، جسے شاید میں آخری بار دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا۔ یہی وہ بھی دن تھے جب ہماری نوخیز امیدوں کے چراغ کو فرانسیسی مزدوروں اور عوام الناس کے متحدہ محاذ کی تحریک نے روشن کر دیا تھا۔ ہم سمجھنے لگے تھے کہ یہ شعلہ اب دن بدن تیز ہوتا جائے گا، یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی اس کی تمازت پہنچے گی، رفتہ رفتہ انقلاب کی آگ بھڑک اٹھے گی اور آخر میں ہماری نئی دنیا، نئے آسمان، نئی زمین بلکہ نئے انسان کی تعمیر ہوگی۔ ہم اپنے راستے کو یہ تو ضرور سمجھتے تھے کہ بہت مشکل ہوگا، اتنا پیچیدہ ہوگا جیسا کہ اب دوسری عالمگیر جنگ کے چھڑ جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے، یہ اس بہار کی حرارت انگیز فضا میں وہم وگمان تک نہ تھا!

جدید ادبی تحریک کے مرکز میں قیام کو میں نے اپنی تہذیب دماغ کے لیے مناسب سمجھا۔ افسوس کہ بین الاقوامی کانفرنس کے چند ہی دنوں بعد باربس کا انتقال ہو گیا، اس لیے اس عظیم الشان ہستی سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا۔ کئی سال پہلے میں اس کی تقریر سن چکا تھا، لیکن بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ باربس کے جنازے کے ساتھ کئی لاکھ آدمیوں کا ہجوم تھا اور پیرس کے اطراف میں رہنے والے تمام مزدور اس ادیب رہنما کے آخری درشن کے لیے شہر میں اُمنڈ آئے تھے۔ شاید اس وقت تک دنیا میں کسی ادیب کا جنازہ اتنی شان سے نہ نکلا ہو، اتنی عقیدت مندی، خلوص، محبت، غم کا اظہار عوام الناس نے شاید ہی کسی دوسرے مصنف کے ساتھ کیا ہو۔ ان کے لیے یہ دبلا پتلا، لمبا سا

زرد رو شخص جس کے کندھے کچھ جھکے ہوئے تھے اور جس نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران لڑائی کی ٹھنڈی اور نم خندقوں سے تپ دق کا تحفہ پایا تھا اور جس نے اس سرمایہ دارانہ بہیمت کے خلاف اپنی پُرجوش آواز اپنے ناول 'آگ' میں بلند کی تھی، صرف ایک پُرزور مصنف نہ تھا، وہ نشان تھا انقلابی انسانیت کی جدوجہد کا، مستقبل کی درخشاں امیدوں کا۔

پیرس کی ادبی دنیا:

اس زمانے میں پیرس کی ادبی دنیا میں آندرے جید کے قلبِ ماہیت نے ایک کہرام مچا دیا تھا۔ آندرے جید کا رتبہ جدید فرانسیسی ادب میں بہت بڑا ہے، حالانکہ بیرونجات میں جدید فرانسیسی ناول نگاروں میں رومیں رولان، اناطول فرانس، مارسل پُروست، جوئی کے لوگ گنے جاتے ہیں، لیکن فرانسیسی ادبی نقادوں کے نزدیک جید کا درجہ ان سے کچھ نیچا نہیں، بلکہ اوپر لکھے ہوئے تینوں ادیب (جن میں سے صرف رولان اب زندہ ہیں) جدید ترین نہیں سمجھے جاتے تھے، درانحالیکہ آندرے جید کی مقبولیت ۱۹۳۵ء میں دن بدن ترقی پر تھی۔ جید کی بین الاقوامی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت سے ہی فرانس کے قدامت پسند نقادوں کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی کہ وہ شخص جس کے فلسفہ زندگی کے بے عنوانیوں اور شرارتوں سے وہ محظوظ ہوتے تھے اور جس کے طرزِ تحریر کی نفاست سے ان کے مضطرب ادبی ضمیر کو تسکین ملتی تھی، یکایک میلے کچیلے مزدوروں کے مجمعے میں جا کر تقریر کرے اور اپنی ادبی خدمات کو عوام الناس کے لیے وقف کر دینے کا وعدہ کرے۔ انہوں نے کہنا شروع کیا کہ جس طرح آندرے جید کا فلسفہ گناہ کوئی سنجیدہ فلسفہ زندگی نہیں، اسی طرح اب جید کا فرانس کی عوامی تحریک کے ساتھ ملحق ہونا بھی ایک غیر سنجیدہ فعل ہے لیکن جب جید کی کتاب 'لے نوول نوری تور، یا غذائے نَو' کانفرنس کے کچھ ہی دنوں بعد چھپی پھر تو جید کے پرانے دوستوں کے غصے کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس کتاب میں جید نے، جو کہ ہمیشہ سے مروجہ اخلاق کے خلاف انفرادی بغاوت کا سبق دیتا آیا تھا اور جو ارتکابِ گناہ کو انسان کی روحانی تکمیل اور نجات کے لیے ضروری بتاتا تھا، اشتراکیت کے نصب العین کو قبول کر کے کہا کہ انفرادیت کا بلند ترین درجہ اشتراکیت ہے۔

جیدکی کتاب شائع ہونے کے کچھ دنوں بعد مجھے ایک باراس کا موقع ملا کہ میں جید کے جدید ادبی رجحان پر ایک مشہور فرانسیسی ادیب پروفیسر آلبیر سارو کی تقریر سنوں۔ جلسہ فرانسیسی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کے دفتر کے چھوٹے سے ہال میں ہوا تھا۔ اسی جگہ بین الاقوامی ادبی مرکز کا بھی آفس تھا۔ ہال میں مشکل سے دوسو آدمی سما سکتے ہوں گے لیکن اس دن ڈھائی تین سو آدمی گھس پل کر اسی جگہ جمع ہو گئے تھے۔ کرسیاں سب بھر گئیں تھیں اور بہت سے لوگ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے تھے پروفیسر سارو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جید کا اشتراکیت کی طرف جھکنا ایک قدرتی امر تھا، اس لیے کہ جس شخص کی ساری ادبی کاوش انسان کو خود پرستی اور گناہ کے وسیلے سے مکتی کی راہ دکھانے پر منحصر ہو، وہ اگر ایماندار ہے تو موجودہ سرمایہ دارانہ سماج میں بھی انفرادیت کے کچلے جانے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے گا اور اس طرح لازماً اشتراکیت کے فلسفے کو صحیح تسلیم کرے گا۔ ایک مشہور قدامت پسند نقاد بھی اس جلسے میں موجود تھے، سارو کی تقریر کے بعد جب عام بحث شروع ہوئی تو انہوں نے سارو سے اختلاف رائے کا اظہار کیا۔ ان کے نزدیک جید کا جدید رجحان اس کے آرٹ کے انحطاط کی نشانی تھا کیونکہ جید اب ایک آرٹسٹ کی حیثیت کو چھوڑ کر اپنے فن میں سیاسی جانبداری گھسا رہے تھے اور بقول ان کے ایسا کرنا آرٹ کا گلا گھونٹنا ہے۔ بلند پایہ فرانسیسی شاعر اور ناول نگار آراگون بھی اس جلسے میں شریک تھا، اس نے بھی بحث میں حصہ لیا اس نے جید کے نئے رجحان کو فرانسیسی ادب اور فرانسیسی پاپولر فرنٹ (عوام الناس کا متحدہ محاذ) دونوں کے لیے مبارک شگون سمجھا لیکن ساتھ ہی اس نے کہا کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جید اگر آج اشتراکیت کے حامی ہیں تو اس کی وجہ زیادہ تر جذباتی ہے۔ وہ مارکسی اشتراکیت سے دور ہیں جو علمی ہے اور جس کی بنیاد ٹھوس ہے۔ اس نے کہا کہ ایک آرٹسٹ کے لیے سوشلزم کی طرف اس طریقے سے آنا ایک قدرتی امر ہے، لیکن اگر وہ جلد ہی اشتراکیت کی عقلی اور علمی بنیادیں مضبوط نہ کرے تو کسی بھی پیچیدہ اور نازک تاریخی موقعے پر وہ رجعت پسندی کی دلدل میں دوبارہ پھنس سکتا ہے۔ افسوس کہ آراگون کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی اور آندرے جید ایک سال بعد ترقی پسندوں کی صف سے علیحدہ ہو کر خود پرستی کی کال کوٹھری میں پھر بند ہو گئے۔

دادا ازم اور آراگون:

اسی سلسلے میں آراگون کا بھی تذکرہ کردوں۔ گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران، زندگی کا توازن درہم برہم ہوگیا تھا اس کا اثر ادب اور آرٹ پر بھی پڑا۔ ایک گروہ ادیبوں اور آرٹسٹ کا یورپ میں ایسا پیدا ہوا جس نے پرانے طرز، طریقوں، جذبات، عقلیت غرض ہر چیز کو ٹھوکر مار کر اپنے آرٹ اور ادب کو مہمیت کی حد تک پہنچایا۔ ان کی شاعری نہ کسی کی سمجھ میں آتی تھی اور نہ ان کی بنائی ہوئی تصویروں اور مجسموں سے ہی کوئی معنی نکلتے تھے۔ یہ تحریک دادا کے نام سے مشہور تھی اور پیرس اس کا مرکز تھا۔ آراگون، دادا گروہ کا ایک نوجوان شاعر تھا لیکن جلد ہی اس بغاوت محض و مطلق سے اس نے اپنا دامن چھڑا لیا اور فرانس کی جدید شاعری کی پہلی صف میں آپنے لیئے جگہ پیدا کرلی۔ سرزمینِ سوویت کا بھی اس نے سفر کیا اور وہاں اپنی آنکھوں سے اشتراکی سماج کی تعمیر کو دیکھا نئے بنے ہوئے بڑے بڑے پانی کے بند جن سے بجلی پیدا کی جاتی ہے، نئے نئے کارخانے، مشین سے کھیتی، حکمراں مزدور اور کسان، علم وفن کی روزافزوں ترقی ان چیزوں کے مظاہرے میں آراگون کو بلند ترین رومانیت نظر آئی اور اس نے محسوس کیا کہ یہی وہ ذرائع ہیں جو روحِ انسانیت کو مردہ مادّے کی غلامی سے سبکدوش کرکے، آزادی کی فضا میں بالیدگی کا پورا موقع دیں گے۔ سوویت کے بارے میں اس کی نظمیں جو فرانس بھر میں مشہور ہوئیں حتیٰ کہ ان لوگوں نے بھی ان نظموں کی تعریف کی جو اشتراکی نہ تھے، ان کے خلوص، جدتِ ادا، جوش کا اعتراف نہ کرنا بہت مشکل تھا۔ میں نے اپنے پیرس کے قیام کے موقعے پر آراگون کو فرانسیسی مصنفین واہلِ علم کی ترقی پسند تحریک میں پیش پیش دیکھا۔ یہ میانہ قد، چھریرے بدن کا خوبصورت شاعر اور ناول نگار نہایت عمدہ مقرر بھی تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس میں انتظامی قابلیت بھی بہت تھی۔ فرانسیسی ادیبوں کی انجمن کا وہ سیکریٹری تھا اور بین الاقوامی ادیبوں کی انجمن کے نئے قائم شدہ دفتر میں بھی وہ کام کرتا تھا۔ فرانسیسی مزدور جماعت میں وہ بہت ہردلعزیز تھا اور پیرس کے سب سے زیادہ نفاست پسند، نازک مزاج اور مخصوص ترین ادبی حلقوں میں بھی اس کے لیے جگہ محفوظ تھی۔ ایک باہمی فرانسیسی دوست نے میرا تعارف آراگون سے کرایا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ آراگون مجھ سے دیر تک ہندوستانی ادب کے بارے میں پوچھتا رہا۔ میں نے اس سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا تذکرہ کیا اور کہا کہ

ہمارا ارادہ ہے کہ ہندوستان میں بھی اس تحریک کو شروع کیا جائے۔ پھر میں نے آراگون سے پوچھا کہ فرانسیسی اور بین الاقوامی ادیبوں کی انجمن کے بارے میں اس کے تنظیمی تجربات کیا ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے خاص فرانسیسی طرز سے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور ہنس کر جواب دیا "یہ نہ پوچھیے! ادیبوں کی تنظیم سے بڑھ کر مشکل دنیا میں اور کسی جماعت کی تنظیم نہیں۔ ہر ادیب اپنا راستہ الگ نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم ہمیں کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ زمانے کے حالات خود ادیبوں کو اپنے آرٹ کی حفاظت اور ترقی کے لیے تنظیم کرنے پر مجبور کر رہے ہیں"۔ جب میں آراگون سے مل کر اپنی قیام گاہ پر جانے کے لیے باہر نکلا تو شام کا اندھیرا چھا گیا تھا، سڑکوں پر روشنیاں تیزی سے چمک رہی تھیں۔ میرا مکان کافی دور تھا۔ میں ایک بس پر بیٹھ گیا بس کا راستہ پیرس کے سب سے شاندار بازار کی کشادہ سڑکوں سے ہو کر جو "گراں بولوارڈ" کے نام سے مشہور ہیں۔ لفظ رونق کا مفہوم سمجھنے کے لیے یہاں سے بہتر شاید ہی دنیا میں اور کوئی جگہ ہو۔ فرانسیسیوں نے اپنی دکانوں، قہوہ خانوں، ریستوران، سینما اور تھیٹر کے دروازوں پر روشنی کی فراوانی سے ہر رات شب برات بنا دی تھی اور پھر یہاں پر چہل پہل بھی خوب تھی۔ سڑک کی پٹریوں سے ملے ہوئے قہوہ خانوں میں لوگ بھرے تھے، خوش پوشاک حسین عورتیں ادھر ادھر دکھائی پڑ جاتی تھیں۔ زندگی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ ساتھ ہی مجھے آراگون کے آخری ناول "لے کلوش وبال" یعنی "شہر بازل کے گھنٹے" کی ہیروئن کا خیال آیا۔ میں نے حال میں ہی اس ناول کو پڑھ کر ختم کیا تھا وہ لڑکی بھی فرانس کی تھی، جس کی زندگی محبت کی برکت حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔ اس کے جذبات کی انانیت اور سرمایہ دارانہ معاشرت کی دنائت نے ایک لطیف انسانی روح کو کچل ڈالا اور شاید اس چمک دمک اور طمطراق کے مقابلے میں فرانس کی مقید لیکن زندہ و دلگداز انسانیت کی زیادہ صحیح ترجمانی اسی شخصیت سے ہوتی تھی۔

پیرس سے روانگی:

جب میں پیرس سے وطن لوٹنے کے لیے روانہ ہوا تو پت جھڑ شروع ہو گیا تھا، درختوں کی سبزی غائب ہو چکی تھی، پتیاں پیلی، سرخی مائل، سرخ تھیں، ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں، دھوپ جب نکلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا اس میں سے کسی نے گرمی کھینچ لی ہے اور خالی روشنی چھوڑ دی ہے یورپ

چھوڑنے کے لیے ایسا ہی موسم مناسب ہے، مجھے ایک اطالوی جہاز سے آنا تھا اس لیے جنیوا جانا پڑا۔ یہاں کی فضا میں جنگ کے بادل گھرے ہوئے تھے، اٹلی اور حبش کی لڑائی چھڑ چکی تھی چاروں طرف فوجیں ہی فوجیں دکھائی دیتی تھیں۔ جہاز حالانکہ ہندوستان جارہا تھا لیکن اس پر انگریز اور ہندوستانی قریب قریب ندارد تھے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ شاید انگلستان اور اٹلی میں بھی لڑائی چھڑ جائے اور اس حالت میں ہم برطانوی رعایا ہونے کے ناتے اٹلی کے قیدی ہو جائیں گے۔ برطانوی غلام اور اٹلی کے قیدی میں کچھ زیادہ فرق نہ سمجھ کر میں نے اس خطرے کی زیادہ پرواہ نہ کی اور چونکہ میں پہلے ہی سے اطالوی جہاز کا ٹکٹ خرید چکا تھا، اسی پر سفر کرنا مناسب سمجھا۔

جہاز سنسان تھا۔ بہت سے اطالوی مزدور حبش جانے کے لیے مساوا تک جارہے تھے لیکن وہ ہم سے علیحدہ تھے۔ میں اکیلا اِدھر اُدھر خالی ڈکوں پر ٹہلتا اور زیادہ تر وقت اپنے ناول کی تحریر میں صرف کرتا۔ بحیرۂ روم نیلا اور پُرسکون نہ تھا بلکہ سیاہی مائل سفید ہو رہا تھا اور کافی خشکیں بھی تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ اطالوی مزدوروں میں سے ایک نے سمندر میں کود کر خودکشی کرلی۔ جہاز کچھ دیر کے لیے بیچ سمندر میں رُکا، لیکن اس بدنصیب کی لاش تک کا پتہ نہ چلا۔ آخر اس بے چارے نے حبش جاکر اطالوی سامراج کے لیے سڑک بنانے کے مقابلے میں موت کو کیوں ترجیح دی، یہ سوال بار بار میرے دماغ میں اٹھتا تھا لیکن وہاں اس کا جواب کون دیتا؟ میرے کیبن (کمرے) کے ساتھی فرانس میں افغانی سفارت خانے کے ایک معزز عہدے دار آغا صاحب تھے۔ جہاز میں صرف وہ مجھ سے ہی بات چیت کر سکتے تھے کیونکہ وہ صرف فارسی اور فرانسیسی بول سکتے تھے اور جہاز پر اطالوی یا انگریزی ہی سمجھی جاتی تھی۔ انہیں پیرس چھوڑنے کے غم نے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ جناب کی ایک ہسپانوی معشوقہ اس مرکزِ حسن و مستی میں چھوٹ گئی تھیں اور کابل میں ان کی محترمہ خانم اور ماشاء اللہ دو بچے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کشاکش میں کس کا دماغ سالم رہ سکتا تھا؟ وہ اپنا دکھڑا بار بار مجھے سنا کر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرتے۔ میں اپنا غم کسے سناتا؟

زندگی کا ایک دور ختم ہو چکا تھا اور خاتمہ ہمیشہ اپنے ساتھ اداسی لاتا ہے۔ دوسرا اور زیادہ اہم دور ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ امیدیں، آرزوئیں، ارادے اور منصوبے دل و دماغ میں گردش کر رہے تھے۔

بحرِ عرب میں موسم معتدل تھا اور سمندر پُر سکون۔ رات کو چاروں طرف گھرے ہوئے اندھیرے کے بیچ سمندر میں چاند کے عکس سے دور تک ایک جھلملاتی ہوئی سیمیں سنہری بن جاتی اس وقت صرف جہاز کے پانی کاٹنے کی سرسراہٹ سنائی دیتی یا پھر کبھی کبھی میرے افغان دوست کے گراموفون سے ایک دردانگیز فارسی نالہ بلند ہوتا۔

عاشق نہ شوی کہ عاشقی بدبخت است
گاہے بینی، گہے نہ بینی سخت است

سجاد ظہیر

سرگزشت

میرے والد نے مجھے ۱۹۲۷ء میں انگلستان اس لیے بھیجا تھا کہ میں آئی۔سی۔ایس (انڈین سول سروس) کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں اور سرکاری افسر بنوں، نیز آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کروں اور وہاں سے بی۔اے آنرز کی ڈگری لوں لیکن جب میں کئی سال بعد انگلستان سے واپس لوٹا تو آئی۔سی۔ایس میں نہیں تھا۔ انگلستان پہنچنے کے سال بھر کے اندر میں نے اپنے والد کو لکھ دیا تھا کہ میں آئی۔سی۔ایس بننا نہیں چاہتا۔ تب انہوں نے مجھ سے بیرسٹری پاس کرنے کے لیے کہا۔ کئی سال بعد پڑھ لکھ کر بدلیس سے واپس آیا تو بی۔اے (آکسن) تھا اور بیرسٹر بھی، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی، یعنی کمیونسٹ اور وہ بھی محض نظریاتی طور پر اشتراکی فلسفہ حیات کو صحیح ماننے والا نہیں بلکہ اس کا پورا تہیہ کیے ہوئے کہ مجھے کل وقتی انقلابی کارکن بننا ہے۔ میرے خاندان اور اس کے ماحول کو دیکھتے ہوئے جس میں، میں پیدا ہوا تھا اور جس میں میری زندگی بسر ہو رہی تھی، یہ فیصلہ انقلابی ضرور تھا اور شاید بعض لوگوں کو خیال ہو کہ یہ مشکل تھا، لیکن ایسا نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ میرا خاندان ایک خوشحال خاندان تھا، ہم لوگ لکھنؤ میں جس مکان میں رہتے تھے، وزیر حسن روڈ پر 'وزیر منزل' اس میں تیس چالیس چھوٹے بڑے کمرے، کشادہ دالان اور برآمدے تھے۔ اردگرد ایک بڑا سا باغ، سبز لان، اونچے اونچے اشوک، یوکلپٹس اور مولسری کے درختوں کی قطاریں، گلاب اور دوسرے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ آم کے درختوں پر گرمی اور برسات میں

کونپلیں کوٹی تھیں۔

میرے والد لکھنؤ کے چوٹی کے وکیل تھے۔ بعد کو وہ اودھ چیف کورٹ کے جج ہو گئے۔ مجھ سے پہلے میرے تین بڑے بھائی اور میرے بعد میرے ایک چھوٹے بھائی، سب آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے اور وطن واپس آ کر سب بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ گویا میرے لیے بھی خوشحالی، آرام اور فراغت کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔

لیکن میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا، اکبارگی نہیں بلکہ دھیرے دھیرے، رفتہ رفتہ ہنگامہ خیز اور اچانک طریقے سے نہیں بلکہ جیسے بالکل نارمل اور فطری طریقے سے۔ آج میں اس کے متعلق سوچ سکتا ہوں اور اس تبدیلی کے اسباب ڈھونڈھ سکتا ہوں، لیکن جس زمانے میں اور جس طریقے سے یہ تبدیلی ہوئی، اس وقت جیسے مجھے اس کا احساس نہیں ہوا، خون رگوں میں تیزی سے دوڑتا، لیکن ان کی رفتار نہ دکھائی دیتی ہے نہ سنائی۔

زندگی کے مختلف اور متضاد پیمانے:

انسان کے کردار کی تشکیل کیسے ہوتی ہے؟ اور اس کی زندگی کا رُخ کس طرح متعین ہوتا ہے؟ یہ بے حد پیچیدہ سوال ہے۔ جبلت اور پیدائشی خصلتیں، تعلیم و تربیت، سماجی ماحول، قومی طبقہ داری اور خاندانی روایات و ثقافت، شعور اور تحت الشعور کا عمل اور ردعمل، ہمارے کردار ان سب کا مرکب ہوتے ہیں۔ اس بھول بھلیاں میں کیسے تعین کیا جائے کہ کسی شخص نے زندگی کی ایک خاص راہ کیوں اختیار کی، دوسری کیوں نہیں کی؟ بہرحال اس قسم کا تجزیہ اور تشریح ماہروں کا، بیالوجی، نفسیات، سماجیات اور تعلیم کے ماہروں کا کام ہے۔ عام طور پر ہم انسانوں کو ان کے کردار، افعال اور اعمال اور ان کے نتائج سے جانچتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح سے جانچتے ہیں، خود جانچنے والوں کے پیمانوں، زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر اور نصب العین کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ پیمانے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ نیز یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک واحد تاریخی عہد یا دور میں سماج کے مختلف طبقوں یا گروہوں کے بالکل مختلف بلکہ متضاد پیمانے یا نصب العین ہوں۔

مثال کے طور پر ہم اردو اور فارسی ادب پر ہی نظر ڈالیں تو اس میں صدیوں سے یعنی تقریباً آٹھ

سوسال سے یہ بات نظر آتی ہے کہ احمق، جاہل اور جابر حکمراں، بے ایمان قاضی، محتسب اور شحنہ (کوتوال) ناسمجھ اور بے لوچ ناصح، کوڑھ مغز عالم اور مدرس، ریاکار عابد، اور زاہد کی سخت مذمت کی گئی ہے اور ان کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس پورے گروہ کے نافذ کیے ہوئے قوانین اور ان کے عائد کیے ہوئے اخلاقی اصولوں کو برتنے کی نہیں بلکہ توڑنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ شریعت کی جگہ طریقت، ظاہری علم کی جگہ اندرونی اور باطنی علم، ظاہرداری کی جگہ اصلی سچائی اور بنیادی حقیقت تک پہنچنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ قیصر روم کی مذمت کی گئی اور اعزاز کیا گیا بلکہ پرستش کی گئی تو رومی قانون کے مطابق سولی پر چڑھائے جانے والے عیسیٰ بن مریم کی۔ حسین ابن علی نے خلیفہ وقت یزید ابنِ معاویہ کی بیعت کرنے سے انکار کیا اور وہ 'جرم' کی سزا میں قتل کر دیے گئے، لیکن مسلمان اب بھی شہیدِ کربلا کا سوگ مناتے ہیں۔ منصور حلاج اناالحق کا نعرہ بلند کرنے کی پاداش میں قتل کر دیا گیا، لیکن ہمارے شاعروں کی نظر میں وہی، آج تک سچائی کے لیے جان دینے والوں کی سب سے درخشاں نشانی ہے۔

زندگی کے یہ متضاد اور مخالف پیمانے کیوں اور کیسے بنتے ہیں؟ اور ہم اپنے لیے ان پیمانوں کو کیوں اور کیسے چنتے ہیں؟ کیوں ہم ایک خاص راستہ چلتے ہیں اور دوسرا نہیں؟ سماجی اور انفرادی عمل کے محرکات کیا ہیں؟ اور کیا انسانی تاریخ کی رفتار کا بھی کوئی قانون ہے یا یہ محض اتفاقیہ حادثات کا مجموعہ ہے؟ یا پھر کوئی انجانی، غیبی، الوہی یا شیطانی قوت پردے کے پیچھے تمام تاروں کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹے کٹھ پتلیوں کی طرح سے نچاتی رہتی ہے؟

سیاسی حالات میں گہری اور وسیع تبدیلیاں:

ایک بات صاف اور ظاہر ہے۔ ہر سمجھ دار اور حساس انسان کے سامنے، شاہراہِ حیات پر گزرتے وقت بار بار اور مسلسل ایسے مواقع آتے رہتے ہیں جب اسے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ مختلف اور نو بہ نو مسائل کے پیش آنے پر وہ کون سا راستہ اختیار کرے؟ اکثر یہ راستے واضح نہیں ہوتے یا خود ہم اپنے ماحول، عادات یا تعصبات اور جبلتوں کے زیر اثر جیسے آنکھ بند کیے اور غیر شعوری طور پر زندگی کا سارا سفر طے کر لیتے ہیں اور ہم کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے سامنے ایسے مواقع بھی آئے

تھے جب ہم شعوری طور پر اپنا راستہ خود چن سکتے تھے، لیکن ہم نے اسے اختیار نہیں کیا۔

میں جب اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس عمر میں جب میرا شعور تھوڑا تھوڑا بیدار ہونا شروع ہوا تھا، جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور میری عمر پندرہ سولہ سال کی تھی، تب ہمارے ملک میں آزادی کی ایک بڑی لہر اٹھی، نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک اور حبِّ وطن کی اس لہر نے مقناطیس کی طرح مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔

O

دوسری جنگِ عظیم شروع ہو جانے کے بعد ہمارے ملک کے سیاسی حالات میں بھی گہری اور وسیع تبدیلیاں ہوئیں۔ جس وقت جنگ شروع ہوئی تب ہندوستان کے تیرہ صوبوں میں سے سات میں کانگریس کی وزارتیں قائم تھیں اور خود کانگریس کے اندر داہنے اور بائیں بازو کا تصادم بہت سخت تھا۔ سبھاش چندر بوس بائیں اور ترقی پسند عناصر کی حمایت حاصل کر کے کانگریس کے صدر چن لیے گئے تھے لیکن بعد کو گاندھی جی کی حمایت حاصل کر کے داہنے بازو والوں نے انہیں اس عہدے سے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ بائیں بازو والوں اور کمیونسٹوں کا یہ کہنا تھا کہ وزارتوں کی کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے ہمیں برطانوی سامراج کے خلاف براہِ راست جدوجہد شروع کر دینی چاہیے۔ جنگ چھڑنے کے بعد یہ مطالبہ اور بھی زور پکڑ گیا۔ داہنے بازو کے کانگریسی لیڈر، انگریزوں سے بات چیت کرنے کے حق میں تھے لیکن انگریزوں کا رویہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ سخت ہو گیا تھا، ان کا کہنا تھا کہ ہندوستانی بے چوں و چرا جنگ میں ان کی مدد کریں، جب جنگ میں ان کی فتح ہو جائے گی تب ہندوستان کو ڈومنین کا درجہ دیا جائے گا اور اس میں بھی بہت سی شرائط تھیں۔ ان حالات میں کانگریس نے صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا اور مارچ ۱۹۴۰ء تک ایسا لگنے لگا کہ اب برطانوی حکومت اور ہندوستانی آزادی خواہوں سے ٹکر ہونے ہی والی ہے۔ اس وقت کمیونسٹوں کی ایک بڑی تعداد بھی کانگریس کے اندر کام کرتی تھی۔ کانگریس ایک طرح سے متحدہ قومی محاذ بنتی جا رہی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ میں بیک وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر، یو پی کی

صوبائی کانگریس کی ایگزیکٹو کا ممبر، الٰہ آباد شہر کانگریس کمیٹی کا سیکریٹری، کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی مرکزی ایگزیکٹو کمیٹی کا ممبر اور یو پی کی چھوٹی سی غیرقانونی کمیونسٹ پارٹی کا صوبائی سیکریٹری بھی تھا۔ (مختلف ٹریڈ یونینوں، کسان سبھاؤں، اور ترقی پسند مصنفین کی ذمے داریاں اس کے علاوہ تھیں)۔

برطانوی سرکار کا کمیونسٹوں پر حملہ:

بہرحال انگریزی سرکار نے سب سے پہلا حملہ ہم کمیونسٹوں پر کیا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں جب میں لکھنؤ میں تھا اور اسی رات کو رانچی میں کانگریس کے سالانہ بڑے اجلاس میں شرکت کے لیے روانہ ہونے والا تھا، ایک کالی اسٹیشن ویگن اور ایک مسلح سپاہیوں سے بھری جیپ علی الصبح ہمارے گھر وزیر منزل میں اندر آ کر رکی اور اس میں سے ایک انگریز پولیس افسر نے اندر آ کر مجھے بلایا اور میری گرفتاری کا وارنٹ مجھے دکھایا۔ میری بیوی، رضیہ اس وقت الٰہ آباد میں تھیں، اس گھر میں صرف میری والدہ تھیں۔ وہ کافی پریشان ہوئیں اور اس انگریز پولیس افسر کو باہر آ کر برا بھلا کہنے لگیں اور اس سے پوچھنے لگیں کہ میری طرح کے نیک اور اچھے آدمی کو آخر کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے؟ انگریز افسر کافی مہذب تھا، اس نے میری والدہ کی تردید نہیں کی بلکہ اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ 'اوپر' کا حکم تھا اور اسے اس کے مطابق عمل کرنا تھا۔ میں اس بحث میں شریک نہیں ہوا۔ جلدی جلدی اپنا بستر اور ضروری سامان پیک کرنے لگا اور تھوڑی دیر میں جیل جانے کے لیے تیار ہو گیا، چلتے وقت میری ماں نے میرے ہاتھ میں ایک سرخ گلاب کا پھول دے دیا۔ جب میں ان کو آداب کر کے اور گلے مل کر رخصت ہونے لگا تب مجھے اس کی خوشی ہوئی کہ میری والدہ رو دھو نہیں رہی تھیں، وہ خاموش تھیں اور ان کی صورت سے غصہ ٹپک رہا تھا۔

اس وقت لکھنؤ میں دو جیل تھے، ایک سینٹرل اور ایک ڈسٹرکٹ، دونوں ملحق تھے۔ مجھے سینٹرل جیل میں رکھا گیا۔

میں اس واردات کے دو بار پہلے بھی تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے جیل کی ہوا کھا چکا تھا۔ تیسری بار جیل میں داخل ہوتے وقت پریشانی، گھبراہٹ، ایک طرح کی سنسنی اور دل گرفتگی کا احساس ضرور

تھا، لیکن گرفتاری اور قید کو ایک ناگزیر خوشگواری سمجھ کر اس مصیبت کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی تھا۔ خیال بار بار رضیہ کی طرف جاتا تھا۔ آخر ہماری شادی کو ہوئے ابھی تقریباً ایک ہی سال تو ہوا تھا، اور ہم بمشکل ایک دوسرے کو پہچان پائے تھے۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ دوسرے کمیونسٹ جیل میں آتے گئے۔ ایک دن کامریڈ اجے کمار گھوش تشریف لائے، اور انہیں میرے پاس کی سیل میں رکھا گیا۔ مجھے ان کی گرفتاری پر تعجب ہوا اس لیے کہ ان کے بارے میں مجھے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ وہ انڈر گراؤنڈ (روپوش) ہیں۔ اس وقت کمیونسٹ پارٹی نے اپنے کارکنوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ انڈر گراؤنڈ ہو جائیں اور پھر وہ تو ہماری پارٹی کے بڑے لیڈروں میں تھے۔ پھر کیسے انہوں نے خود کو گرفتار ہونے دیا۔ وہ ہماری پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کے پولیٹکل بیورو کے ممبران میں سے تھے اور پارٹی کے ہفتہ وار نیشنل فرنٹ کے پی سی جوشی اور بی ٹی رندیوے کے ساتھ ایڈیٹر تھے۔ ان میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند تھی وہ ان کے ذہن اور دماغ کی صفائی اور سادگی تھی۔ ان کی باتوں اور دلیلوں میں کبھی الجھاؤ نہیں ہوتا تھا۔ جنگ کے پہلے کے دو برس میں جب ہماری پارٹی نے بائیں بازو کی کجروی کی اصلاح کر کے قومی متحدہ محاذ بنانے کی پالیسی پر عمل کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ تب پی سی جوشی کے ساتھ انہوں نے پارٹی کے دائرۂ اثر کو کانگریسیوں اور دوسرے قوم پرست عناصر میں پھیلانے اور بڑھانے میں رہنمایانہ رول ادا کیا۔ ہم دونوں جیل میں جنگ کے حالات پر تبصرہ کرتے باہر سے اپنی پارٹی کے کاموں کی اطلاع حاصل کرنے کی مسلسل کوشش کرتے۔

لیکن کسی کو یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ہم ہر وقت سیاست کی ہی باتیں کرتے تھے۔ اجے بہت شگفتہ آدمی تھے۔ وہ کانپور کے بنگالی تھے اور عام طور سے بڑی صاف اور شستہ اردو بولتے تھے۔ سب سے زیادہ مزہ اس وقت آتا تھا جب وہ اپنی گفتگو میں ہماری مروجہ پھکّڑ زبان بولتے اور عوامی محاورے اور گالیاں استعمال کرتے تھے۔ ان کے جیل میں آنے سے وہاں کی خشک اور تکلیف دہ زندگی میں جیسے جان پڑ گئی تھی، لیکن افسوس کہ مہینے دو مہینے کی قلیل مدت کے بعد ہی اجے کا لکھنؤ سے دیولی کیمپ کو ٹرانسفر ہو گیا۔

جیل میں جسمانی صحت سے زیادہ ذہنی اور روحانی صحت کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے

وہاں پر انسان اپنی معمولی زندگی کے تمام کاموں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ عزیزوں، رشتہ داروں، دوستوں سے وہ مل نہیں سکتا۔ ان سے اگر تعلق ہوتا ہے تو کبھی کبھی خطوں کے ذریعے سے یا ان میں سے ایک دو سے جیل کے پھاٹک کے کمرے میں جیلر کی موجودگی میں ہفتے میں ایک دن گھنٹے بھر کے لیے مل سکتا ہے۔ اخبار سے دنیا کی خبر معلوم ہو جاتی ہے۔ کتابوں کے مطالعے سے وہ اپنے علم اور معلومات میں اضافہ بھی کر سکتا ہے۔ گو کہ ضرورت کی کتابیں ملنا آسان نہیں ہوتا۔ پھر بھی کوشش کرنے سے کم از کم مجھے کافی کتابیں مل جاتی ہیں، لیکن ظاہر ہے سب سے زیادہ تکلیف عزیزوں، خاص طور پر اپنی شریکِ حیات سے مفارقت کی تھی، اور دوسری سب سے بڑی ذہنی اذیت اور کوفت اس بات کی تھی کہ ہم نے اپنی زندگی جس کام کے لیے وقف کی تھی اور جس میں ہم برسوں سے لگے ہوئے تھے، یعنی وطن کی آزادی اور اپنے ملک کے محنت کش عوام کو منظم، متحدہ کر کے اور ان میں انقلابی شعور پیدا کر کے عملی جدوجہد اور انقلاب کے راستے پر آگے بڑھانے کا کام، یہ سب ہم چھوڑ دینے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ جب ہمارے سامراجی دشمن ہمیں گرفتار کر کے جیل میں پھینک دیتے تھے تو وہ بھی یہی توقع کرتے ہوں کہ جیل کی سزا ہمارے جسموں کو کمزور اور ہماری روحوں کو مجروح کر کے ہم میں آزادخواہی اور انقلاب کے حوصلے اور ولولے کو کمزور کر دے گی اور پھر زخم خوردہ اور مایوس ہو کر ہم میدانِ جنگ سے ہٹ جائیں گے۔

چنانچہ جیل کے پھاٹک میں قدم رکھنے کے بعد سب سے پہلا خیال جو دل و دماغ میں گردش کرتا تھا وہ یہی تھا کہ دشمن کے اس حملے کا کیسے مقابلہ کیا جائے۔ کیسے خود کو ایسی حالت میں رکھا جائے کہ اگر ایک طرف جسمانی صحت تمام اذیتوں اور محرومیوں کے باوجود برقرار رہے تو دوسری طرف دماغ میں اپنے نصب العین پر یقین اور اعتماد اور دل میں سامراجی اور رجعتی قوتوں سے تادمِ حیات لڑنے اور ان کو شکست دینے کا حوصلہ اور ولولہ باقی رہے۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں اپنی اس سعی میں کامیاب ہوا تو دراصل اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود، اور اس کے باوجود کہ میرے ہاتھ میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہیں اور مجھے اپنے وسیع و عریض وطن کے سرسبز کھیتوں، اس کے نرم اور روپہلے دریاؤں، اس کے گھنے جنگلوں، اس کی گنجان بستیوں اور ان میں سے بلند ہونے والی مردوں، عورتوں اور بچوں کی صداؤں سے محروم کر دیا گیا ہے، اور میں

آزادانہ اپنے دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں گھوم پھر نہیں سکتا، پھر بھی یہ سب قید کی تنہائی میں میرے دل کے پردے پر چلتی پھرتی اور بولتی تصویروں کی طرح ہر گھڑی اور ہر دم موجود تھیں، اور مجھے زندہ اور صحیح سلامت رکھنے میں میری سب سے بڑی مددگار تھیں اور ایسا ہونا یہ ثابت کردے گا کہ حق کے لیے لڑنے والوں کی پابندی ان کی نہیں بلکہ ان جابروں کی شکست ہے جنھوں نے مجھے اور میری طرح کے ہزاروں لاکھوں دوسرے آزادی خواہوں کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی (بالشیوک پارٹی) کی تاریخ کی چند کاپیاں بڑی مشکل سے ہندوستان میں غیر قانونی طریقے سے پہنچ گئی تھیں، ان کو جیل کے باہر بھی دستیاب کرنا مشکل تھا، لیکن لکھنؤ کے کمیونسٹ ساتھیوں نے جو خود انڈر گراؤنڈ تھے اور جن کے ساتھ میں نے تعلق قائم کیا تھا، یہ کتاب میرے اور میرے ساتھیوں کے مطالعے کے لیے باہر سے ہمیں بھجوادی، چونکہ یہ تین چار سو صفحوں کی کتاب تھی، اس لیے اس کی جلد توڑ کر اس کے باب الگ کرلیے گئے اور پھر رفتہ رفتہ انھیں میرے پاس پہنچادیا گیا، دو تین مہینے اس کی باقاعدہ اسٹڈی کے بعد یہ کتاب جیسے آئی تھی، اسی طرح پارہ پارہ کرکے باہر واپس چلی گئی تاکہ دوسری جیلوں میں اسے پہنچایا جاسکے۔

ہمارے بہت سے نوجوان اور میں اس زمانے میں کم و بیش اسی زمرے میں شامل تھے، جو آزادیٔ وطن کی انقلابی تحریک میں شریک ہوتے تھے، زندگی کی بے شمار معمولی اور نارمل مسرتوں کو ترک کرنے پر مجبور تھے۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تو معاشی مسئلہ تھا یعنی کل وقتی انقلابی کارکن بننے کے معنی یہ تھے کہ ہم کو اپنی نارمل زندگی بسر کرنے کے لیے نوکری کرکے یا کوئی پیشہ اختیار کرکے جو آمدنی کا وسیلہ نکالنا تھا، اس سے درگزر کریں تو پھر گھر، مکان، کپڑے اور شادی یا عشق کرنے کے لیے گرہ میں جو مال چاہیے وہ کہاں سے آئے گا؟ ہماری پارٹی کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ اپنے کل وقتی کارکنوں کو معقول رقم دے سکے۔ بمشکل ہم لوگ اس زمانے میں اپنے ورکروں کو بیس تیس روپے ماہوار دے سکتے تھے، اور چونکہ یہ بھی ہمدردوں کے چندے پر منحصر تھا، جو کبھی جمع ہوتا تھا کبھی نہیں، اس لیے اس کا بھی یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ رقم بھی باقاعدگی سے ملے گی، مجبوراً ہم کو مختلف ذریعوں سے اپنی بسر اوقات کے لیے کہیں نہ کہیں سے، اپنے رشتے داروں،

عزیزوں، ہمدردوں اور خوشحال دوستوں سے مالی امداد لینا پڑتی تھی، جو کبھی ملی کبھی نہ ملی، تو پھر محرومیاں ایک طرف اور یہ بے یقینی دوسری طرف، لاکھ انقلابی عزم اور حوصلے کے باوجود، اپنا نفسیاتی اثر ہم پر ڈالتی ہی تھیں اور ہم نارمل انسانوں سے کسی قدر مختلف ہو جاتے تھے۔ انقلاب لانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے ہم تیار تھے اور روزمرہ ہماری زندگی میں قربانیوں کا ہی سامنا رہتا تھا، لیکن قربانیاں ہمارے کردار پر اپنا اثر بھی ضرور ڈالتی تھیں، جس کی وجہ سے کوئی کچھ عجیب حرکت کرتا کوئی کچھ۔ آخر انقلاب کا شعلہ کہاں تک اپنی گرمی اور روشنی پہنچاتا۔ پھانسی کے تختے پر انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر چڑھ جانا، ایک زبردست جذبے کے تحت نسبتاً سہل ہے لیکن معمولی طور پر زندگی بسر کرتے ہوئے، اپنے ہوش وحواس کو قائم رکھتے ہوئے، اپنے کردار کو سلامت رکھتے ہوئے انقلابی عمل اور جدوجہد میں سنجیدگی سے اور حوصلہ مندی سے مہینوں اور برسوں گزارتے رہنا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ کئی اشخاص جو ایک خاص وقت میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ ہماری تحریک میں داخل ہوتے ہیں، بعد کو پریشان ہو کر اس سے علیحدہ بھی ہو جاتے ہیں اور علیحدہ ہونے کے بعد ان کو اپنے میں نہیں بلکہ ہماری انقلابی تحریک میں طرح طرح کی خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن ہماری تحریک تو ان ہی کی طرح کے انسانوں کے اجتماع اور اجتماعی عمل کا دوسرا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں انسانی خامیاں ہیں اور اس نے تکمیل کا دعویٰ کبھی نہیں کیا، لیکن عوامی انقلاب کو قریب تر لانے اور کامیاب بنانے کے لیے اس تنظیم اور اس اجتماعی عمل کے علاوہ اور دوسرا راستہ کونسا ہے؟

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

سجاد ظہیر

طویل اور مسلسل سفر کی کہانی

ہمارے گھر کی سیاسی فضا آزادی خواہی کی تھی۔ میرے والد مسلمان لیڈروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو کانگریس کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے سامنے ہندوستان کے لیے ذمے دار حکومت کا مطالبہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں مسلم لیگ کے سیکریٹری تھے اور ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کا پیکٹ ہوا تو اس میں وہ پیش پیش تھے۔ لکھنؤ میں قیصر باغ کی بارہ دری میں لیگ کا وہ سیشن مجھے اچھی طرح یاد ہے جس میں کانگریس کے لیڈر بھی شریک تھے۔ گاندھی جی، مسز سروجنی نائیڈو، بال گنگا دھر تلک، جناح صاحب کو میں نے پہلی بار اسی زمانے میں دیکھا۔ کانگریس کے اس اجلاس کے صدر بابو امیکا چرن مزمدار تھے لیکن سب سے بڑے لیڈر تلک تھے۔ میں اپنے بھائیوں کیساتھ امین آباد میں تھا۔ جب تلک کا جلوس وہاں سے گزرا۔ ہم پارک کے کنارے پر اپنی گاڑی پر بیٹھے تھے کہ جم غفیر نے ہمیں آلیا۔ لوگ والہانہ انداز میں نعرے لگا رہے تھے۔ 'بولو تلک مہاراج کی جے' ملک مہاراج اور ان کے ساتھ تین چار آدمی ایک کھلی ہوئی لینڈو گاڑی میں ہاروں اور پھولوں سے لدے بیٹھے تھے۔ گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے گئے تھے اور لوگ اسے خود کھینچ رہے تھے۔ مجھے یہ سب بہت ہی اچھا معلوم ہوا۔ اتنے میں چیختے چلاتے پھول برساتے اور آگے بڑھتے ہوئے مجمعے میں، میں نے آشارام کو دیکھا۔ یہ ایک چھوٹے سے قد کے پنجابی ٹھیکیدار تھے جو ہمارا نیا مکان بنوا رہے تھے۔ ہمارے گھر روز ان کا

آنا جانا رہتا، وہ بھی جوش میں زمین سے گز گز بھر اچھل رہے تھے۔ وہ سفید پگڑی باندھتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی پگڑی جو ہمیشہ صاف ستھری اور چست بندھی ہوئی ان کے سر کی زینت ہوتی، کھل کر ان کے گلے اور کندھوں پر لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے حیرت سے آشا رام کی طرف دیکھا کہ ان مقطع آدمی کو جو ہمیشہ ہمارے والد سے اینٹ اور چونے اور مزدوروں کی مزدوری کے لیے روپیہ مانگنے آیا کرتے تھے، کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے بھی ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا اور مسکرائے اور پھر میرے قریب آ کر زور سے 'تلک مہاراج کی جے' چلائے اور آگے مجمعے کے ریلے میں بہہ گئے۔ میں بھی زور سے چلایا 'تلک مہاراج کی جے' ضرور تلک مہاراج بڑے اچھے آدمی ہوں گے، میں سوچتا رہا۔

عدم تعاون اور خلافت کی تحریک:

اسی زمانے میں، میں نے مسز سروجنی نائیڈو کو پہلی مرتبہ دیکھا، ان سے باتیں کیں اور ان کی تقریریں سنی اور خفیہ طور پر ان کا دلدادہ ہو گیا۔ بابا مسز سروجنی نائیڈو کو جانتے تھے، جب وہ لکھنؤ آئیں تو ایک دن بابا نے اندر آ کر بوبو سے کہا 'مسز نائیڈو تم سے ملنے آنا چاہتی ہیں، کل شام چائے پر ان کو مدعو کر دیا ہے، تیار رہنا'۔

اس کے دوسرے دن میں نے مسز نائیڈو کو پہلی بار تقریر کرتے سنا۔ قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں کانگریس کے لیڈر ہندو مسلم پیکٹ پر دستخط ہو جانے کے بعد، مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ یہ سمجھوتہ گو کہ اوپر کے طبقوں کا تھا، لیکن اس کی وجہ سے فضا میں جیسے امید اور خوشی کی مہک پھیل گئی تھی۔

اسی دن غالباً پہلی مرتبہ وطنی آزادی اور قومی اتحاد کا پہلا احساس، مجھ میں بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوا۔ اسی دن میں نے پہلی مرتبہ گاندھی جی کو بھی دیکھا، ان کا لباس یعنی سر پر سفید پگڑی، سفید کوٹ، گول چہرہ، ڈھلتا ہوا رنگ اور سیاہ مونچھیں مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ اس کے بعد جب میں نے گاندھی جی کو ۱۹۲۰ء میں دیکھا (یعنی تین چار سال بعد) تو ان کی حیثیت اور شکل و صورت کافی بدلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کسی نے جو ہال میں میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا گاندھی جی کو دکھا

کر کہا تھا: 'یہ گاندھی جی ہیں انہوں نے ساؤتھ افریقہ میں بڑا کام کیا ہے۔' لیکن اس زمانے میں کئی دوسرے لیڈر گاندھی جی سے بڑے مانے جاتے تھے۔ مسز نائیڈو بلبلِ ہند مشہور ہو چکی تھیں۔

نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک جب شروع ہوئی تو میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔ میری عمر کوئی پندرہ سال کی ہوگی۔ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ مجھ پر اس تحریک کا اثر پڑا۔ معلوم نہیں کیوں؟ ہم جوبلی ہائی اسکول میں پڑھتے تھے جو شہر کے اندر تھا اور ہمارے نئے مکان وزیر منزل سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ روز صبح شام کو ہم تانگے یا فٹن میں سوار ہو کر اسکول جاتے۔ آتے جاتے راستے میں موتی محل کا پُل پڑتا۔ شہر کے تین مشہور کانگریسی لیڈر پنڈت ہرکرن ناتھ مصرا، چودھری خلیق الزماں اور ایک مدراسی رنگا آئیر سارے وقت اس پُل کے نیچے کے ایک چبوترے پر کیننگ کالج کے نزدیک (اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی) کھڑے تقریر کرتے رہتے اور کالج کے لڑکوں سے کہتے تھے کہ کالج چھوڑ کر نکل آئیں، انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ کریں، سوراج کی لڑائی میں کود پڑیں وغیرہ۔ اپنی گاڑی رکوا کر میں ان جلسوں میں کھڑے ہو کر گھنٹے دو گھنٹے ان تقریروں کو سنتا۔ اس کے علاوہ ہر طرف بدیشی کپڑوں کے انبار لگا کر ان کو آگ لگا دی جاتی۔ الٰہ آباد سے سید حسین مرحوم کی ایڈیٹری میں 'انڈیپنڈنس' اخبار شائع ہوتا، جس میں بڑے زوردار مضمون ہوتے تھے، اسے پڑھتا۔ اس کے بعد جب گاندھی جی اور علی برادران پہلی مرتبہ لکھنؤ آئے تو اسکول کے سب لڑکوں کے ساتھ ہم بھی کلاس چھوڑ کر ان کے درشن کرنے اور ان کی تقریریں سننے کے لیے چارباغ اسٹیشن کے سامنے کے میدان میں پہنچ گئے۔ ہر جگہ سے اسٹرائیک، بائیکاٹ، جلسوں، جلوسوں اور پولیس کے ساتھ تصادم کی خبریں آتیں۔ جلیان والہ باغ کی فائرنگ کا چرچا رہتا، روسی انقلاب کی خبریں آتیں، لکھنؤ کے گلی کوچوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے بڑی اچھی دھن میں گاتے گاتے۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور یہ تھا!

بولیں اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دیدو

ایک دوسری نظم جو لکھنؤ میں بہت گائی جاتی تھی اس کا پہلا مصرع یہ تھا۔

اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

گاندھی جی کا 'ینگ انڈیا' ہر ہفتے آتا اور اس کا ایک ایک حرف لوگ احترام اور شوق سے پڑھتے۔ پھر ایک دن یہ خبر آئی کہ لکھنؤ کے پاس لکھیم پور کے ضلعے میں خلافت کے ایک والنٹیر نے وہاں کے انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ویلوبی کے گھر میں گھس کر تلوار سے اس کا سر کاٹ دیا۔ دوسرے دن ہمارے گھر میں لکھنؤ کے انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر رٹ لج گھبرائے ہوئے بابا سے ملنے کے لیے آئے۔ یہ بھی ایک عجیب بات تھی اس لیے کہ میرے والد گو کہ عہدے کے لحاظ سے ان سے اونچے درجے کے تھے لیکن انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کبھی ہمارے گھر پر آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ گاندھی جی اور کانگریس اور خلافت کے لیڈروں نے اس قتل کی مذمت کی تھی، لیکن میں دوسرے عام ہندوستانیوں کی طرح اس واقعے سے خوش ہی تھا، ناراض نہیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ خبریں آنے لگیں کہ اودھ کے دیہات میں کسان زمینداروں کو لگان دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی کسان سبھائیں ہو رہی ہیں اور ان میں یہ خبر پھیل گئی ہے کہ اب تو سوراج ہو گیا، لگان وگان دینے، زمینداروں کی بیگار کرنے اور پولیس کا ظلم سہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں خود ہمارے رشتے کے کئی زمیندار دیہات سے بھاگ کر آئے اور انہوں نے کہا کہ گاؤں میں ان کی جان، مال، عزت، آبرو سب خطرے میں ہیں۔ 'نیچ اور کمینے کسان سرکشی پر آمادہ ہیں'۔ گو میں عمر میں چھوٹا تھا لیکن یہ زمیندار اعزا مجھے خاص طور پر اپنا دکھڑا سناتے۔ بات یہ تھی کہ میں نے ان تمام حالات اور فضا سے متاثر ہو کر کھدر پہننا شروع کر دیا تھا، سر کے بال منڈوا دیے تھے، گوشت کھانا ترک کر دیا تھا، پلنگ پر سونا چھوڑ دیا تھا، چٹائی بچھا کر زمین پر سوتا تھا۔ ہمارے خاندان والوں، بابا کے دوستوں اور احباب اور شہر میں عام طور سے یہ خبر پھیل گئی تھی کہ 'وزیر حسن کا چھوٹا لڑکا تو کانگریسی ہو گیا ہے'۔ میں نے چرخا کاتنا بھی شروع کر دیا تھا اور اپنی ماں اور بہن کو بھی چرخا کاتنے اور کھدر کے جوڑے پہننے پر آمادہ کر لیا تھا۔ میرے والد نے میری ان حرکتوں پر کوئی تعارض نہیں کیا، نہ کبھی وہ اس موضوع پر مجھ سے گفتگو کرتے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ مجھے کسی قدر مذہبی غلو بھی ہو گیا تھا۔ پانچ وقت کی نماز، جس سے مولوی رضی حسن صاحب نے کافی بددل کر دیا تھا، اب میں باقاعدگی سے پڑھنے لگا۔ صبح کو تلاوت قرآن بھی کرتا۔ البتہ میں نے اسکول کی تعلیم کبھی نہیں چھوڑی۔ نان کوآپریشن تحریک کے اس پہلو کو برتنے کے لیے میرا دل کبھی آمادہ نہیں

ہوتا تھا۔ میں گاندھی جی اور کانگریس کے بتائے ہوئے راستے پر پکا عقیدہ رکھتا تھا۔ مجھے بھی سارے ملک کی طرح اس کا یقین تھا کہ سال بھر میں سوراج مل جائے گا۔ اس سوراج کی شکل و صورت کیا ہوگی، یہ مسئلہ صاف نہیں تھا اور جب گاندھی جی نے یہ کہہ دیا کہ ابھی اس کے صاف کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے تو مجھے بھی اطمینان ہو گیا۔ پھر بھی جب کبھی کسانوں کی عام بے چینی، بمبئی میں مزدوروں کی ہڑتال کی خبریں آتیں تو میرا دل خوش ہوتا۔ انگریزوں یا انگریزی حکومت کے تشدد کے خلاف ہندوستانیوں کے جوابی حملوں کی خبر سے بھی خوشی ہوتی لیکن جب فوراً ہی بعد گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی طرف سے اس کی مذمت ہوتی تو میں بھی سمجھنے لگتا تھا کہ شاید ہمارے عوام نے غلطی کی ہے اور گاندھی جی ٹھیک کہتے ہیں لیکن دل میں شبہ باقی رہ جاتا اور ہمدردی عوام اور ان کے عمل ہی کے ساتھ ہوتی۔ مجھے یاد ہے جب حسرت موہانی نے احمد آباد کانگریس میں گاندھی جی کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم کو سلطنتِ برطانیہ سے مکمل آزادی کا اعلان کرنا چاہیے اور برٹش ایمپائر میں نہ رہنا چاہیے تو بہت سے دوسرے جوانوں کی طرح میں نے اسے پسند کیا لیکن بعد کو گاندھی جی کی دلیلیں پڑھ کر یہ سمجھا کہ وہ زیادہ دانشمندی کی بات کر رہے ہیں۔ اسی طرح آزادی کی جدوجہد میں ہنسا اور اہنسا کا بھی سوال تھا۔

مزدور طبقے کے علیحدہ وجود کا احساس اسی زمانے میں عجیب وغریب طریقے سے ہوا۔ لکھنؤ میں ریلوے کی ورکشاپ ہے۔ یہاں اس وقت کوئی ۶ ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جب نان کوآپریشن تحریک کا بڑا زور تھا انہوں نے بھی اسٹرائیک کر دی۔ وہ رہنمائی کے لیے مقامی کانگریس کے لیڈروں چودھری خلیق الزماں اور پنڈت ہرکرن ناتھ مصرا کے پاس پہنچے۔ اس وقت تک مزدوروں کی نہ تو کوئی یونین تھی اور نہ پارٹی۔ چودھری صاحب کے بارے میں، میں نے یہ سنا کہ ادھر اُدھر گھبرائے گھومتے تھے کہ ان ہڑتالی مزدوروں کو کیا صلاح دیں۔ نہ ان کے اور نہ کانگریس کے پروگرام میں مزدور جماعت کے ابتدائی عمل یا تنظیم کا کوئی پروگرام تھا۔ ادھر سے گورنمنٹ کی سختی شروع ہوگئی۔ آخر کچھ دن اسٹرائیک کرنے کے بعد مزدور کام پر واپس چلے گئے۔ ایک موقع پر میری موجودگی میں چودھری خلیق الزماں نے یہ کہا کہ انگلینڈ میں 'لیبر یونین' ہوتی ہیں اور لیبر پارٹی ہے لیکن یہاں ہم کس نام سے یونین بنائیں، 'لیبر' کا ترجمہ 'مزدور' تو اچھا نہیں ہے۔ مزدور تو ہمارے

یہاں بڑے گھٹیا معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں 'لیبر' کی قسم کا کوئی شریفانہ لفظ نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے واقعے سے مزدور کی شرافت پر تو اثر نہیں پڑتا، البتہ بعض 'شریف' قومی لیڈروں کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے جنہیں مزدور کے لفظ میں نیچا پن محسوس ہوتا تھا! پھر بھی طبقہ داری تفریق کا الزام کمیونزم پر لگایا جاتا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی سب سے زیادہ باشعور جماعت:

یہ ظاہر ہے کہ میری زندگی پر یعنی اُس کا رُخ اور سمت متعین کرنے میں، ہمارے وطن کی قومی آزادی کی جدوجہد اور کمیونسٹ تحریک اور مارکسی نظریہ حیات نے سب سے زیادہ اور فیصلہ کن اثر ڈالا ہے۔ اوپر کی سطروں میں، میں نے اپنے بچپن اور لڑکپن کے چند حالات اور واقعات کا ذکر اس غرض سے کیا ہے کہ اس سمت کے متعین ہونے کے باوجود اس کے دائرے کے اندر بھی انفرادیت اور شخصیت کا ارتقا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ذہنی اور شعوری طور پر ایک خیال یا تصور کو صحیح بھی تسلیم کر لیتے ہیں، ہماری عقل ایک بات کو قبول بھی کر لیتی ہے لیکن اپنے طبقے اور خاندان کے خصائل اور اسی قسم کے دوسرے اثرات، عادتیں، توہمات، روایتیں اور جبلتیں خفیہ اور غیر شعوری طور پر ہمارے عمل، حرکات اور سکنات پر اثر ڈالتی رہتی ہیں۔ ہم اپنے متعلق طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں، ہم اعلان کرتے ہیں کہ فلاں لائحہ عمل کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، تاہم عمل اور خود ہماری فکر کو بعض انجانی طاقتیں ایسی جگہ کھینچ لے جاتی ہیں جو اس لائحہ عمل اور ان اخلاقی اصولوں سے کافی حد تک دور ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر یا تو ہم ان اصولوں کی خود تاویلیں کرتے ہیں یا ناکامی کے احساس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تہذیب کے معنی دراصل انسان کو اندھی فطرت اور جبلت تحت الشعور یعنی تمام انجانے، تاریک، نہ سمجھ میں آنے والے اتفاقی اور سانحاتی اثرات اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیتوں سے چھٹکارا دلا کر روشن، شعوری، عقلی، سلجھی ہوئی اور منظم راہوں پر لے جاتا ہے۔ ہمارے وہی خواب سب سے خوبصورت اور مسرت بخش ہوتے ہیں جن کی بنیاد حقیقت اور سچائی پر ہو ہم زندگی میں بار بار شکست کھاتے ہیں۔ نامرادیاں اور ناکامیاں اپنے ساتھ رنج و اندوہ کے خونیں تحفے لیے ہر گھڑی ہمارے اردگرد گردن جھکائے

گھڑی آنسو بہاتی رہتی ہیں لیکن یہی ناکامیاں اگر جہدِ حیات کے طویل اور مسلسل اور متواتر عمل میں ایسے سنگین موڑوں اور ایسی پگڈنڈیوں کی مثال ہوں جن سے گزرنا ہمارے لیے جانکاہ اور دل شکن ہونے کے باوجود ناگزیر اور ضروری ہو اور جس تجربے کے بغیر ہمارا اگلا قدم صحیح پڑ ہی نہ سکے تو رنج والم کے وہی آنسو دُرِ شہوار بن جاتے ہیں۔ ان ہی سے زندگی کی زیب وزینت ہوتی اور اس کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ فطرت کی تاریک قوتوں اور تاریخ کی ان مجہول طاقتوں کا، جنھیں موت کا پروانہ مل چکا ہے، زندہ اور متحرک انسانوں پر پے در پے حملہ ہوتا رہتا ہے۔ ان حملوں کا مقابلہ کرنے سے ہی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی سطح پستی سے بلندی کی طرف ابھرتی ہے، اس میں معنویت، رنگ اور نکہت پیدا ہوتی ہے۔ وہ نکھرتی اور سنورتی ہے۔ اس لیے وہی اثرات اچھے کہے جاسکتے ہیں جو اس عمل میں ہماری مدد کریں، جو قدامت پرستی، خود پرستی، اور خود غرضی کی سنگلاخ دیواروں کو توڑیں اور جن کے وسیلے سے توہمات اور بے عقلی، تعصب اور تنگ نظری کے بادل ہمارے دماغ اور ہماری روح پر سے چھٹ جائیں۔

جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس جہادِ اکبر میں سب سے زیادہ جس چیز نے میری مدد کی وہ ہندوستانی عوام ہیں یعنی مزدوروں کسانوں اور دانشوروں کی وہ جدوجہد ہے جو انھوں نے اپنی زندگی کو آزاد، خوشحال اور مہذب بنانے کے لیے جاری کر رکھی ہے اور جس کا ایک ناچیز حصہ بننے کا مجھ کو شرف حاصل ہوا ہے۔ اس جدوجہد کی بہترین تنظیم اور رہنمائی میری نظر میں، یہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے کی ہے۔ اس لیے کہ میرے نزدیک موجودہ دور میں سب سے زیادہ باشعور جماعت یہی ہے۔ میرے نزدیک وہ ہماری قوم کی اعلیٰ ترین تہذیبی روایتوں کی نمائندگی کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جس مارکسی نظریے پر اس کے عمل کی بنیاد ہے، سماج کو سمجھنے اور بدلنے اور اس کی نئی اور بہتر، زیادہ منصفانہ اور زیادہ لطیف اور بارآور ترتیب و تنظیم کرنے کے لیے، اس نظریے سے زیادہ سائنٹفک نظریہ، نوعِ انسانی کے پاس، اس عہد میں اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نظریے کو محض کتابوں کو پڑھ کر یا کسی الہامی اور ازلی پیغام یا قول وفعل کے ذریعے سے سکھایا یا سمجھایا نہیں جاسکتا۔ مارکسزم درحقیقت فطرت اور سماج میں حرکت اور تبدیلی، زوال اور ارتقا کے قانونوں کو سمجھنے اور اس علم کے ذریعے اور

وسیلے سے اپنے فہم و شعور کو جلا دے کر، ایسے عمل کا نام ہے جس کا تقاضہ سماجی زندگی کی ہیئت ایک خاص موقعے پر کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا علم اور ایسا عمل انفرادی اور اجتماعی سعی اور تجربے کے طور پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ایک طرف وہ نوع انسانی کے تمام سابق مبلغ علم پر عبور حاصل کرنے کا متقاضی ہے، تو دوسری طرف وہ علم و عمل میں جمود کا دشمن ہے بلکہ نئے علوم اور مادّی وسائل و آلات سے زندگی میں مسلسل تجدید اور ثمر باری کرتا ہے۔

میں دفعتاً یا ایک بارگی کسی جذباتی شورش کے ماتحت کمیونسٹ نہیں بنا۔ جب میں اسکول کی تعلیم ختم کر کے کالج میں پہنچا تب نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک ختم ہو چکی تھی۔ فرقہ واری تناؤ، ہندو مسلم جھگڑے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریک ایک طرف اور مسلمانوں میں تنظیم کی تحریک دوسری طرف اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ انگریزی حکومت اور اس کے ٹوڈی خوش تھے۔ تمام محبِ وطن مغموم اور مضمحل، ہندو مسلم سمجھوتے کی بار بار کوشش ہوتی لیکن دونوں طرف کے فرقہ پرست عناصر ہر اتحاد کانفرنس کو ناکامیاب کرا دینے میں کامیاب ہو جاتے۔ ایک بار لکھنؤ میں بھی ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ مجھے اتنی روحانی اذیت ہوئی کہ میں بیمار پڑ گیا۔ اب میں رفتہ رفتہ اس خیال کا قائل ہو گیا کہ بغیر انقلاب کے ہندوستان کو آزادی نہیں مل سکتی۔ کچھ مبہم طریقے سے یہ خیال بھی سامنے آنے لگے کہ ہمیں بھی اپنے ملک میں روس کی طرح مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کرنی چاہیے۔ سوویت روس کے متعلق جو خبریں ہمارے اخباروں میں چھپتی تھیں ان میں عام طور پر بالشویکوں اور بالشویک حکومت کی برائی کا پہلو نکلتا تھا۔ کوئی کمیونسٹ پارٹی یا منظم مارکسی گروپ اس وقت ہمارے ملک میں نہیں تھا جو مارکسی خیالات اور نظریوں کو ہم تک پہنچاتا۔ پھر بھی اس زمانے کے نوجوان طالب علم روسی انقلاب اور کمیونزم میں، بغیر اس کے متعلق صحیح واقفیت حاصل کیے ہوئے بھی گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔ ہمارے لیے یہ کافی تھا کہ بالشویک، برطانوی سامراج اور سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ سامراجی پروپیگنڈے کی کمیونزم کے خلاف شدت ہی ہمارے دل میں یہ جذبہ پیدا کرتی تھی کہ ضرور کمیونزم کوئی اچھی چیز ہوگی۔

ہفت روزہ 'حیات' نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

سجاد ظہیر

اُردو کمیونسٹ صحافت

یوں تو یہ ہفتہ وار اخبارات بڑے ہی کٹھن حالات میں شائع کیے جاتے رہے اور وقفے وقفے سے بند ہوتے رہے اس کے باوجود انہیں خاص طور پر پنجاب کے کسانوں اور انقلابی دانشوروں کے حلقے میں بھی مقبولیت حاصل رہی۔ کامریڈ سوہن سنگھ جوش اور کامریڈ فیروز الدین منصور ہماری اردو کمیونسٹ صحافت کے اوّلین قافلہ سالار ہیں۔ ان دنوں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی اور روپوشی کے عالم میں کام کیا کرتی تھی۔

۱۹۳۶ء کے بعد کمیونسٹ پارٹی کو نسبتاً بہتر حالات میں کام کرنے کا موقع ملا تو پارٹی نے بمبئی سے اپنا مرکزی ترجمان 'نیشنل فرنٹ' اور سہارنپور (اُتر پردیش) سے اردو ماہنامہ 'چنگاری' شائع کیا۔ میں اس کا ایڈیٹر تھا اور کامریڈ اقبال سنگھ اس کی ترتیب میں ہمارا ہاتھ بٹایا کرتے تھے اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف، سوہن سنگھ جوش، فیروز الدین منصور، ڈاکٹر رشید جہاں، ٹیکا رام سخن اور ہرکشن سنگھ سرجیت شامل تھے لیکن جب ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی اور بہت سارے کمیونسٹ لیڈر اور کارکن جیلوں اور نظر بندی کیمپوں میں بند کر دیے گئے تو 'چنگاری' بھی بند ہو گیا۔

۱۹۴۲ء میں سوویت یونین پر فاشسٹ جرمنی کی فوج کشی کے بعد جنگ کی صورت حال بدلی تو کمیونسٹوں اور دوسرے وطن دوستوں کو رہا کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی

برسوں کی غیر قانونیت کے بعد کھل کر کام کرنے کے لائق ہوئی۔ بمبئی میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا مرکزی ہیڈ کوارٹر قائم ہوا اور پھر اسی ہیڈ کوارٹر سے ہفتہ وار 'جیپلز وار' پانچ زبانوں انگریزی، ہندی، گجراتی، مراٹھی اور اردو میں جاری کیا گیا۔ اردو میں اس کا نام 'قومی جنگ' تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد اس ہفتہ وار کا نام بدل کر 'نیا زمانہ' رکھا گیا۔ گو کہ ہم کو سخت مالی دشواریوں کا سامنا تھا لیکن بہت جلد ہمارا ہفتہ وار عام طور سے ملک کا سب سے اچھا ہفتہ وار مانا جانے لگا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس کا تحریری اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ:

'سیاسی اختلاف سے قطع نظر صحافت کے اعتبار سے 'نیا زمانہ' اردو کا سب سے اچھا ہفتہ وار ہے'۔

ہم بجا طور پر اس پر فخر کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق کا یہ خط 'نیا زمانہ' میں شائع کیا گیا۔ میں اس کا چیف ایڈیٹر تھا اور ہماری ادارتی کہکشاں میں ڈاکٹر محمد اشرف، منظر رضوی، مرزا اشفاق بیگ (ماسکو)، عبداللہ ملک (لاہور)، سبط حسن (کراچی)، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ظ۔ انصاری، ضیاء الحسن (ماسکو)، علی اشرف (ماسکو) اور محمد مہدی جیسے باشعور اور بلند پایہ ترقی پسند ادیب اور اخبار نویس شامل تھے۔ ہمارے قلمی معاونوں میں جوش ملیح آبادی، نیاز حیدر، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، پریم دھون کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ہمارے ہفتہ وار کی اشاعت اپنے عروج کے زمانے میں دس ہزار سے بھی زائد تھی۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں کانگریسی حکومت کے تشدد اور خود اپنی انتہا پسندانہ کجروی کے باعث ہماری تحریک ایک دورِ ابتلا سے گزری اور ہمارے اخبارات بند ہو گئے۔ اسی سال فروری میں، میں پاکستان چلا گیا۔ ادھر 'نیا زمانہ' بھی بمبئی سے لکھنؤ آ گیا۔ ضیاء الحسن اور وزیر حسن عابدی اس کو ترتیب دیا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد حالات سدھرے تو 'نیا زمانہ' لکھنؤ سے دلی منتقل ہو گیا اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی ہیڈ کوارٹر ۴/۷ آصف علی روڈ سے نکلنے لگا۔ اب اس کا نام بدل دیا گیا تھا اور وہ 'نیا زمانہ' سے 'نیا ہندوستان' ہو گیا تھا لیکن یہ ۱۹۵۲۔۱۹۵۳ء میں صرف ایک سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ نکلا۔

۱۹۵۰ء کے دوران حیدر آباد سے مخدوم محی الدین اور کلیم اللہ کی ادارت میں ایک اور اردو ہفتہ

وار 'نیا دور' شائع ہوا جو ۱۹۵۲ء میں بند ہوگیا۔ پھر حیدرآباد ہی سے ۱۹۵۳ء میں ہفتہ وار 'محاذ' جاری کیا گیا۔

۱۹۵۳ء سے 'نیا زمانہ' جالندھر منتقل ہوگیا۔ جہاں وہ ہفتہ وار کی بجائے روزنامہ بن گیا سوہن سنگھ جوش اس کے ایڈیٹر تھے۔ ایڈیٹوریل اسٹاف میں ضیاء الحسن، فکر تونسوی اور مخمور جالندھری شامل تھے۔ یہاں کچھ دنوں تک 'نیا زمانہ' اردو ہی میں شائع ہوتا رہا لیکن بعد میں 'نواں زمانہ' کے نام سے پنجابی میں نکلنے لگا۔

'نیا ہندوستان' بند ہونے کے بعد بھی کمیونسٹ صحافیوں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں بھی ۱۹۵۵ء میں پاکستان سے ہندوستان واپس آ گیا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ہم نے اپنا ہفتہ وار ایک بار پھر جاری کرنے کے لیے اردو نواز ترقی پسند حلقوں میں ان کے تعاون اور فنڈ کی فراہمی کے لیے مہم جاری کی، سب سے زیادہ مدد ہم کو بمبئی، حیدرآباد اور بنگال سے ملی اور دسمبر ۱۹۵۹ء سے پارٹی کے مرکزی دفتر سے ہفتہ وار 'عوامی دور' شائع ہونا شروع ہوا ہم اپنے ہفتہ وار کا نام 'نیا زمانہ' ہی رکھنا چاہتے تھے لیکن اب یہ نام کسی اور نے استعمال کرلیا تھا میں ہی اس کا ایڈیٹر تھا۔ ہماری ادارتی مجلس میں اب ایک پرانے صحافی اسرار احمد آزاد کے علاوہ ایک نیا ہونہار دستہ بھی وقتاً فوقتاً کام کرتا رہا۔ عارف نقوی، لاجپت رائے، ڈاکٹر اجمل اجملی اور غلام علی۔ اردو کے ممتاز ترین ترقی پسند ادیب اور شاعر ہمارے صفحات کی زیب و زینت ہونے لگے۔

ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد اردو زبان پر مصائب و آلام کے جو پہاڑ ٹوٹے، اس سے ہم بھی متاثر ہوئے بہرحال کچھ انتظامی دشواریوں اور کچھ مالی دشواریوں کا شکار ہوکر ہمارا یہ اخبار جولائی ۱۹۶۳ء میں بند ہوگیا لیکن صرف تین مہینے بعد ہی ۷ نومبر ۱۹۶۳ء سے ایک نئی آب و تاب کے ساتھ 'حیات' منظر عام پر آ گیا اب نہ صرف ان تکنیکی اور مالی دشواریوں پر قابو پالیا گیا تھا جس سے 'عوامی دور' کو دوچار ہونا پڑا بلکہ 'حیات' کا سیاسی اور ادارتی پہلو بھی کافی مضبوط بنادیا گیا تھا۔ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں راقم الحروف کے علاوہ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد، رومیش چندرا اور بھوپیش گپتا جیسے منجھے اور سلجھے ہوئے سیاست داں اور صحافی شامل تھے۔

'حیات' کو اس کو موجودہ حالت پر پہنچانے میں جہاں اس کے سابق ایڈیٹروں احمد معظم اور

جوانمرگ اسد جعفری نے بہت بڑا حصہ ادا کیا، وہیں ضیاء الحق، غلام حیدر اور تقی حیدر کے قلمی تعاون کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

عالمی کمیونسٹ رہنما لینن نے ابتدائی تحریر میں ہی تمام کمیونسٹوں کو یہ سبق دیا ہے کہ کوئی تحریک بغیر اپنے اخبارات کے نہیں چل سکتی۔ انہوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ ایک مرکزی اخبار کے ہی ذریعے سے ہم نظریاتی اور تنظیمی اعتبار سے اپنی تحریک کو متحد اور منظم کرتے ہیں۔ پارٹی کے اخبار کے لیے فنڈ فراہم کرنا، اس کے لیے زیادہ سے زیادہ خریدار بنانا، اس کی اشاعت کو بڑھانا دراصل پارٹی کو منظم کرنے کا دوسرا نام ہے۔ پارٹی اخبار کی جانب سے لاپرواہی برتنا' پارٹی کی تنظیم کی طرف سے لاپرواہی برتنا ہے۔ اگر ہماری پارٹی وہ مضبوط آہنی زنجیر ہے جو ہماری صفوں کو جوڑتی ہے تو ہمارا اخبار اس زنجیر کی سب سے زیادہ مضبوط کڑی ہے۔ جب ہماری پارٹی غیر قانونی ہوتی ہے اس وقت بھی ہم اپنا اخبار نکالتے ہیں۔ اس لیے ہم آخر میں تمام رفیقوں اور کمیونسٹ تحریک کے ہمدردوں اور دوستوں سے یہی درخواست کریں گے کہ وہ اپنے ہفتہ وار کی اشاعت بڑھانے، اس کے مستقل خریدار بنانے، اس کی رقوم کی ادائیگی کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ برتیں اور ہم 'حیات' کی طرف سے ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم روز و شب اس کی کوشش کریں گے کہ 'حیات' کو پہلے سے بہتر بنائیں محنت کش عوام کی جدوجہد کی حمایت سوشلزم کو قائم کرنے کے لیے انقلابی عالمی مہم کی فتح، سامراج کے خوف اور عالمی امن کے لیے ہم آواز بلند کرتے رہیں۔ ہم ہندوستان میں اردو کو اس کا حق دلوانے، ہندو اور مسلم فرقہ پرستی کی مخالفت کرنے، ترقی پسند نظریات اور ادب کی ترویج کے لیے لگاتار کوشش کریں گے تاکہ بالآخر ہمارے وطن عزیز میں زر پرستوں اور رجعتی قوتوں کو فیصلہ کن شکست ہو اور ہمارے یہاں بھی محنت کشوں کا انقلابی اشتراکی نظام قائم کیا جا سکے۔

•

ہفت روزہ 'حیات'، نئی دہلی، سجاد ظہیر نمبر، ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء

پانچواں حصّہ

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں

شعراء کا خراجِ تحسین و عقیدت۔

جاں نثار اعلیٰ

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
نہ اب دشتِ جنوں کی شامِ غمگیں
نہ گل گشتِ بتاں کی صبحِ رنگیں
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوستداری
نہ غم ہائے وطن میں اشکباری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر
بہ نامِ شاہدِ نازک خیالاں
بیادِ مستیٔ چشمِ غزالاں
بہ نامِ انبساطِ بزمِ رنداں

بہ یادِ کلفتِ ایامِ زنداں

صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا آغازِ تبسم
خلا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحرگہ اب اسی کے نام ساقی
کرو اب ختم دورِ جام ساقی
بڑھاؤ شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

سردار جعفری

گُلِ عقیدت

اَے صبا، اِک گُل، مِری جانب سے اُس دل کے لئے
جس کی دھڑکن میں نہاں تھا نغمۂ عالم کا دل
دشمنوں کے واسطے جو آہن و فولاد تھا
دوستوں کے واسطے تھا قطرۂ شبنم کا دل

مجروحؔ گورکھپوری

بہاراں کا سفیر

دوستو پھینک دو اب ہاتھ سے قرطاس و قلم ناخنِ غم سے کرو لوحِ جگر پہ تحریر
نقشِ غم روزِ ازل سے ہے جو میراث اپنی اپنا سرمایہ یہی بنتی بگڑتی تصویر
آہ وہ ہاتھ کہاں ہے کہ اُسے چُوم تو لیں جس کے اک جام سے میخانے ہوئے ہیں تعمیر
چمن دہر سے کانٹوں کی ردا اوڑھے ہوئے کون سے دیس سدھارا وہ بہاراں کا سفیر

خاک رُخسار پہ مَل اے گلِ خورشید سحر
توڑ دے، آئینہ شام کو اے ماہ منیرا

لے گیا دستِ اجل چھین کے دیوانوں سے ایسا غمخوار جنوں رُوئے گی جس کو زنجیر
خامشی اس کی نسیمِ سحری تھی گویا بیقراروں کو گھنی چھاؤں تھی اُس کی تقریر
بھر گیا لالہ و گل سے جسے جانے والا اَب وہی راہ گذر لگتی ہے زخموں کی لکیر
شاید آوارہ کرے اور ابھی خوابِ سحر گردشِ گاں ہی رہے خوابِ سحر کی تعبیر
نقشِ دیوار سے خاموش ہیں اربابِ سخن صوت افسردہ ہے الفاظ و معانی دلگیر

اشک آلودہ ہوئی میری غزل اس کے بعد
نام نغمے کا ہوا نوحہ سجاد ظہیر

فارغ بخاری

میرے ساتھی، مرے ہمدم، مرے دوست

میرے ساتھی، مرے ہمدم، مرے دوست
تیرے مرنے کا یقیں ہو کیسے
آہٹیں ہیں ترے قدموں کی
مری راہوں میں
لمس ہے تیری محبت کا
مری باہوں میں
قہقہے گونجتے ہیں تیرے
فضا میں اب تک
تیرے نغمات کی خوشبو ہے
ہوا میں اب تک
میرے احساس پہ چھایا ہے ابھی تک
تری آنکھوں کا خمار
میرے دل میں ہے مجسم
تری آواز کا پیار

تیرا فن زندہ ہے
اخلاص و وفا زندہ ہے
مسکراتی ہوئی باتوں کا نشہ زندہ ہے
تیرے مرنے کا یقیں ہو کیسے؟

وامق جونپوری

چراغِ میکدہ

(پہلے احتشام صاحب اور اب بنّے بھائی)

ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا ہے سوئے ایاغ
وہ ایک غم تھا جو سیلاب بن کے اُمڈا تھا
اور ایک غم یہ ہے جو آگ بن کے پھیل گیا
سنانی پر یہ سنانی جگر ہے صد پارہ
ہمیں تسلیاں مت دو کہ ہم ہیں اہلِ وفا
ہے آج قابو کے اندر ہمارا دل نہ دماغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا ہے سوئے ایاغ
ستارے ٹوٹ رہے ہیں فلک پہ برسوں سے

نظارے اَن گنت اوجھل ہوئے ہیں نظروں سے
منارے روز گرا کرتے ہیں بلاؤں سے
کنارے ہوتے ہی رہتے ہیں زیرِ موجوں سے
مگر یہ غم وہ ہے جس سے کبھی نہ ہوگا فراغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
ہم آج ان کی زیارت سے ہوگئے محروم
پلک جھپکتے ہی شکلیں جو ہوگئیں معدوم
نتیجہ کچھ نہیں اس سوگ کا ہمیں معلوم
مگر بھلا نہیں سکتا انہیں دلِ مغموم
کہ شیشہ سے نہیں جاتا کبھی شکست کا داغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
وہ شمعِ فکر ہے جو تا اَبد ضیا بخشے
وہ جستجو ہے جو صحرا کو راستہ بخشے
وہ 'روشنائی' ہے لکھنے کی جو ادا بخشے
ہوں جن میں خوبیاں اتنی انہیں خدا بخشے
زبانِ حالِ قلم دے رہی ہے ان کا سُراغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ

ہماری سمت مگر کیا بڑھے گی ظلمت شب
کہ ہم ہیں وارثِ آتش بجان وشعلہ بہ لب
ہمارے ترکے میں آئے ہیں بار ہائے ادب
محافظِ ادب و شعر ہے ہمارا لقب
ہمیں ہیں بلبلِ گلزارِ شہرِ قلب و دماغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا ہے اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ
انہیں چراغوں کے گل سے جلیں گے کتنے چراغ
انہیں ایاغوں سے چھلکا کریں گے کتنے ایاغ
انہیں دماغوں سے مہکا کریں گے کتنے دماغ
انہیں نے فرق دکھایا میان بلبل وزاغ
انہیں کی کاوش و دانش سے ہے ادب کو بلاغ
ہمارے میکدے کا بجھ گیا اِک اور چراغ
اندھیرا بڑھتا چلا آرہا ہے سوئے ایاغ

قمر ہاشمی

بیمار ادب کا مسیحا

(سجاد ظہیر کی خبرِ مرگ پر)

الما آتا سے آئی جو ٹھنڈی ہوا کی لہر

وہ اِک عظیم دوست کا پیغامِ مرگ لائی

وہ دوست جو سفیرِ دیارِ علوم تھا

زندہ رہا تو

آبیاری چمن کی لہو سے کی

بچھڑا تو موتیوں کے خزانے لٹا گیا

زنداں اسے ڈرا نہ سکا

لب نہ سی سکا

وہ انقلاب دوست

وہ ظلمت شکار ادیب

لفظوں کی گرہیں کھول کے معنی بتا گیا

ہر پیش پا فتادہ ادب کی زمین کو

تاسیس انقلاب کے نغمے سنا گیا

لفظوں کو ضبطِ نفس کی تعلیم کس نے دی

وہ لوگ جو ہمیشہ حقائق گریز تھے

'انگارے' سے ہوئی یہ حقیقت بھی آشکار

توڑا حصار حرف اسی دل شکستہ نے

ذہنوں کو آگہی کا وہ زہراب دے گیا

جس میں کہ تلخیوں کا، حوادث کا تھا شعور

اب وہ ہمارے لفظ و بیاں میں ہے جلوہ گر

اب وہ ہماری رزم گہِ شعر کی سپر

محسن بھوپالی

دُشنامِ یار
(نذرِ سجاد ظہیر)

حوادث کی سرکش چٹانوں سے ٹکرا کے،
جس نے نئی رہ گزر دی
نمو سے تہی سخت بنجر زمینوں کو جس نے
بہاروں کی شادابیاں بخش دیں
جس کی گمبھیر لہروں کی،
خاموش اور نرم رو سطح پر بہہ کے
کتنے سفینے، کئی کشتیاں اور تنکے ـــــ سبھی کچھ
نئی زندگی کے نئے راستوں سے شناسا ہوئے

شام کے وقت ـــــ جب وہ دریا تھما ہے
تو آسودہ تنکوں میں سرگوشیاں ہیں
یہ دریا ـــــ غلط بہہ رہا تھا!
یہ دریا ـــــ غلط بہہ رہا ہے!!

مغیث الدین فریدی

سیف زباں سجاد ظہیر

۱۳۹۳ھ

سلام تجھ پہ کہ دار و رسن کی منزل سے
بڑے خلوص، بڑے انہماک سے گزرا
ہے تیرے خون سے کشتِ وفا کی سیرابی
ہجومِ برق وبلا مشتِ خاک سے گزرا

تو سرفروش مجاہد تھا، تیرا سوزِ دروں
وطن کی خاک کو برق و شرر بناتا تھا
تو رہنما، تو سپاہی، تو ایک مردِ خلیق
قدم قدم پہ تو شمعِ وفا جلاتا تھا

جبیں پہ محنتِ پیہم سے بانکپن کی ادا
نظر میں جلوۂ شامِ اودھ کی رعنائی
رفیق فاقہ کشوں کا، عوام کا ساتھی
دلوں پہ کی ہے بغیرِ کلاہ، دارائی

قلم کی نوک سے تو نے، بہ فیضِ فکر و نظر
کبھی سناں کا، کبھی مُو قلم کا کام لیا
نئے افق سے نکالے، نئے • مہرو خورشید
ادب کو حسنِ یقین، فن کو اعتماد دیا

تو آج ہم میں نہیں، تیری یاد باقی ہے
فضا کو رنگ، چمن کو نکھار دے کے گیا
جنوں نے تیرے کھلائے ہیں آگہی کے چمن
وطن کو اپنے پیامِ بہار دے کے گیا

چمن سے دور فدائے چمن کو موت آئی
"یہ حادثہ بھی تہِ شاخِ آشیاں نہ ہوا"
ہوئی ہے شاملِ تاریخ تیری "آزادی"
"ترا نشان نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا"

۲۳+۱۹۵۰=۱۹۷۳(فانی)

سجاد ظہیر

اک چراغ اور سرِ بزم ہوا گل یارو
ایک سر اور سردارِ وفا۔ نذر ہوا
قیدِ جاں سے ہوا آزاد لو اک اور اسیر
شجرِ وقت سے اک برگِ خزاں اور گرا
اور اک نجمِ سحر ٹوٹ گیا آخرِ شب
اور اک دستِ دُعا سرد ہوا آخرکار
اور کم ہوگیا لو شورِ سلاسل یارو
اور اک حلقۂ زنجیر لہو میں ڈوبا
درد میں ڈوب گئی اور کچھ آوازِ جرس
ہوگئی دور لو کچھ اور بھی منزل یارو
جل گیا خاک میں اک لالہ صحرائی اور
چل بسا لیلیٰ جاں اک ترا سودائی اور

ایک گلگشتِ بہار اور ہوا وقفِ خزاں

اور اک گوہرِ نایاب ہوا گم یارو

اور اک صاحبِ دل محفلِ دل سے اُٹھا

اور سوختہ جاں قریۂ جاں سے گزرا

آج لو ختم ہوا بابِ رفاقت اِک اور

آج اس عہد کی آواز ہوئی گم یارو

وقار خلیل

سفیرِ راہِ جنوں

بہت قریب سے دیکھا ہے اور سنا بھی ہے
مطالعہ میں رہا ہے شعور بخشا ہے
صدا کے دشت میں، محفل میں، کنجِ عزلت میں
وہی مزاج، وہی تمکنت، وہی ٹھنڈک
وہ گفتگو میں طراوٹ، وہ بانکپن، وہ وقار
وہ سرسبز پیالوں میں سُرخ سُرخ شراب
نہ احتیاطِ تکلم نہ احتیاجِ نیاز
اصول ایسے کہ جیسے ہمالیہ کا ثبات
ستارے ہاتھوں میں، سورج سے دوستی اس کی
تمام شہرِ سخن، قصہ قدیم و جدید
تمام فکر و نظر، عطرِ گل، شرافتِ فن
سحر شناس مسافر، سفیرِ راہِ جنوں
تھکن سے چُور، لبوں پر اُڑی اُڑی خوشبو
ذرا جو لیٹا ہے بستر پہ اک فسانہ بنا